بہادر شاہ ظفر



اسلم پرویز

انجمن ترقی اردو ہند

بہادر شاہ ظفر

اسلم پرویز

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

فہرست

تصویروں کی فہرست



حرفِ آغاز

بہادر شاہ ظفر کی شخصیت انیسویں صدی کے ہندوستان کی سیاسی، ثقافتی اور ادبی زندگی کا ایک اہم باب ہے۔ ظفر اُس مغل سلطنت کے آخری تاج دار تھے جس نے تین صدی تک ملک میں پورے شان و شکوہ کے ساتھ حکومت کی تھی۔ عظیم مغلوں نے ہندوستانی زندگی میں اپنی ذات کو اور اپنی ذات میں ہندوستانی زندگی کو اس طرح جذب کیا تھا کہ سولھویں صدی سے لے کر انیسویں صدی تک کے ہندوستان کو بجا طور پر مغل ہندوستان کہا جا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے بہادر شاہ ظفر کی شخصیت ایک ایسے جیالے کی جاں کنی کے لمحات کی تصویر ہے جس کی زندگی ایک شان دار ماضی کی امین تھی۔

انیسویں صدی کا ہندوستان مخصوص تاریخی حالات کی بنا پر بے شمار سماجی تبدیلیوں سے گزر رہا تھا۔ یہ تبدیلیاں بالواسطہ اور بلاواسطہ طور پر ادب کو بھی متاثر کر رہی تھیں۔ چناں چہ اس صدی کے ایک سرے پر داستانوں کے اُردو تراجم سے شروع ہونے والا فورٹ ولیم کالج تھا اور دوسرے سرے پر سرسیّد تحریک تھی جس کے اراکین کو اُردو لٹریچر کے عناصرِ خمسہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس طرح شاعری کی سطح پر ایک طرف دہلی اور لکھنؤ کے دبستان تھے اور دوسری طرف انجمن پنجاب کی تحریک اور ان کے درمیان مغلوں کے زوال اور کمپنی کے عروج کے جوار بھاٹے میں پیدا ہونے والے غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ اور ظفرؔ جیسے شاعر تھے۔ ظفرؔ اردو کے ان شاعروں میں ہیں جنھوں نے شعری اظہار میں اُردو پن کو فروغ دیا۔ یہی اُردو پن ظفرؔ کے ساتھ ساتھ ذوقؔ اور داغؔ کے وسیلے سے بیسویں صدی کے کم و بیش تمام شاعروں تک پہنچا۔

اگرچہ دوسرے آخری مغل تاج داروں کے مقابلے میں بہادر شاہ ظفرؔ کی غیر معمولی شہرت کا سبب ۱۸۵۷ء کا انقلاب بھی تھا، تاہم ان کی ہمہ گیر شہرت میں اس بات کا بھی بڑا دخل ہے کہ وہ اُردو کے ایک اہم شاعر

تھے۔ بہادر شاہ ظفر جس طرح بادشاہ کی حیثیت سے انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کا شکار رہے اسی طرح ایک شاعر کی حیثیت سے بھی بعض نقادوں نے ان کی شاعرانہ شخصیت کو متنازع بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور اُن کے بارے میں یہ غلط فہمی پھیلائی کہ ان کا کلام ذوق کا کہا ہوا ہے۔ اس اعتبار سے اس بات کی ضرورت تھی کہ بہادر شاہ ظفر کی سیاسی اور ادبی شخصیت کا جائزہ نئے انداز سے لیا جائے۔ خوشی کی بات ہے کہ اسلم پرویز صاحب نے مستند ہم عصر ماخذوں کی بنیاد پر یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ جیسا کہ مصنف نے اس مقدمے میں کہا ہے " انھوں نے ظفر کے سلسلے میں دستیاب ہونے والے تمام تر تحقیقی مواد کو، جہاں تک ممکن ہو سکا ہے، معروضی ڈھنگ سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں بہادر شاہ ظفر کے موقف اور اقلیم سخن میں ان کی شاعرانہ حیثیت سے متعلق جو مباحث اس کتاب میں اٹھائے گئے ہیں ان کا مطالعہ یقیناً دلچسپ ثابت ہوگا۔ بہادر شاہ ظفر کے سوانح اور ان کی شخصیت سے بحث کرتے ہوئے اُس عہد کا تہذیبی مرقع بھی اس کتاب میں موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

اس کتاب کی علمی اور تحقیقی اہمیت کے پیش نظر میں نے بڑی محنت اور جستجو سے ظفر کی کچھ تصاویر حاصل کیں، جو اس کتاب میں شامل کی جا رہی ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ اسلم صاحب کی یہ کتاب اُردو کے تحقیقی اور سوانحی ادب میں ایک اہم اضافہ ہوگی۔

خلیق انجم
جنرل سکریٹری

مقدّمہ

آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی شخصیت ہندوستان کی تاریخ کے ایک اہم اور نازک موڑ پر طلوع اور غروب ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ شخصیت ان تمام اندھیروں اور اُجالوں کا مُرقّع ہے جو مخصوص تاریخی حالات میں کسی ایسی شخصیت کا مقدّر ہو سکتے ہیں۔

مغل حکومت اٹھارویں صدی کے آغاز ہی میں نازک دور میں داخل ہو چکی تھی۔ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی![1] نادر شاہ کے بعد احمد شاہ ابدالی کی یورش شروع ہوئی۔ ۱۷۵۶ء میں ابدالی نے دہلی کو فتح کر کے مغل بادشاہ پر ایک افغان افسر مُسلّط کر دیا۔ ۱۷۵۷ء ہی پلاسی کی جنگ کا سال بھی ہے۔ اس ابتری کی حالت میں مغل صوبے داروں نے بھی سر اُٹھانا شروع کر دیا۔ پتن رائے چودھری اپنے مضمون THE MID — EIGHTEENTH CENTURY BACKGROUND میں لکھتے ہیں:

"اٹھارویں صدی کے وسط میں مغل حکومت کو تباہی کا سامنا تھا۔ مغل حکومت، جس کے دائرۂ اختیار میں کبھی ایک وسیع و عریض علاقہ تھا، اب سمٹ کر ایک ایسے مستطیل تک محدود ہو گئی تھی جس کا طول ڈھائی سو میل اور عرض سو میل تھا۔ مغل حکومت کے صوبے داروں نے دہلی کے ساتھ اپنی وفاداری کو باقاعدہ طور پر ختم نہیں کیا تھا لیکن ایک کے بعد ایک صوبے دار خود مختار ہوتے جا رہے تھے۔"[2] (انگریزی سے ترجمہ)

انیسویں صدی کے عظیم سماجی اور سیاسی مفکر کارل مارکس کا ایک مضمون ۱۸۵۷ء سے چار سال قبل

۱۔ HISTORY OF NADERSHAH,

۲۔ THE CAMBRIDGE ECONOMIC HISTORY OF INDIA, VOL. II, P-3

یعنی ۸ اگست ۱۸۵۳ء کو نیویارک ڈیلی ٹریبون میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کا عنوان تھا THE FUTURE RESULT OF BRITISH RULE IN INDIA۔ مارکس نے اپنے اس مضمون میں لکھا تھا:

"عظیم مغلوں کی طاقت کو مغل صوبے داروں نے کمزور کر دیا۔ صوبے داروں کی طاقت کو مرہٹوں نے کمزور کر دیا اور مرہٹوں کی طاقت کو افغانوں نے۔ اسی اثنا میں جب کہ تمام ملکی طاقتیں دست و گریباں تھیں، انگریز آ گئے، جنھیں بڑی آسانی سے ان سب کو اپنے تابع کرنے کا موقع مل گیا۔"[1] (انگریزی سے ترجمہ)

بکسر کی جنگ کے بعد سے شاہ عالم ثانی انگریزوں کی مٹھی میں تھے۔ انھی دنوں کلائیو نے الہ آباد پہنچ کر شاہ عالم سے ملاقات کی اور بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کے حقوق کمپنی کے نام لکھوا لیے۔ جب شاہ عالم الہ آباد سے دہلی کے لیے روانہ ہوئے تو ہیسٹنگز نے نہ صرف یہ کہ بادشاہ کو خراج دینا بند کر دیا بلکہ الہ آباد اور کورا کے علاقے اپنے قبضے میں کر کے نواب وزیر کو چھبیس لاکھ روپے میں دے دیے۔ ۱۷۶۶ء میں انگلستان کی پارلیمنٹ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات میں دلچسپی لینی شروع کی تو یہ سوال اُٹھا کہ کمپنی کے مقبوضات پر تاج برطانیہ کا قبضہ ہونا چاہیے۔ ۱۷۷۳ء میں انگلستان کی پارلیمنٹ نے ریگولیٹنگ ایکٹ پاس کیا جس کی رُو سے تجارتی امور کے علاوہ باقی تمام امور میں کمپنی، حکومتِ برطانیہ کا ایک شعبہ بن گئی۔ کارنوالس کو ہندوستان بھیجا گیا۔ وہ ۱۷۸۶ء میں کلکتہ پہنچا اور محض سات سال کے عرصے میں اس نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے، وہ یہ تھے:

- بنگال اور اڑیسہ پر کمپنی کا تسلط قائم کر دیا۔
- مغل شہنشاہوں کا خراج بند کر دیا۔
- وزارتِ انگلستان کی مدد سے کمپنی کے مقبوضات میں اضافہ کیا۔
- فرانسیسیوں کو ہندوستان سے باہر نکال دیا۔
- ہندوستان کی صنعت و حرفت کو تباہ کر کے ہندوستانی کاری گروں کو آرہ کشوں اور بار برداروں میں بدل دیا۔
- آئین اور اصلاحات کی شکل میں ہندوستان میں فتنہ و فساد کا بیج بو دیا۔

۱۔ بحوالہ THE RISE AND FALL OF EAST INDIA COMPANY PP 251-52

اس طرح انگریزوں نے بالعموم اور کارنوالس نے بالخصوص ہندوستان پر بیرونی حملہ آوروں کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا جو تباہی، بربادی، مفلوک الحالی، نفاق اور غلامی سے عبارت تھا۔ مارکس نے بالکل صحیح لکھا ہے :

"ہندوستان میں محض فاتحین کی حیثیت سے پہلی بار انگریز ہی آئے اور اسی وجہ سے وہ ہندوستانی تہذیب میں زیادہ خلط ملط نہیں ہوئے۔ انھوں نے تفرقہ پردازی کا بیج بونے اور صنعت و حرفت کو تباہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی سماج کی عظمتوں کا بھی گلا گھونٹ دیا اور اس طرح ہندوستانی تہذیب کو برباد کر دیا۔ ہندوستان میں ان کی تاریخ سوائے بربادیوں کے اور کچھ نہیں"[۱] (انگریزی سے ترجمہ)

۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک اور ولزلی کے سپاہیوں نے مرہٹوں کو شکست دی اور شاہ عالم ثانی ایک خاص عہدنامے کے تحت انگریزوں کے سائے میں آ گئے۔ انگریزوں کی طرف سے بادشاہ کی پنشن مقرر ہو گئی اور اس کی آڑ میں کمپنی کی حکومت شروع ہو گئی۔ یعنی "ملک بادشاہ کا حکم کمپنی بہادر کا"۔

کچھ دن بعد لارڈ ولزلی نے محسوس کیا کہ اگر مغل بادشاہ اسی طرح قلعے میں حکومت کرتا رہا تو لال قلعہ پورے ہندوستان کا مرکز بنا رہے گا، اس لیے اس نے یہ تجویز پیش کی کہ بادشاہ اور اس کا خاندان دلی کے لال قلعے سے صوبہ بہار کے ضلع مونگیر منتقل ہو جائیں۔ شاہ عالم نے اس تجویز کو سختی کے ساتھ ٹھکرا دیا۔ ولزلی نے بھی موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس پروگرام کو وقتی طور پر ملتوی کر دیا۔ ۱۸۰۶ء میں شاہ عالم کا انتقال ہو گیا اور اکبر شاہ ثانی تخت نشین ہوئے۔ اس وقت تک انگریز مغل دربار کی بڑی تعظیم کرتے تھے۔ دہلی کا رزیڈنٹ اسٹین بادشاہ کے سامنے معمولی امیروں کی طرح پیش ہوا کرتا تھا۔ لیکن اس کے نائب چارلس مٹکاف کو یہ بات سخت ناپسند تھی۔ چنانچہ جب چارلس مٹکاف رزیڈنٹ مقرر ہوا تو اس نے مغل بادشاہ کے روایتی عزت و احترام کو بالائے طاق رکھ دیا۔ ۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ ثانی کا انتقال ہوا اور بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوئے تو پھر کچھ نئے شگوفے کھلے۔ اب تک یہ دستور تھا کہ عیدین، نوروز اور بادشاہ کی سالگرہ کے موقعے پر رزیڈنٹ کی معرفت گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف کی جانب سے بادشاہ کو نذر پیش کی جاتی تھی۔ لارڈ ایلن برا نے ان نذرانوں کو بند کر دیا۔ چارلس مٹکاف کو بادشاہ اپنے خطوط میں فرزند ارجمند

۱۔ بحوالہ THE RISE AND FALL OF EAST INDIA COMPANY, P-299

لکھتے تھے۔ چارلس کے بعد جب ہاروے دہلی آیا تو اس نے فرزند ارجمند لکھنے پر اعتراض کیا۔ غرض اس طرح انگریز، مغل بادشاہوں پر روز بروز اپنی گرفت مضبوط کرتے جا رہے تھے۔ مغل بادشاہ کی عظمت و شوکت کی تمام نشانیوں کو ایک ایک کرکے ختم کیا جا رہا تھا۔ اُدھر ہندوستانی صنعت و حرفت کو انگریزوں نے تباہ کرکے رکھ دیا تھا اور ہندوستانی تہذیب و تمدّن کو بھی تباہ کرنے کے درپے تھے۔ عیسائیت کو مذہبی اور تمدّنی دونوں سطحوں پر ہندوستانی عوام اپنے لیے ایک بڑا خطرہ سمجھ رہے تھے۔ مغل شہنشاہوں کے زوال کے ساتھ ساتھ یہ زمانہ عام طور پر پورے ہندوستان کے لیے بدترین قسم کی اقتصادی ابتری کا تھا۔[1]

دوسری جانب علم و دانش کی سطح پر ہندوستان میں ایک اور انقلاب دبے پاؤں اسی خلیج بنگال کے راستے داخل ہو رہا تھا جہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کا پہلا تجارتی بیڑا لنگر انداز ہوا تھا لیکن علم و دانش کی اس مشعل سے سب سے زیادہ خود بنگال کی فضا منوّر تھی۔ دہلی بنگال سے اتنی دور تھی کہ اس مشعل کی اگر مدھم سی روشنی بھی وہاں تک پہنچ پاتی تھی تو وہ لال قلعے کے دربار کی باقی ماندہ شان و شوکت کی چمک دمک میں گم ہو کر رہ جاتی تھی۔ بنگال میں مغربی علوم کے تحت جو نئی بصیرت جنم لے رہی تھی اس کا بھرپور جلوہ غالب جیسے عظیم شاعر کو بھی صحیح معنوں میں اس وقت نظر آیا جب انھوں نے کلکتے کا سفر کیا۔

بہادر شاہ ظفر، اُن کے والد اکبر شاہ ثانی اور اُن کے دادا شاہ عالم ثانی بھی اس صورتِ حال سے بالکل بے خبر تھے کہ ہندوستان کسی اقتصادی بحران میں مبتلا ہے۔ یا بنگال میں راجہ رام موہن رائے جیسی شخصیتیں کیوں پیدا ہو رہی ہیں۔ ہندوستانی سیاست نے ان آخری مغل شہنشاہوں کا رشتہ منقطع کرنے کے لیے انھیں بھاری پینشن دے کر لال قلعے کی چہار دیواری میں پُرآسائش زندگی گزارنے کے لیے محصور کر دیا گیا تھا۔ صوبے داروں کی سرکشی اور سکھ، افغان، جاٹ اور مرہٹوں کی یورشوں کے زمانے میں مغل بادشاہ اپنی تمام تر بے دست و پائی کے باوجود ہندوستانی سیاست کا ایک حصّہ تھے۔ یہ صورتِ حال

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

(الف) LATER MUGHALS, VOL I & II

(ب) THE RISE AND FALL OF EAST INDIA COMPANY,

(ج) کمپنی کی حکومت

اب ختم ہو چکی تھی۔ لال قلعہ اب بھی ہندوستانیوں کے لیے مرکزیت کی ایک علامت تھا لیکن حالات کی ستم ظریفی یہ تھی کہ خود لال قلعے کے مکینوں کو اپنے مرکزیت کی علامت ہونے کا احساس نہیں تھا۔ مرکزیت کی یہی علامت انگریزوں کے راستے کا آخری پتھر تھی۔ ان کی نظر برابر اس سے پیدا ہونے والے خطرات پر لگی ہوئی تھی، اس لیے وہ جلد سے جلد مغل بادشاہ سے لال قلعہ خالی کرا لینا چاہتے تھے لیکن ایسا کچھ ہونے سے پہلے ہی ۱۸۵۷ء کا انقلاب رونما ہو گیا۔ اس انقلاب کے ساتھ بہادر شاہ ظفر بھی تین نسلوں کے خوابِ غفلت سے بیدار تو ہوئے لیکن اس طرح جیسے جاں کنی کا مریض کچھ لمحوں کے لیے آخری سنبھالا لیتا ہے۔

اس کتاب میں بہادر شاہ ظفر کے سوانح اور اٹھارہ سو ستاون کے سلسلے میں زیادہ تر اُن ماخذوں کو بنیاد بنایا گیا ہے جو نیشنل آرکائوز میں اس زمانے کی سرکاری دستاویزوں کی شکل میں محفوظ ہیں۔ ان دستاویزوں کے بارے میں یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ شاید یہ دستاویزیں مستند نہ ہوں اور انگریزوں نے ہندوستانیوں کو بدنام کرنے کے لیے اس قسم کی مصنوعی دستاویزیں تیار کرا کے نیشنل آرکائوز میں محفوظ کرا دی ہوں لیکن معاملہ یہ ہے کہ یہ تمام دستاویزیں اصل میں سرکاری کارگزاریوں کی خفیہ فائلیں ہیں جن کا مقصد نشر و اشاعت ہرگز نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو برٹش حکومت کے زمانے ہی میں یہ دستاویزیں کب کی منظرِ عام پر آ چکی ہوتیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے متعلق سب سے اہم ذخیرہ نیشنل آرکائوز کے MUTINY PAPERS کا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے موضوع پر خواجہ حسن نظامی نے بھی بہت سی کتابیں شائع کیں۔ یہ کتابیں ان کی اپنی تصانیف یا تالیفات نہیں ہیں کہ انھیں انشا پردازی سمجھ کر ان سے صرفِ نظر کر لیا جاتا بلکہ یہ ظفر کے زمانے کے بعض اہم ماخذ ہیں جنھیں اصل صورت میں یا ترجمے کی شکل میں پیش کیا گیا ہے اور ان میں بیان کردہ بیشتر حقائق کی تصدیق بعض دوسرے ہم عصر ماخذوں سے بھی ہوتی ہے۔

اٹھارہ سو ستاون کے موضوع پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس موضوع پر ایسی کتابیں بھی موجود ہیں جو برٹش حکومت کے زمانے میں انگریزوں کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی تھیں اور وہ کتابیں بھی ہیں جو ہندوستان کی آزادی کے بعد ایک نئے تاریخی شعور کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ اس اعتبار سے ان تمام باتوں کو اس کتاب میں دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ اس کتاب کا موضوع یوں کہ بہادر شاہ ظفر ہیں اس

۱۔ مثال کے طور پر HISTORY OF INDIAN MUTINY

لیے اٹھارہ سو ستاون کے باب کو ۱۸۵۷ء میں دہلی میں رونما ہونے والے ان واقعات تک محدود رکھا گیا ہے جو بہادر شاہ ظفر سے متعلق ہیں۔ اس طرح یہ باب گویا بہادر شاہ ظفر کے سوانحی باب کا ضمیمہ ہے۔ اس باب کو زیادہ تر نیشنل آرکائوز کے ماخذوں اور بعض دوسرے ہم عصر ماخذوں کی بنیاد پر ترتیب دیا گیا ہے۔ ان میں نیشنل آرکائوز کے بیشتر ماخذ وہ ہیں جن سے اس باب میں پہلی مرتبہ استفادہ کیا گیا ہے۔

بہادر شاہ ظفر کے معمولات زندگی اور قلعۂ معلّا کی معاشرت کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں عموماً نہیں ملتا۔ لال قلعے کی شاہانہ زندگی کے اس پہلو پر روشنی صرف ان تحریروں سے پڑتی ہے جنھیں ہم تہذیبی مُرقّعے کہہ سکتے ہیں۔ قلعے اور دربار کی ثقافتی زندگی سے متعلق اس طرح کے مُرقّعے تیار کیے جاتے رہے ہیں۔ عہد محمد شاہ سے متعلق درگاہ قلی کی کتاب مرقّع دہلی اس طرح کے جان دار مرقّعوں میں سے ایک ہے۔ بہادر شاہ ظفر اور ان کے زمانے کے لال قلعے سے متعلق بھی اس طرح کے تہذیبی مُرقّعے تیار کیے گئے ہیں اور ان کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ ان میں سے بیشتر مُرقّع نگار وہ ہیں جنھوں نے اپنے بزرگوں سے سُنی ہوئی یا نہایت قریب کی تازہ یادداشتوں کو اپنے قلم کے جوہر سے اتنا تاب دار بنا کر پیش کیا ہے کہ ان میں ہم عصر ماخذوں کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ ان مرقّعوں میں، جو تھوڑے تھوڑے سے زمانی فرق کے ساتھ تیار کیے گئے ہیں، بہت سی مماثلتیں بھی ہیں، اس لیے ان کو یکسر رد نہیں کیا جا سکتا۔ منشی فیض الدین کی بزم آخر اس اعتبار سے زیادہ مستند اور لائقِ اعتبار ہے کہ وہ لال قلعے ہی میں پرورش پا کر چھوٹے سے بڑے ہوئے تھے۔ چنان چہ لال قلعے کے بارے میں جو کچھ انھوں نے کہا ہے، اسے زیادہ لائقِ توجہ سمجھنا چاہیے۔

یہاں ایک کتاب کا ذکر دل چسپی سے خالی نہ ہوگا جس میں بہادر شاہ ظفر کے زمانے کی دہلی اور لال قلعے کی تہذیبی، سماجی اور سیاسی زندگی کی جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس کتاب کا نام ہے 'THE GOLDEN CALM' یہ کتاب چند برس پہلے یعنی ۱۹۸۰ء میں برطانیہ سے شائع ہوئی ہے۔ 'دی گولڈن کام'، دہلی کے اس وقت کے رزیڈنٹ طامس مٹکاف کی بیٹی ایملی، لیڈی کلائیو بیلی کا ریپورتاژ ہے جس میں اس نے اپنے قیامِ دہلی کے حالات قلم بند کیے ہیں۔ 'دی گولڈن کام' کے ساتھ کتاب کے مرتب M.M. KAYE نے ایک اور دستاویز کا عکس بھی شامل کر دیا ہے جس کا عنوان ہے



چاوڑی بازار، برشاہ بولا اور حوض قاضی بھی دیکھے جا سکتے ہیں

'REMINISCENCES OF IMPERIAL DEHLIE' یعنی 'شاہی دہلی کی یادیں' یہ دستاویز انگریزی زبان میں لکھی ہوئی ایک قلمی کتاب ہے جو خود طامس مٹکاف نے تیار کی تھی۔ اس کتاب کو ایسی رنگین قلمی تصاویر سے مزین کیا گیا ہے جو دہلی کی اہم تاریخی اور سرکاری عمارتوں[1] اور بادشاہِ دہلی کی تہذیبی سرگرمیوں سے متعلق ہیں۔ 'دی گولڈن کام' اور 'شاہی دہلی کی یادیں' یہ دونوں کتابیں DEHLIE BOOK کے نام سے یک جا طور پر طامس مٹکاف کے خاندان کے افراد کے پاس محفوظ تھیں۔ غدر سے کچھ ہی پہلے کی دہلی کے شان و شکوہ کا اندازہ 'دہلی بک' سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے اور اس بنیاد پر اس تہذیب سے متعلق قدرے بعد میں لکھی جانے والی بعض اردو کتابوں کو بھی محض انشا پردازی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ طامس مٹکاف کی 'شاہی دہلی کی یادیں' میں بہادر شاہ ظفر کی سواری کے جلوس کی ایک تصویر چھے صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس تصویر میں بادشاہ عید کی نماز ادا کرنے عید گاہ جا رہے ہیں: "آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کی سواری کے جلوس کا یہ تزک و احتشام دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔"[2] لیڈی کلائیو بیلی نے بھی اپنے رپورتاژ میں اس تہذیب کی بعض خوب صورت جھلکیاں پیش کی ہیں۔ غدر سے پہلے کی دہلی کا نقشا کھینچتے ہوئے وہ ایک جگہ لکھتی ہے:

> "مجھے دہلی کے بازاروں سے سواری میں بیٹھ کر گزرنے میں بڑا لطف آتا تھا اس لیے کہ میرے لیے ہر چیز نئی اور غیر معمولی تھی: سنگِ مرمر اور سنگِ سرخ کی شاندار عمارتیں، مرصع دکانیں، کھڑکیوں سے باہر بازار کی جانب لہراتے ہوئے خوش رنگ پردے، دیدہ زیب لباس اور لوگوں کا ہجوم......"[3] (انگریزی سے ترجمہ)

'بہادر شاہ ظفر' نام کی یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ جہاں تک کتاب کے پہلے حصے کا تعلق ہے اس میں کوشش اس بات کی گئی ہے کہ ظفر کی زندگی اور اٹھارہ سو ستاون کے انقلاب میں ان کے رول سے متعلق اس تمام مواد کو جو بنیادی ماخذوں کی شکل میں ادھر ادھر بکھرا پڑا ہے، یک جا کر کے

۱۔ سرکاری عمارتوں سے مراد انگریزی عمارتوں سے ہے۔

۲۔ THE GOLDEN CALM (P.152-58)

۳۔ 'THE GOLDEN CALM' P.162

معروضی انداز میں پیش کر دیا جائے۔ اس اعتبار سے یہاں کسی تجزیاتی عمل کو کام میں نہیں لایا گیا ہے لیکن اگر کہیں تجزیہ کرنا ناگزیر رہی تھا تو اس سے گریز بھی نہیں کیا گیا ہے۔ تاہم ان حقائق کی بنیاد پر جو اس کتاب میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کے بارے میں مزید غور و فکر کے راستے کھلتے ہیں

بہادر شاہ ظفر کی بیگم نواب زینت محل کے بارے میں مختلف ماخذوں سے جو سنسنی خیز انکشافات ہوئے ہیں ان کی جانب 'سوانح' کے باب کے حاشیے ۱۸۴ کی عبارت میں اشارہ کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں نواب زینت محل کا جو رول رہا ہے کتاب کے باب 'اٹھارہ سو ستاون' سے اس پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے کا مقصد ظفر کی ادبی شخصیت کا تعارف پیش کرنا ہے۔ اس لیے یہاں بھی ان کے فکر و فن پر تنقیدی نقطۂ نگاہ سے بحث نہیں کی گئی ہے۔ البتہ ظفر کی شاعری پر مختلف موقعوں پر میں نے جو چند تنقیدی مضامین لکھے تھے انھیں کتاب کے آخر میں ضمیمے کے طور پر شامل کر دیا ہے۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے لیے 'غدر' کی اصطلاح انگریزی دور کی وضع کی ہوئی ہے۔ یہ دراصل 'میوٹنی' کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں بعض مقامات پر ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے متعلق جو مباحث اٹھائے گئے ہیں ان میں 'غدر' کی اصطلاح کا استعمال ناگزیر تھا۔ اس لیے متن میں جہاں کہیں بھی 'غدر' کا لفظ آیا ہے اسے واوین میں لکھا گیا ہے جس کا مطلب یہ واضح کرنا ہے کہ مصنف اس اصطلاح کے اس معنی سے اتفاق نہیں کرتا جس کے اظہار کے لیے یہ اولاً وضع کی گئی تھی۔

حواشی میں دو انگریزی مخففات M.P. اور F.D. بار بار استعمال کیے گئے ہیں جو بالترتیب نیشنل آرکائوز کی قلمی دستاویزات 'MUTINY PAPERS' اور FOREIGN DEPARTMENT کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ ان میں سے اوّل الذکر کا تعلق دہلی میں رونما ہونے والے ۱۸۵۷ء کے واقعات سے ہے اور موخر الذکر کے ذریعے ۱۸۵۷ء سے لے کر رنگون میں ظفر کے آخری ایام تک کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

شمال مغربی صوبہ جات کے ایجنٹ اور کمشنر SAUNDERS کا نام ان ماخذوں میں جن میں سے چند کے اقتباسات اس کتاب میں شائع کیے گئے ہیں، اردو میں 'سانڈرس' لکھا ہوا ملتا ہے۔ میں نے بھی اپنے متن میں اس انگریزی نام کا اردو املا 'سانڈرس' ہی برقرار رکھا ہے تاکہ قاری کو اُلجھن کا شکار نہ ہونا پڑے۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ بعد میں شائع ہونے والی بعض تحریروں میں SAUNDERS کا اردو املا 'سینڈرس' بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

حواشی کے سلسلے میں یہ طریقہ کار اپنایا گیا ہے کہ ہر باب کے خاتمے پر اُس باب سے متعلق حواشی یکجا طور پر دے دیے گئے ہیں۔ بعض مباحث کو، جو ضمنی نوعیت کے تھے، تفصیل کے ساتھ حواشی میں اٹھایا گیا ہے اس اعتبار سے اس کتاب کے حواشی کا مطالعہ بھی دل چسپ ہو سکتا ہے۔

کتاب کا اشاریہ متن اور حواشی دونوں پر مشتمل ہے اس اشاریے کے چار حصے ہیں یعنی 'نام' مقامات' عمارتیں اور مآخذ۔

میں سب سے پہلے اپنے محترم اُستاد پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ خواجہ صاحب ہی نے پہلی بار مجھے اس موضوع پر کام کرنے کا حکم دیا تھا۔

اس کتاب کی اشاعت کے لیے میں اپنے کرم فرما جناب رشید حسن خاں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے اس کتاب کے مسودّے کو نہ صرف یہ کہ حرف بہ حرف پڑھا بلکہ لسانی اور تحقیقی امور سے متعلق بہت سے مفید مشورے بھی دیے۔ میں نے ان مشوروں کی روشنی میں جہاں تک ممکن ہو سکا ہے اس کام کو بہتر بنانے کی کوشش کی ہے۔ میں ممنون ہوں اپنے عزیز دوست پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی کا جن کے ساتھ روزانہ کی بے تکلف صحبتوں ہیں میں اپنے موضوع کے فکری پہلو پر غور کرتا رہا ہوں۔ اگر اس کتاب میں کہیں کوئی خیال انگیز بات ہے تو وہ انھی صحبتوں کا عطیہ ہے۔ اس کتاب کی اشاعت میں میرے محترم مولانا صباح الدین عبدالرحمان گہری دل چسپی کا اظہار کرتے رہے ہیں اور اس سلسلے میں انھوں نے مجھے کچھ مفید مشورے دیے ہیں۔ میں ان کا بھی بے حد شکر گزار ہوں۔ فارسی اقتباسات کے ترجمے کے سلسلے میں احمد سعید صاحب نے میری رہنمائی کی ہے جس کے لیے میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔ میں اپنے شاعر دوست مخمور سعیدی کا بھی احسان مند ہوں کہ انھوں نے طباعت کی آخری منزل میں بعض اغلاط کی بر وقت نشان دہی کی۔

میرے اندر جیسی بھی صلاحیتیں ہیں، انھیں بروئے کار لانے میں میرے عزیز دوست ڈاکٹر خلیق انجم (جو انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری بھی ہیں) اس وقت سے مصروف ہیں جب سے میں نے لکھنا اور انھوں نے مجھ سے لکھوانا شروع کیا تھا۔ میری ہر بُری بھلی تحریر کی پشت پر ان کی تحریک کے تازیانوں کے نشان موجود ہیں۔ اس کتاب کو مکمل کروانے میں انھیں کتنے پاپڑ بیلنے پڑے ہیں میں خود نہیں جانتا۔ ایسی صورت میں میں یہ سوچنے سے قاصر ہوں کہ اس موقعے پر آیا میں ان کا شکریہ ادا کروں یا وہ میرا شکریہ ادا کریں، اس لیے کہ میں نے ان کی کوششوں کو رائگاں نہیں جانے دیا اور اس کتاب کو مکمل کر لیا۔

اسلم پرویز

۲ اکتوبر ۱۹۸۵ء

- سوانح
- اٹھارہ سو ستاون
- شخصیت

سوانح

اورنگ زیب کے بعد خاندان مغلیہ کے جتنے بھی بادشاہ تخت پر بیٹھے اُن میں سے کوئی بھی تیمور، بابر، اکبر، اورنگ زیب کی جانشینی کا حق ادا نہیں کر سکا۔ بہادر شاہ ظفر کے سوانح حیات شروع کرتے ہوئے بات شاہ عالم ثانی تک پہنچتی ہے۔ اس لیے کہ اورنگ زیب کے بعد شاہ عالم اول سے لے کر عالم گیر ثانی تک جتنے بھی بادشاہ گزرے وہ سیاسی اعتبار سے کیسے ہی پریشاں احوال رہے ہوں، لیکن تھے خود مختار۔ شاہ عالم ثانی کے زمانے سے مغل حکومت کے زوال کی تاریخ میں ایک اور باب کا اضافہ ہوتا ہے اور وہ یہ کہ بادشاہ انگریزوں کا پنشن خوار ہو جاتا ہے اور مغلوں کی عظیم روایت ٹوٹنے لگتی ہے۔ شاہ عالم ثانی کی طرح ان کے لڑکے اکبر شاہ ثانی بھی انگریزوں کے وظیفہ خوار رہے اور اسی طرح بہادر شاہ ظفر نے بھی اپنی زندگی کے دن پورے کیے۔ بادشاہِ دہلی کو لال قلعے سے نکالنے کا خواب انگریزوں نے پہلے پہل شاہ عالم کے عہد میں دیکھا تھا۔ اُن کا یہ خواب بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں پورا ہوا۔ ظفر کے حالاتِ زندگی کو پوری طرح سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کی داستانِ حیات کا آغاز شاہ عالم ثانی کے زمانے سے کیا جائے۔

شاہ عالم ثانی

بہادر شاہ ظفر کے جدِ امجد، شاہ عالم ثانی، عزیز الدین عالم گیر ثانی کے لڑکے تھے۔ عالم گیر ثانی کا سلسلۂ نسب اورنگ زیب تک اس طرح پہنچتا ہے: عالم گیر ثانی ابنِ جہاندار شاہ ابنِ شاہ عالم اول ابنِ اورنگ زیب۔ شاہ عالم ثانی کا اصلی نام میرزا عبداللہ اور خاندانی

نام عالی گہر تھا۔ بچپن میں وہ لال میاں اور میرزا بلاقی بھی کہلاتے تھے۔ تخت نشین ہونے کے بعد انھوں نے ابو مظفر جلال الدین محمد شاہ ثانی کا لقب اختیار کیا۔

شاہ عالم کی ولادت ۱۷۲۸ء میں اس وقت ہوئی جب ان کے والد عالمگیر ثانی، فرخ سیر کی قید میں تھے[2]۔ عالمگیر ثانی کو عماد الملک نے ۱۷۵۴ء میں تخت پر بٹھایا تھا اور خود وزارت کا عہدہ سنبھال کر حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ شاہ عالم ثانی کی عمر اس وقت اٹھائیس سال تھی۔ عماد الملک کی سازشوں کی وجہ سے شاہ عالم ثانی کا دہلی میں رہنا مشکل ہوگیا۔ وہ عماد الملک کے خلاف منصوبہ بند طریقے سے کچھ کارروائی کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس غرض سے انھوں نے دہلی کو خیر باد کہہ دیا۔ ۱۷۵۹ء میں عماد الملک نے مہدی قلی خاں اور بالا باش خاں کے ساتھ خفیہ سازش کر کے عالمگیر ثانی کو دہلی کے کوٹلہ فیروز شاہ میں لے جاکر دھوکے سے قتل کرا دیا[3]۔ اس کے بعد عماد الملک نے محی الملت پسر محی السنۃ کو، جو کام بخش بن اورنگ زیب کے پوتوں میں سے تھا، شاہ جہاں کا لقب دے کر تخت پر بٹھا دیا[4]۔ جب شاہ عالم ثانی کو اپنے باپ کے قتل کی خبر ملی تو وہ موضع کھتولی (صوبہ بہار) میں مقیم تھے۔ انھوں نے اسی جگہ اپنی بادشاہت کا اعلان کیا اور شاہ عالم ثانی کا لقب اختیار کیا۔ کھتولی ہی میں شاہ عالم ثانی نے دسمبر ۱۷۵۹ء میں اپنا جشنِ تاج پوشی منایا[5]۔

۲۲ راکتوبر ۱۷۶۴ء کو شجاع الدولہ نے شاہ عالم ثانی کی سرکردگی میں بکسر کے مقام پر انگریزوں کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی[6]۔ شاہ عالم ثانی نے مصلحتِ وقت سے کام لیتے ہوئے انگریزوں سے صلح کر لی۔ اس طرح بکسر کی لڑائی کے خاتمے پر مغلیہ حکومت کے خاتمے کی مہر بھی لگ گئی۔ بادشاہ نے انگریزوں کے ساتھ جو صلح کی اُس کی نوعیت یہ تھی:

> "بادشاہ نے اس وعدے پر کہ چھبیس لاکھ روپیہ سالانہ، جس کا قول و قرار میر جعفر سے ہوا تھا، برابر پہنچتا چلا ئے گا، لارڈ کلائیو کے لیے بنگال، بہار اور اڑیسہ تینوں صوبوں کی دیوانی کا فرمان لکھوالیا[7]۔"

انگریزوں نے اس صلح کے بعد الہ آباد کا صوبہ شجاع الدولہ سے لے کر بادشاہ کو دلوا دیا، اور الہ آباد کے قلعے میں شاہ عالم اور حکومت سے بے نیاز عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے لگے۔

اور تقریباً سات سال اسی رامش و رنگ میں گزر گئے۔ اب انھیں خیال آیا کہ دہلی پہنچ کر اپنے آبائی مسکن یعنی لال قلعے میں جا کر تختِ سلطنت کو رونق بخشیں۔ اپنے اس ارادے کی تکمیل کے لیے انھیں انگریزوں اور شجاع الدولہ کی منشا کے خلاف مرہٹوں سے ساز باز کرنی پڑی۔ چنانچہ ۱۷۷۱ء میں وہ الہ آباد کو خیر باد کہہ کر مرہٹوں کی مدد سے دہلی کے تخت پر رونق افروز ہو گئے لیکن اس کارکردگی کا جو نتیجہ برآمد ہوا اس کا ذکر شیو پرشاد نے اس طرح کیا ہے:

"اب ذرا حال شاہ عالم کا سنو۔ اس کے دل میں پھر دہلی کے درمیان تخت پر بیٹھنے کی ہوس سمائی۔ انگریزوں نے کچھ مدد نہ کی۔ اس نے تکاجی ہلکر اور مہاجی سندھیا کے پاس پیغام بھیجا۔ ان مرہٹوں نے ۱۷۷۱ء میں اسے دہلی کے تخت پر بٹھا دیا اور الہ آباد اور کوڑے کا علاقہ اس سے زبردستی اپنے نام لکھوا لیا۔ انگریزوں نے اس بہانے سے کہ اب تو آپ ہمارے دشمنوں سے یعنی مرہٹوں سے مل گئے ہیں، الہ آباد اور کوڑا دونوں کو ضبط کر کے پچاس لاکھ پر شجاع الدولہ کے ہاتھ بیچ ڈالا اور لارڈ کلایو نے جو تینوں صوبوں کی دیوانی کی بابت چھبیس لاکھ روپیہ سال دینے کا اقرار لکھ دیا تھا وہ بالکل گویا پانی سے دھو ڈالا۔"[۸]

شاہ عالم ثانی کے عہدِ حکومت میں مرہٹوں نے دہلی اور اس کے گرد و نواح میں خوب غارت گری مچائی۔ خود بادشاہ کو بھی ان کی ذات سے کوئی فیض نہ پہنچا۔ جب مرہٹوں اور روہیلوں کے درمیان جنگ چھڑی تو مرہٹے ضابطہ خاں کے بیوی، بچوں کو پکڑ کر لائے۔ انھیں میں ضابطہ خاں کا لڑکا غلام قادر خاں بھی تھا جس کی عمر اس وقت آٹھ یا دس سال تھی۔ یہ لڑکا بہت خوب صورت تھا۔ شاہ عالم نے اسے منظورِ نظر بنا کر خصی کرا دیا۔ غلام قادر کو بادشاہ کے سامنے زنانہ ملبوس میں آنے کا حکم تھا۔[۹]

۱۷۸۸ء میں غلام قادر نے دہلی پر حملہ کیا اور شاہ عالم کو معزول کر کے بیدار بخت کو تخت پر بٹھا دیا۔ اپنی بے عزتی کا انتقام اس نے اس طرح لیا کہ شاہ عالم کی آنکھیں نکال لیں۔ بعد میں مرہٹوں کے ہاتھوں غلام قادر کا انجام بھی بہت برا ہوا، اور شاہ عالم ایک بار پھر مرہٹوں

کی قید میں آ گئے۔ ۱۸۰۳ء تک انھوں نے اسی کس مپرسی کے عالم میں زندگی گزاری۔ بالآخر ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی فوجوں نے جمنا پار کر کے دہلی پر قبضہ کیا اور مرہٹوں کا قلع قمع کر کے دہلی میں انگریزی اقتدار کا ڈنکا بجا دیا اور شاہ عالم ثانی کو برائے نام بادشاہ بنا کر ان کی پنشن مقرر کر دی[۱]۔ یہی برائے نام بادشاہت شاہ عالم ثانی کے بعد ان کے بیٹے اکبر شاہ ثانی کے حصے میں آئی اور ان کے بعد یہی بادشاہت، وراثت میں بہادر شاہ ظفر کو ملی اور پھر ظفر کے ساتھ ہی خاندانِ مغلیہ کا چراغ گل ہو گیا۔

شاہ عالم کی بادشاہت اگرچہ لال قلعے کی چہار دیواری تک محدود ہو کر رہ گئی تھی لیکن انگریز، از کار رفتہ مغل بادشاہ کے وجود کو بھی لال قلعے میں خلافِ مصلحت سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر بادشاہ کو اسی طرح قلعے میں رہنے دیا گیا تو لال قلعہ روایت کے مطابق اقتدار کا مرکز بنا رہے گا اور خود بادشاہ بھی شاہی اقتدار کا خواب دیکھتا رہے گا۔ ۱۸۵۷ء میں جو صورتِ حال سامنے آئی اس پر اگرچہ انگریزوں نے قابو پا لیا لیکن اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ ان کا وہ خیال صحیح تھا جو پہلے پہل شاہ عالم کے زمانے میں ان کے ذہن میں آیا تھا۔ انگریزوں نے شاہ عالم کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ وہ دہلی کے لال قلعے کو خالی کر کے صوبۂ بہار کے ضلع مونگیر میں مقیم ہو جائیں۔ شاہ عالم نے سختی کے ساتھ اس تجویز کو مسترد کر دیا تھا۔ انگریزوں نے مصلحت کوشی سے کام لیتے ہوئے کچھ عرصے کے لیے اپنے ان ارادوں کو ملتوی کر دیا[۲]۔

شاہ عالم آنکھوں سے معذور ہونے کے ساتھ ساتھ شاہی اختیارات سے بھی محروم تھے۔ جہاں بانی اور ملک گیری کے مسائل ختم ہو چکے تھے۔ انگریزی پنشن نے زندگی میں ایک طرح کی جھوٹی فراغت اور سطحی تن آسانی پیدا کر دی تھی چنانچہ اب شعر و سخن کا شغل ہی، جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھا، ان کی اصل مصروفیت بن گیا۔ ان کا تخلص آفتاب تھا۔ وہ اردو، فارسی کے علاوہ برج بھاشا اور پنجابی میں بھی دست گاہ رکھتے تھے اور اس کے علاوہ عربی، سنسکرت اور ترکی بھی جانتے تھے۔ وہ خطِ نسخ اور خطِ نستعلیق میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ نابینا ہونے سے پہلے قرآن مجید کی کتابت ان کے روزانہ کے مشاغل میں شامل تھی۔

وہ تصوف میں بھی دل چسپی رکھتے تھے اور سید محمد مراد درویش سے بیعت تھے[۱۳] شاعر کی حیثیت سے کم و بیش ہر تذکرہ نگار نے ان کا ذکر کیا ہے۔ شاہ عالم ثانی کا انتقال ۱۹ر نومبر ۱۸۰۶ء کو ہوا[۱۴]

اکبر شاہ ثانی

شاہ عالم ثانی کے بڑے لڑکے کا نام میرزا جواں بخت تھا اور منجھلے کا اکبر شاہ ثانی۔ جواں بخت ہی اصل میں ولی عہد تھا لیکن چوں کہ اس کا انتقال شاہ عالم ثانی کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا، اس لیے اکبر شاہ ثانی، ولی عہد نامزد ہو گئے اور شاہ عالم ثانی کے انتقال کے بعد وہی تخت پر بیٹھے۔

ذکاء اللہ نے اکبر شاہ ثانی کا سالِ پیدائش ۱۷۵۹ء بتایا ہے[۱۵] لیکن خود ذکاء اللہ کے ایک اور بیان کے مطابق اکبر شاہ ثانی کا انتقال ۱۸۳۷ء میں بیاسی برس کی عمر میں ہوا[۱۶] اور اسپیر کے اندازے کے مطابق وہ تراسی برس کی عمر میں فوت ہوئے[۱۷]۔ اس اعتبار سے ان کا سالِ ولادت ۱۷۵۵ء یا ۱۷۵۴ء ہونا چاہیے۔

اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں انگریزوں کی سیاسی ریشہ دوانیاں اور زیادہ تیز ہو گئیں انگریزوں کی کوشش یہی تھی کہ دلی کی بادشاہت رفتہ رفتہ ختم ہو جائے۔ شاہ عالم ثانی کے زمانے تک انگریز، مغل بادشاہ اور اس کے دربار کی تعظیم کرتے تھے۔ اس وقت بادشاہ کے دربار میں دلی کے رزیڈنٹ، سیٹن کی حیثیت ایک معمولی امیر سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ شاہی خاندان کے ہر فرد کی بے انتہا عزت کرتا تھا لیکن سیٹن کا نائب چارلس مٹکاف، بادشاہ کے اس احترام سے سخت ناخوش تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہم اس طرح بادشاہ کی تعظیم کر کے اس کی غیرت و حمیت کو نہیں سلا سکتے" جو ہمارا اولین مقصد ہے۔ مولوی ذکاء اللہ چارلس مٹکاف کے الفاظ یوں لکھتے ہیں:

> "میں اس پالیسی کے ساتھ موافقت نہیں کرتا جو سیٹن صاحب نے شاہی خاندان کے ساتھ اختیار کر رکھی ہے۔ جو شخص برٹش گورنمنٹ کی طرف سے دہلی میں حکمرانی کے لیے مقرر ہو وہ بادشاہ کی تعظیم اس طرح کرتا

ہے جس سے بادشاہی قوت کے بیدار ہونے کا اندیشہ ہے۔ حالاں کہ ہم اس
کو ہمیشہ کے لیے سلا دینا چاہتے ہیں۔ ہمارا مقصود نہیں کہ بادشاہ کو بادشاہی کے
دوبارہ اختیارات حاصل ہوں۔ اس لیے ہم کو ایسی حرکتیں نہیں کرنی چاہییں جن سے
اس کے دل میں اپنی بادشاہی حاصل کرنے کی تمنا پیدا ہو......... اگر ہم نہیں
چاہتے کہ اس کی حکومت کو پھر دوبارہ قائم کریں تو ہم کو چاہیے کہ بادشاہت
کا خیال اس کے خواب میں بھی نہ آنے دیں۔"[18]

یہ حالات اکبر شاہ ثانی کی تخت نشینی کے ٹھیک ایک سال بعد یعنی ۱۸۰۸ء میں پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔[19] ۱۸۰۹ء میں بادشاہ نے اپنے لیے مزید وظیفے کا مطالبہ کیا جسے کورٹ آف ڈائرکٹرز نے بخوشی منظور کر لیا۔[20] لیکن اتنی بڑی بادشاہت پنشن اور وظائف پر نہیں چل سکتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ انگریزوں کی طرف سے بادشاہ کو جو وظیفہ ملتا تھا وہ ناکافی تھا۔ لہٰذا بادشاہ نے پھر کوشش کی کہ وظیفے میں مزید اضافہ کیا جائے۔ بادشاہ نے اس سلسلے میں حکومتِ اودھ کی بھی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی۔[21] چنانچہ ۱۸۱۲ء میں بادشاہ کی والدہ قدسیہ بیگم اور صاحب زادے مرزا جہانگیر کسی بہانے لکھنؤ پہنچے اور وہاں پہنچ کر نواب وزیر کو اپنی مدد کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ انگریزوں نے اس کارگزاری کے جواب میں بادشاہ کے الاؤنس میں اس وقت تک کے لیے اضافے سے انکار کر دیا، جب تک کہ وہ انگریزوں کی شرائط پر پابندی سے کاربند نہ ہوں۔[22] بادشاہ کو تمام معاملات سے بےدخل کر دیا گیا یہاں تک کہ بادشاہ کو یہ اختیار بھی نہیں رہا کہ وہ اپنا ولی عہد یا جانشین خود مقرر کر سکیں۔[23] ۱۸۱۴ء میں اکبر شاہ ثانی نے گورنمنٹ سے مطالبہ کیا کہ ان کا مرتبہ گورنر جنرل سے زیادہ ہونا چاہیے۔[24] انگریزوں کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔
جنرل لیک نے جب اکبر شاہ ثانی کے والد، شاہ عالم ثانی کو دوبارہ تخت پر بٹھایا تو ایک اقرار نامہ لکھ کر دیا تھا۔ اس اقرار نامے میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ شہنشاہ کے خرچ کی سالانہ رقم بڑھا دی جائے گی لیکن انگریزوں نے یہ عہد پورا نہیں کیا۔ آخر کار اکبر شاہ ثانی نے ۱۸۳۰ء میں مشہور برہمو سماجی لیڈر راجا رام موہن رائے کو راجا کا خطاب دے کر اپنا سفیر



اکبر شاہ ثانی اور ان کے فرزند مرزا جہانگیر

مقرر کر کے انگلستان بھیجا۔ راجا رام موہن رائے جب انگلستان پہنچے تو ان کا زبردست استقبال ہوا۔ وہ ایک دانش ور تھے لیکن جس مقصد کے لیے وہ انگلستان گئے تھے اس میں انھیں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ انگلستان میں ان کا قیام تین سال رہا اور وہیں ۱۸۳۳ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔[۲۵]

جب راجا رام موہن رائے کے مشن کا علم انگریزوں کو ہوا تو ان کے دل میں اکبر شاہ ثانی کی طرف سے اور بدگمانی پیدا ہو گئی۔ چنانچہ اکبر شاہ ثانی نے اپنی زندگی کے باقی دن لال قلعے میں ایک بے یار و مددگار انسان کی طرح پورے کیے۔ وہ دہلی کے تخت پر اکتیس برس رونق افروز رہے۔ ان کا انتقال ستمبر ۱۸۳۷ء میں ہوا۔[۲۶] عرشی تیموری کا بیان ہے کہ اکبر شاہ ثانی کا انتقال مرضِ اسہال میں ہوا۔[۲۷]

اکبر شاہ ثانی کی علمی استعداد شاہ عالم ثانی کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ وہ ایک کم زور ارادے کے انسان تھے۔ اکثر معاملات میں کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے وہ خواتین سے رجوع کرتے تھے۔ ان خواتین میں ان کی والدہ قدسیہ بیگم، ان کی چہیتی بیوی ممتاز محل اور پھوپی دولت النسا بیگم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ خواتین بادشاہ کے دربار میں پردے کے پیچھے موجود رہتیں اور کاروبارِ دربار میں ان کا پورا دخل رہتا۔[۲۸]

جہاں تک ظاہری شکل و صورت کا تعلق ہے اکبر شاہ ثانی ایک خوب صورت انسان تھے ان کے نین نقش تیکھے اور رنگ گورا تھا۔ ایک انگریز خاتون نے اکبر شاہ ثانی کو ۱۸۱۲ء میں دیکھا تھا جب کہ ان کی عمر پچاس سال سے تجاوز کر گئی تھی۔ اسپیئر نے اکبر شاہ ثانی کے بارے میں اس انگریز عورت کے تاثرات خود اُس کی زبانی اس طرح بیان کیے ہیں:

> "ان کے خط و خال بہت اچھے ہیں اور ہندوستانی ہونے کے اعتبار سے رنگ بہت گورا ہے۔ ان کی ریش دراز ہے اور برف کی طرح سفید۔ ان کا لباس اگرچہ سادہ تھا لیکن وہ بیش قیمت جواہرات پہنے ہوئے تھے۔"[۲۹]
>
> (انگریزی سے ترجمہ)

۱۸۲۷ء میں جب کہ اسپیئر کے بقول وہ تہتر برس کے تھے، میجر آرچر نے اکبر شاہ ثانی کو

دیکھا تو ان کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی :

"وہ (بادشاہ) ساٹھ برس کے معلوم ہوتے ہیں (ان کی عمر اس وقت تہتر برس تھی) وہ قابلِ رشک حد تک تندرست و توانا انسان ہیں۔ وہ بہت خوب صورت ہیں اور ان کا رنگ اس سے کہیں زیادہ گورا ہے جیسا کہ اونچے طبقے کے لوگوں کا ہوتا ہے۔ ان کی مقدس سفید ریش ان کے مرتبے میں مزید اضافہ کرتی ہے اور ان کی سیاہ ذہین آنکھیں آدمی کو کافی متاثر کرتی ہیں۔"[۳۰]

(انگریزی سے ترجمہ)

شاہ عالم ثانی کے مقابلے میں اکبر شاہ ثانی کے علمی اور ادبی مشاغل بھی برائے نام تھے۔ وہ شعر بھی کہتے تھے لیکن ان کے مجموعۂ کلام یا کسی اور تصنیف کا پتا نہیں چلتا۔ ان کے والد شاہ عالم ثانی کا تخلص آفتاب تھا اور اس رعایت سے انھوں نے اپنا تخلص شعاع رکھا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ ان کا یہ تخلص خود شاہ عالم آفتاب ہی نے تجویز کیا ہو۔ تذکروں میں عموماً ان کے یہ دو شعر ملتے ہیں :

تجھ زلف کے عہدے سے یہ دل کیونکے بر آوے
تا حشر نہ چھوٹے یہ بلا جس کے سر آوے
واں یار شعاع ذرہ نمط ہم کو کہاں ہے
دن رات جہاں سجدے کو شمس و قمر آوے"[۳۱]

ظفر کی ولادت

بہادر شاہ ظفر کا پورا نام ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ تھا۔ ان کی ولادت ان کے والد اکبر شاہ ثانی کے زمانۂ ولی عہدی میں ان کی ہندو بیوی لال بائی کے بطن سے ہوئی۔ ظفر کی تاریخ پیدائش ۲۸ر شعبان ۱۱۸۹ھ مطابق ۱۴ر اکتوبر ۱۷۷۵ء ہے۔[۳۲] وہ ہفتے کے روز غروبِ آفتاب کے وقت پیدا ہوئے تھے۔ ابوظفر ان کا تاریخی نام تھا۔ جس کے اعداد ۱۱۸۹ ہوتے ہیں۔ اپنے تاریخی نام ابوظفر کی رعایت سے ہی انھوں نے اپنا تخلص ظفر رکھا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کے جدامجد شاہ عالم اول (ابنِ اورنگ زیب) کا لقب

بھی بہادر شاہ تھا اس لیے بہادر شاہ ظفرؔ، بہادر شاہ ثانی کہلاتے تھے۔ عرش تیموری کا بیان ہے کہ بہادر شاہ ظفر کا عرف مرزا ابّن تھا۔[۳۳]

بہادر شاہ ظفر کی تعلیم و تربیت قلعۂ معلّٰی میں پورے اہتمام کے ساتھ ہوئی اور انھوں نے مختلف علوم و فنون میں مہارت حاصل کی۔ لال قلعے کی تہذیبی زندگی اور مشاغل میں بھی انھوں نے گہری دل چسپی لی جس کا ثبوت ان باتوں سے ملتا ہے جن کا تذکرہ آگے چل کر تفصیل سے کیا جائے گا۔ شاہ عالم ثانی کا انتقال ۱۸۰۶ء میں اس وقت ہوا جب ظفر کی عمر اکتیس برس کی ہو چکی تھی اس لیے یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے شاہ عالم ثانی کی صحبت کا فیض پوری طرح اٹھایا۔ شاہ عالم ثانی کی تربیت کے نتیجے میں ہی انھیں کئی زبانوں پر قدرت حاصل ہو گئی۔ چنانچہ اُردو اور فارسی کے ساتھ ساتھ برج بھاشا اور پنجابی میں بھی ان کا کلام موجود ہے۔

ظفر منکسر المزاج اور خلیق انسان تھے۔ ان کی طبیعت میں حلم و ترحم تھا اور نخوت و غرور کو اُن کے مزاج سے دور کی نسبت تھی۔ شاہانہ عیش و عشرت کے ساتھ زندگی گزارنے کے باوجود انھوں نے کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ظہیر دہلوی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "حضرت بادشاہ کیواں بارگاہ، باوجود عظمت و شوکت و جلال و جبروت خداداد، جملہ علم و فضل و عجز و انکسار و کسرِ نفسی و حلم و ترحم و حسن خلق سے آراستہ و پیراستہ تھے۔ عجز و انکسار، مزاجِ اقدس امتزاج میں اس درجہ تھا کہ خود کو ادنا بندگانِ بارگاہِ احدیت کے برابر متصور فرماتے تھے۔ بوے نخوت و رعونت پاس ہو کر نہ نکلی تھی ہر بندۂ خدا سے خلقِ محمدیؐ سے پیش آتے تھے اور عالم شہزادگی سے مزاجِ اقدس امتزاج زہد و صلاح و تقویٰ و طہارت و عبادت کی جانب مائل تھا۔ عالم شباب میں بھی مرتکب منہیات و ممنوعاتِ شریعہ نہ ہوئے۔"[۳۴]

اکبر شاہ ثانی کے گیارہ لڑکے اور چھے لڑکیاں تھیں۔[۳۵] ظفر ان میں سب سے بڑے تھے۔ ظفر سے چھوٹے مرزا بابر اور ان سے چھوٹے مرزا جہانگیر تھے[۳۶] جن کو بادشاہ

ولی عہد بنانا چاہتے تھے۔ مرزا جہانگیر سے چھوٹے مرزا سلیم تھے۔ یہ بھی بادشاہ کے چہیتے تھے۔ مرزا جہانگیر کے انتقال کے بعد اکبر شاہ ثانی کی تمام تر کوشش یہی تھی کہ مرزا سلیم کو ولی عہد بنا دیا جائے۔[۳۷] انگریز، اکبر شاہ ثانی کے سب سے بڑے لڑکے ابوظفر ہی کے حق میں تھے۔ اس لیے اکبر شاہ ثانی کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور بالآخر ظفر ہی ولی عہد منتخب ہوئے۔ ظفر کے ولی عہد بننے کی داستان دل چسپی سے خالی نہیں۔

ظفر کی ولی عہدی

مغل بادشاہوں کا یہ دستور تھا کہ وہ اپنا ولی عہد اور جانشین اس شہزادے کو مقرر کرتے تھے جسے وہ اس کا اہل سمجھتے تھے یا جسے وہ پسند کرتے تھے۔ کسی شہزادے کا محض فرزند اکبر ہونا ولی عہدی کی ضمانت نہیں تھا۔ شاہ عالم ثانی کے زمانے سے مغل بادشاہ انگریزوں کے پنشن خوار ہو گئے تھے، اس لیے ان کا دائرۂ اختیار بھی تنگ ہو گیا تھا چناں چہ اکبر شاہ ثانی سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ولی عہدی کے انتخاب کا حق بھی چھین لیا۔[۳۸] اکبر شاہ ثانی کی ایک بیگم جن کا نام بیگم ممتاز محل تھا، بادشاہ کی بہت چہیتی تھیں۔ وہ اکبر شاہ ثانی کے منجھلے بیٹے مرزا جہاں گیر کی والدہ تھیں۔ بیگم ممتاز محل یہ چاہتی تھیں کہ ان کے فرزند ہی ولی عہد منتخب ہوں۔ انگریزوں کو اس تجویز سے اتفاق نہیں تھا۔ وہ اس کے برخلاف اکبر شاہ ثانی کے فرزند اکبر، مرزا ابوظفر کو ولی عہدی کا مستحق سمجھتے تھے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ذاتی طور پر اکبر شاہ ثانی، مرزا جہاں گیر اور مرزا ابوظفر میں کس کو زیادہ پسند کرتے تھے لیکن یہ ضرور ہے کہ ممتاز محل نے انھیں اس بات کے لیے پوری طرح ہموار کر لیا تھا کہ وہ مرزا جہاں گیر کی ولی عہدی کے لیے کوشش کریں۔ چناں چہ اکبر شاہ ثانی نے پہلے تو انگریزوں سے یہ درخواست کی کہ وہ ان کے اس حق کو تسلیم کریں کہ انھیں اپنا ولی عہد منتخب کرنے کا اختیار رہے لیکن جب انگریزوں نے ان کی یہ بات نہ مانی اور وہ مرزا ابوظفر کو ولی عہدی کا مستحق قرار دیتے رہے تو اکبر شاہ ثانی نے ظفر پر یہ الزام لگایا کہ وہ نیک کردار انسان نہیں ہیں۔ ادھر ظفر نے بھی اپنے حق کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ جب اکبر شاہ ثانی کو ظفر کی اس کارگزاری کا علم ہوا تو وہ بے حد رنجیدہ ہوئے اور انھوں نے عجلت سے

کام لیتے ہوئے مرزا جہاں گیر کی جانشینی کی تاریخ مقرر کر کے گورنر جنرل کو اس کی اطلاع دے دی۔ لیکن جب لارڈ منٹو کو یہ اطلاع ملی تو انھوں نے مرزا جہاں گیر کو ولی عہد تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ایک آخری کوشش مرزا جہاں گیر کی دادی، یعنی اکبر شاہ ثانی کی والدہ کی طرف سے کی گئی۔ ۱۸۱۲ء میں وہ کسی بہانے سے لکھنؤ گئیں اور مرزا جہاں گیر کو بھی اپنے ساتھ لیتی گئیں۔ لکھنؤ میں انھوں نے نواب وزیر سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن انگریزوں کو اس بات کا علم ہو گیا۔ چناں چہ اس سلسلے میں انگریزوں کی طرف سے بادشاہ کو سخت تنبیہہ کی گئی اور ان کا الاؤنس اس وقت تک کے لیے بند کر دیا گیا جب تک کہ وہ انگریزوں کی ہدایات پر عمل نہ کرنے لگیں۔[۴]

مرزا جہاں گیر بہت کرّوفر کے انسان تھے۔ ہو سکتا ہے کہ انگریزوں نے ولی عہدی کے معاملے میں ان کی مخالفت اس لیے کی ہو کہ ان کے تیور بہت خطرناک تھے۔[۱۴] اسپیر نے مرزا جہاں گیر کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"اکبر شاہ ثانی کے لڑکوں میں ان کے سب سے چہیتے بیٹے مرزا جہاں گیر تھے، جو سب سے زیادہ خوب صورت تھے۔ جب ان کے والد نے ان کو ولی عہد منتخب کرانے کی ناکام کوشش کی تو وہ اس وقت صرف سترہ سالہ نوجوان تھے۔ ان کے مزاج کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے چاروں طرف زر خرید مصاحبین اور جاں نثاروں کا مجمع لگا رکھا تھا۔ رزیڈنٹ نے ان کے والد پر زور دیا کہ وہ مرزا جہاں گیر کو قابو میں رکھیں۔ مرزا جہاں گیر نے رزیڈنٹ کے نمائندے کو قلعے سے باہر نکال دیا اور اس کے نمائندے پر گولی چلا دی اور جب تک سٹین انگریز فوج کی قیادت کرتا ہوا قلعے میں داخل نہیں ہو گیا، وہ گرفتار نہیں کیے جا سکے۔ بعد میں انھیں فوج کی نگرانی میں سیاسی قیدی کی حیثیت سے الٰہ آباد بھیج دیا گیا لیکن وہاں پہنچ کر انھوں نے اتنے اچھے چال چلن کا ثبوت دیا کہ انھیں جلد ہی دلّی واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ اس کے ساتھ

ہی ان کو تیرہ سو سپاہ کے ایک دستے کی قیادت بھی سونپی گئی۔ لیکن ان کی سیمابی طبیعت نے پھر گل کھلانے شروع کر دیے اور انھیں دوبارہ خود ان کے والد کی رضا سے الہ آباد بھیج دیا گیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے دو دفعہ ظفر کو زہر دینے کی کوشش کی۔ الہ آباد پہنچ کر وہ غرق مے ہو گئے اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ انھوں نے ہاف ٹین کی چیری برانڈی سے خود کو ہلاک کرنا شروع کر دیا۔ ۱۸۱۲ء میں لارڈ ہیسٹنگز سے ایک ملاقات کے دوران انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ ایک بوتل شراب سے زیادہ نہیں پیا کریں گے۔ ۱۸۲۱ء میں صرف اکیس سال کی عمر میں مرزا جہانگیر کا انتقال ہو گیا، جو کوئی خلافِ توقع بات نہیں تھی۔"۴۲

(انگریزی سے ترجمہ)

جب مرزا جہانگیر خود اکبر شاہ ثانی کی مرضی سے الہ آباد بھیج دیے گئے اور اکبر شاہ ثانی کو یہ یقین ہو گیا کہ نہ تو اب مرزا جہانگیر کی رہائی کا کوئی امکان باقی رہا ہے اور نہ ان کے ولی عہد بننے کی کوئی امید، تو انھوں نے اپنے چھوٹے لڑکے مرزا سلیم کو ولی عہد منتخب کرانے کی کوشش کی۔ مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:

"اُس (اکبر شاہ ثانی) نے اوّل یہ کوشش کی کہ مرزا جہانگیر کو اپنا ولی عہد بنائے جنھوں نے سٹین رزیڈنٹ پر گولی چلائی اور "لو لو" کہا وہ تو دلّی سے الہ آباد میں جلا وطن ہوئے۔ پھر بادشاہ نے مرزا سلیم کے لیے کوشش کی، اس میں بھی ناکامی ہوئی۔"۴۳

زمانے کو یہی منظور تھا کہ مغل سلطنت کے آخری تاج دار بہادر شاہ ظفر ہوں اور ایسا ہی ہوا۔ انگریزوں کی منشا کے مطابق وہ ولی عہد منتخب ہوئے اور اکبر شاہ ثانی کے انتقال کے بعد تخت پر بیٹھے۔ ولی عہدی کے معاملے میں اگرچہ ظفر کے ساتھ سراسر زیادتی ہو رہی تھی لیکن انھوں نے اپنے حقوق کی لڑائی میں کبھی ادب اور تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ان کے والد نے ان پر بدکرداری کا الزام عائد کیا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کے برادرِ خرد مرزا جہانگیر

نے ولی عہد بننے کی ہوس میں انھیں دو بار زہر دینے کی کوشش کی لیکن اس بات کا ثبوت کہیں نہیں ملتا کہ ان زیادتیوں کے جواب میں ان کی طرف سے کوئی نازیبا حرکت ہوئی ہو۔ اسپیئر نے ظفر کی بہت تعریف کی ہے وہ لکھتا ہے:

"مرزا ابوظفر، بہادر شاہ کے لقب سے اکبر کے جانشین مقرر ہوئے۔ عام مغل روایات کے برخلاف وہ اپنے والد کا انتخاب نہیں تھے۔ اکبر نے کئی دفعہ جہاں گیر کے مقابلے میں ان کا پتا کاٹنے کی کوشش کی، ان پر غیر فطری حرکات کے مرتکب ہونے کا الزام لگایا، جہاں گیر نے ان کو کم از کم دو دفعہ زہر دینے کی کوشش کی لیکن بہر حال ابوظفر فرزندِ اکبر تھے اور برٹش حکومت نے ان کے اس حق کو تسلیم کیا۔"[45]

(انگریزی سے ترجمہ)

آگے چل کر اسپیئر، ظفر کے بارے میں لکھتا ہے:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ اکبر کے لڑکوں میں جانشینی کے لیے موزوں ترین وہی تھا۔ وہ آخری مغل شہنشاہوں میں سب سے بڑا ہی نہیں سب سے اچھا بھی تھا۔ غدر کے سانحے نے اس کی شہرت کو داغ لگا دیا اور ایک فلسفی شاعر کو تاریخ کے سازشی باغی میں بدل کے رکھ دیا۔"[46]

(انگریزی سے ترجمہ)

ظفر کے انھی اوصاف نے انگریزوں کو ان کا گرویدہ کر دیا تھا۔ انگریز انھیں عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ظفر کے بارے میں اسپیئر نے دہلی کے رزیڈنٹ سٹین کی رائے نقل کی ہے:

"۱۸۰۸ء میں جب کہ بادشاہ کی عمر تینتیس سال تھی اور ان کے والد، مرزا جہاں گیر کی خاطر ان کے حقوق پامال کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے، سٹین نے ان کو ایک قابلِ عزت شخصیت بنایا ہے۔"[47]

(انگریزی سے ترجمہ)

۲۶ر جنوری ۱۸۲۶ء کو مٹکاف نے ظفر کے بارے میں گورنر جنرل کے ڈپٹی سکریٹری

کے نام ایک خط لکھا۔ اسپیئر کا کہنا ہے کہ مٹکاف مغلوں کے بارے میں دوستانہ تنقید سے کام نہیں لیتا۔ پھر بھی ظفر کے بارے میں اس نے اپنے اس خط میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے :

"میں نے ہمیشہ ولی عہد کو یہ ہدایت کی ہے کہ وہ اپنے والد کے رویئے پر تحمل سے کام لیں۔ میں برملا طور پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ ظفر کا طرزِ عمل ہر اعتبار سے قابلِ تعریف ہے۔ وہ بلاشبہ تمام شہزادوں میں سب سے زیادہ لائقِ تعظیم اور سب سے زیادہ قابلِ تعریف ہیں اور اپنے والد کی شفقت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں حالاں کہ یہ شفقت انھیں ملی نہیں۔ اس کے باوجود میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں آئی جہاں انھوں نے اپنے فرائضِ منصبی ادا کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی کا ثبوت دیا ہو۔" ۴۸

(انگریزی سے ترجمہ)

ظفر کی تخت نشینی

بہادر شاہ ظفر کے والد اکبر شاہ ثانی کا انتقال ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۹ء کو ہوا، اور اس کے ساتھ بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوئے۔ سر سیّد احمد خاں نے اکبر شاہ ثانی کی وفات پر یہ تاریخ کہی تھی :

چوں برفت از جہاں شہِ اکبر　　شد سیہ آسماں زدود جگر
پائے شادی شکست واحد گفت　　سالِ تاریخ او "غمِ اکبر"

۱۲۶۳
(۱۲۵۳ھ)

مولوی ذکاء اللہ نے اکبر شاہ ثانی کی تاریخِ وفات ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء بتائی ہے۔ لکھتے ہیں :

"۲۸ ستمبر کی شام کو اکبر شاہ (ثانی) بیاسی برس کی عمر میں اس جہان سے رخصت ہوا۔ اس نے اوّل یہ کوشش کی کہ مرزا جہاں گیر کو اپنا ولی عہد بنائے، جنھوں نے سٹین صاحب رزیڈنٹ پر گولی چلائی تھی اور "لو لو"

کہا تھا۔ وہ تو دہلی سے الہ آباد رخصت ہو گئے۔ پھر بادشاہ نے مرزا سلیم کے لیے کوشش کی اس میں بھی ناکامی ہوئی۔ شہزادہ ابو ظفر .... تخت نشین ہوا اور ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ غازی خطاب ہوا۔" ۵۰

اکبر شاہ ثانی کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی کا ذکر کرتے ہوئے اخبار جامِ جہاں نما لکھتا ہے:

"چھے گھڑی رات باقی تھی کہ طامس مٹکاف سوار ہو کر قلعے تشریف لائے۔ مرزا ولی عہد بہادر کو تختِ سلطنت پر جلوس کرایا۔ ایک سو بیس اشرفیاں نذر کیں اور پانچ اشرفیاں ولی عہد جدید مرزا دارا بخت کو نذر کیں۔" ۵۱

(۲۵ اکتوبر ۱۸۳۷ء)

(فارسی سے ترجمہ)

جامِ جہاں نما کی اس خبر کا دل چسپ پہلو یہ ہے کہ ظفر کی تخت نشینی کے ساتھ ہی ظفر کے جانشین کا انتخاب بھی عمل میں آ گیا۔ گویا اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں ولی عہدی کا جو قضیہ کھڑا ہوا تھا انگریزوں نے اس سے سبق حاصل کرتے ہوئے ظفر کی تخت نشینی کے ساتھ ساتھ ظفر کے ولی عہد کا معاملہ بھی طے کر دیا۔ چناں چہ مرزا دارا بخت، ظفر کے جانشین مقرر ہوئے جنھیں طامس مٹکاف نے پانچ اشرفیاں نذر کیں۔ آئینۂ سکندری میں لکھا ہے کہ ۲۰ جمادی الثانی ۱۲۵۳ھ مطابق ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء کو اکبر شاہ ثانی کی وفات ہوئی اور ۲۹ ستمبر کو ولی عہد تخت نشین ہوئے۔ ۵۲ بظاہر اس خبر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ظفر، اکبر شاہ ثانی کے انتقال کے اگلے روز تخت نشین ہوئے۔ طامس مٹکاف کے مطابق اکبر شاہ ثانی کا انتقال قطب میں ہوا اور ظفر کی تخت نشینی نصف شب کے وقت عمل میں آئی ۵۳ ان دونوں باتوں میں ایک ربط یہ پیدا ہوتا ہے کہ اکبر شاہ ثانی کے انتقال کی خبر کے قطب سے لال قلعے تک پہنچنے میں کچھ وقت ضرور لگا ہو گا اور اس کے بعد مزید وقت تخت نشینی کے ضابطوں کی تکمیل میں لگا ہو گا اس طرح نصف شب یا اس کے کچھ بعد جب تخت نشینی عمل میں آئی تو شاید اگلا دن ہو گیا تھا۔ ۵۴

بادشاہت اگرچہ برائے نام تھی لیکن شاہانہ تزک و احتشام میں کوئی فرق نہیں

آیا۔ شاہی رواج کے مطابق ساری رسمیں ادا کی گئیں اور یہ سکّہ بھی کہا گیا:

بہ سیم و زر زد شد سکّہ بفضل الٰہ   سراجِ دینِ نبی بوظفر بہادر شاہ

مولوی امام بخش صہبائی نے "چراغِ دہلی" جلوس کی تاریخ نکالی اور یہ اشعار نظم کیے:

از نشّۂ دولتِ بہادر شاہی   شد پر زمے طرب ایاغِ دہلی

بنشست بہ تختِ دولتِ روز افزوں   نزہت بفزود از وبہ باغِ دہلی

تاریخِ جلوسِ آں شہِ والا قدر   آمد بلبِ خسرو "چراغِ دہلی"

۱۲۵۳ھ

تباہ حالی کے باوجود قلعۂ مُعلّیٰ کی ظاہری شان و شوکت اب بھی کچھ کم نہیں تھی۔ ظہیر دہلوی لکھتے ہیں:

"ہر چند سلطنت تو ڈیڑھ سو برس پیشتر خاندانِ عالی شانِ تیموریہ، دودمانِ اولوالعزم گورگانیہ کو ھذا فراق بینی و بینک کہہ کر رخصت ہو چکی تھی۔ برائے نام بادشاہت رہ گئی تھی کیوں کہ ایک چھوٹی سے چھوٹی ریاستِ ہندوستان کے برابر بھی بادشاہ دہلی کو وسعت و مقدرت و استطاعت نہ رہی تھی مگر عظمت و جلال و شان و شوکت و تزک و احتشام و داب و آدابِ دربار و انتظام و جلوسِ سواری دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ہاں کسی زمانے میں یہ خاندانِ عالیشان، سردارِ فرمانروائی ہندوستانِ جنّت نشان ہوگا۔ جلّ جلالہٗ باوجود انحطاط و کسرِ تمول و قلتِ معاش، دو امر حیرت انگیز و تعجب انگیز ایسے نظر سے گزرے ہیں کہ مجھے آج تک ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا ہے۔ اول تو خدائے عالم نے اس لاکھ روپے میں ایسی برکت عطا فرمائی تھی کہ وہ خیر و برکت، وسعت و استطاعت کروروں روپے کی ریاستوں میں نہ دیکھی.......... دوم قرائنِ دربارِ سلطانی و سطوتِ جہاں بانی جو دربارِ شاہی میں دیکھے وہ کسی ریاست میں نہ پائے۔ خرچ و اخراجات

شاہی پر جو نظرِ غائر ڈالی جاتی ہے تو عقل حیران رہ جاتی ہے کہ یا الٰہی یہ کیا معاملہ ہے۔ اتنی برکت خزینۂ شاہی میں کہاں سے آگئی تھی کہ ان اخراجات کی مکتفی ہوئی تھی۔" ۵۵

معمولاتِ شاہی

بہادر شاہ ظفر کے زمانے کے لال قلعے کی زندگی میں تمام تر فرصتوں اور عیش سامانیوں کے باوجود روزمرّہ زندگی ایک طرح کے رکھ رکھاؤ اور نظم وضبط کی پابند تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ امورِ مملکت کے الجھیڑوں سے فراغت پالینے کے بعد معمولات کی وضع داریوں کو نبھانے کے زیادہ مواقع فراہم ہو گئے تھے۔ معمولات کی یہ پابندی بابر سے لے کر اورنگ زیب تک کوئی بھی مغل بادشاہ نہیں کر پایا ہوگا۔ اس لیے کہ انھیں اپنی زندگیوں میں ان جنگوں کا بھی سامنا کرنا پڑا ہے جو جہاں بانی کا ایک لازمی جز ہوتی تھیں۔ درگاہ قلی خاں کی کتاب مرقعِ دہلی سے لے کر منشی فیض الدین کی بزمِ آخر تک کا دور مغل تاریخ کا وہ دور ہے جب تہذیب اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ پروان چڑھتی گئی اور پھر ایک دن اس نے چپ چاپ اس طرح دم توڑ دیا جیسے کوئی ماہرِ فن رقاصہ اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے رقص کے عروج پر پہنچنے کے بعد اچانک بے دم ہو کر گر پڑے اس اعتبار سے ظفر کے شاہی معمولات کا ذکر دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔

معمولاتِ صبح

بادشاہ اپنے معمولاتِ صبح کے بہت پابند تھے۔ چناں چہ نیشنل آرکائوز میں بھی جتنی دستاویزیں ان کی کورٹ ڈائری سے متعلق ہیں ان میں بھی ایک ہی طرح کا مضمون درج ہے اور کم و بیش انھی معمولات کو منشی فیض الدین نے بھی بیان کیا ہے۔ بادشاہ کے معمولاتِ صبح پر روشنی ڈالتے ہوئے منشی جی لکھتے ہیں:

"چلمچی آفتابہ والیوں نے زیر انداز بچھا چلمچی آفتابہ لگایا، رومال خانے والیاں پاؤں پاک، بینی پاک لیے کھڑی ہیں۔ بادشاہ بیدار ہوئے سب نے مجرا کیا۔ مبارک باد دی۔ طشت چوکی پر گئے۔ پھر وضو کیا نماز

پڑھی، وظیفہ پڑھا، اتنے میں توشے خانے والیاں کمخواب کا دست بقچہ لے کر حاضر ہوئیں۔ پوشاک بدلی۔ دیکھو تو جسولن کیسے ادب سے ہاتھ باندھے عرض کر رہی ہے۔

'جہاں پناہ حکیم جی حاضر ہیں، حکم ہوا 'ہوں' یعنی بلاؤ۔ اے لو وہ پردہ ہو گیا۔ آگے جسولن پیچھے پیچھے حکیم جی منہ پر رومال ڈالے چلے آتے ہیں مجرا کیا، نبض دیکھی، رخصت ہوئے۔ دواخانے سے تبرید کمخواب کے کسنے میں کسی ہوئی اوپر مہر لگی ہوئی آئی۔ دواخانے والی نے مہر توڑ تبرید بادشاہ کو پلائی، بھنڈے خانے والیوں نے بھنڈا تازہ کر، کارچوبی زیر انداز بچھا، چاندی کے تاش میں لگا دیا۔ کٹوری تیار کر کے بھنڈے پر رکھ دی۔ بادشاہ نے بھنڈا نوش کیا۔ محل کی سواری کا حکم دیا۔" ۵۶

احسن الاخبار میں بھی بادشاہ کے معمولاتِ صبح کا ذکر ملتا ہے،[۵۷] لیکن اوّل تو یہ ذکر وہاں اتنی تفصیل سے نہیں پھر تہذیب کی جو چاشنی منشی فیض الدین کے بیان میں ہے وہ اخبار کی رپورٹ میں بھلا کیسے ہو سکتی ہے۔

محل کی سواری

صبح کے معمولات سے فرصت پا کر محل کی سواری کا حکم ہوتا تھا۔ محل کی سواری کی تفصیل منشی فیض الدین نے اس طرح بیان کی ہے:

"کہاریاں ہوادار لائیں۔ بادشاہ سوار ہوئے اور اس کے بعد بیگنیاں مردانے کپڑے پہنے سر پر پگڑی کمر میں دوپٹے باندھے جریب ہاتھ میں لیے اور جشنیاں، ترکنیاں، قلماقنیاں جریب پکڑے تخت کے ساتھ ساتھ ہیں۔ خواجہ سرا مورچھل کرتے جاتے ہیں جسولنیاں آگے آگے ہاتھ میں جریب لیے پکارتی جاتی ہیں 'خبردار ہو، خبردار ہو' درگاہ میں سواری آئی سلام کیا، فاتحہ پڑھی لو اب سواری پھر کر آئی، بیٹھک میں داخل ہوئی۔ بادشاہ ٹیک پر بیٹھے، ملکۂ دوراں اپنی سوزنی پر اور سب بیویاں حرمین

اپنے اپنے درجے سے دائیں طرف بیٹھیں۔ شاہزادے، شاہزادیاں اور بیگمات بائیں طرف بیٹھیں۔ جسولنیاں، خوجے باہر کی عرض معروض بادشاہ سے کر رہے ہیں، حکم احکام جاری ہو رہے ہیں، عرضیاں دستخط ہو رہی ہیں، لو ڈیڑھ پہر دن چڑھا۔ خاصے کے داروغہ نے عرض کیا، کرامات خاصے کو کیا حکم ہے، حکم ہوا 'اچھا'۔ جسولن نے خاصے والیوں کو آواز دی، بویو خاصہ لاؤ، نعمت خانہ تیار کرو۔" ۵۸

خاصہ

قلعے میں بادشاہوں کے کھانے کو خاصہ کہا کرتے تھے۔ بادشاہ جب دوپہر کے معمولات سے فرصت پاتے تھے، تب خاصے کی تیاری ہوتی تھی، اور ایک بہت بڑا دسترخوان بچھایا جاتا تھا جس پر بادشاہ کے علاوہ تمام شہزادے، شہزادیاں اور بیگمات وغیرہ سب ہوتے تھے۔ اس دسترخوان پر بادشاہ کی نشست ممتاز ہوا کرتی تھی۔ خاصے کی تیاری کا منظر ملاحظہ ہو:

"کہاریاں، کشمیرنیں دوڑیں۔ دیکھو ہنڈکلیا، چھوٹے خاصے، بڑے خاصے کے خوان سر پر لیے چلی آتی ہیں۔ خوانوں کا تار لگ رہا ہے۔ اے لو، خاصے والیوں نے پہلے ایک سات گز لمبا تین گز چکلا چمڑا بچھایا اور اوپر سفید دسترخوان بچھایا۔ بیچ میں دو گز لمبی، ڈیڑھ گز چکلی چھ گز اونچی چوکی لگائی۔ اس پر پہلے چمڑا پھر دسترخوان بچھا۔ خاص خوراک کے خوان مہر لگے ہوئے چوکی پر لگا خاصے کی داروغہ سامنے ہو بیٹھی۔ اس پر بادشاہ خاصہ کھائیں گے باقی دسترخوان پر بیگماتیں، شہزادے، شاہ زادیاں کھانا کھائیں گی۔ لو اب کھانا چنا جاتا ہے۔" ۵۹

دسترخوان پر انواع و اقسام کے کھانے چنے جاتے اور اس طرح خاصہ شروع ہوتا تھا:

"مشک، زعفران، کیوڑے کی بو سے تمام مکان مہک رہا ہے، چاندی کے ورقوں سے دسترخوان جگمگا رہا ہے۔ چلمچی، آفتابہ، بیسن دانی، چنبیلی کی

کھلی صندل کی ٹکیوں کی ڈبیاں ایک طرف زیر انداز پر لگی۔ رومال، زانوپوش دست پاک، بینی پاک۔ ایک طرف رومال خانے والیاں ہاتھوں میں رومال لیے کھڑی ہیں۔ جسولن نے عرض کیا حضور خاصہ تیار ہے۔ بادشاہ اپنی ٹیک پر چوکی کے سامنے آن کر بیٹھے۔ دائیں طرف ملکۂ دوراں اور بیگمات بائیں طرف شاہزادے شاہزادیاں بیٹھیں۔ رومال خانے والیوں نے زانوپوش گھٹنوں پر ڈال دیا، دست پاک آگے رکھ دیے۔ خاصے کی داروغہ نے خاص خوراک کی مہر توڑ کر خاصہ کھلانا شروع کیا۔ دیکھو بادشاہ آلتی پالتی مارے بیٹھے خاصہ کھا رہے ہیں۔ بیگماتیں، شہزادے شہزادیاں کیسے ادب سے نیچی نگاہ کیے کھانا کھا رہی ہیں جس کو بادشاہ اپنے ہاتھ سے التش مرحمت فرماتے ہیں کیسا سروقد ہو کر آداب بجا کر لیتا ہے۔" ۶۰

خاصے کے بعد قیلولے کے لیے جانے سے پہلے کا منظر بھی دیکھتے چلیے:

"...... بادشاہ خاصہ کھا چکے، دعا مانگی۔ پہلے بیسن، پھر کھلی اور صندل کی ٹکیوں سے ہاتھ دھوئے۔ دسترخوان بڑھایا۔ پلنگ خانے والیوں نے جھٹ پٹ پلنگ جھاڑ جھوڑ اونچا گیرا، چادر کس کسا تکیے لگا، تکیہ پوش ڈال دولائی، چادر، چادرہ، مرزائی پائنتی لگا پلنگ آراستہ کیا۔ بادشاہ خواب گاہ میں آئے، پلنگ پر بیٹھے، بھنڈا نوش کیا، گھنٹہ بھر بعد آبِ حیات مانگا۔ آب دار خانے کے داروغہ نے گنگا کا پانی جو صراحیوں میں بھرا برف میں لگا ہوا ہے جھٹ ایک توڑ کی صراحی نکال، مہر لگا گملی صافی لپیٹ خوجے کے حوالے کیا۔ اس نے بادشاہ کے سامنے مہر توڑ، چاندی کے ظرف میں نکال بادشاہ کو پلایا۔ دیکھو پینے کے وقت سب کھڑے ہو گئے۔ جب پی چکے تو سب نے مزید حیات کہا مجرا کیا۔ لے لو وہ دوپہر بجی، بادشاہ پلنگ پر دراز ہوئے۔ خواب گاہ کے پردے چھٹ گئے۔ چپی والیاں چپی پر آ بیٹھیں۔ دیکھو تو اب کیسی چپ چاپ ہو گئی۔ کیا

مجال کوئی ہوں تو کر سکے۔" ۶۱

قیلولے سے فارغ ہوکر بادشاہ ظہر کی نماز ادا کرتے، وظیفہ پڑھتے، لوگوں کی عرض معروض سنتے غرض مغرب تک یہی معمول رہتا ۶۲

معمولاتِ شب

بادشاہ کے معمولات شب نصف شب سے پہلے ختم نہیں ہوتے تھے۔ رقص و سرود کی محفلیں آراستہ ہوتیں اور بادشاہ ان سے لطف اندوز ہوتے:

"عشا کا وقت آیا، نماز و وظیفے سے فارغ ہوئے ناچ گانے کی تیاری ہوئی تان رس خاں چوکی کے طائفے حاضر ہوئے۔ ناچ ہونے لگا۔ لے لو سازندے قنات کے پیچھے کھڑے طبلہ سارنگی تال کی جوڑی بجا رہے ہیں۔ ناچنے والی بادشاہ کے سامنے ناچ رہی ہے۔ وہ ڈیڑھ پہر رات کی توپ چلی دھائیں پھر اسی طرح خاصے کی تیاری ہوئی۔ خاصا کھایا، ٹھنڈا نوش کیا، وہی گھنٹہ بھر پیچھے آبِ حیات مانگا۔ آدھی رات کی نوبت بجنی شروع ہوئی۔ آرام فرمایا۔" ۶۳

دربار

شاہی دربار کا احوال منشی فیض الدین نے اس طرح بیان کیا ہے:

"بادشاہ تخت پر بیٹھے ہیں۔ امیر، وزیر، بخشی، ناظر، وکیل میر منشی، محرر، منصدی وغیرہ ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ اپنے اپنے محکموں کے کاغذات پیش کر رہے ہیں۔ میر عدل بہادر دارالانصاف کے مقدمے پیش کر رہا ہے...... حکم احکام جاری ہو رہے ہیں۔ دارالانشا سے کسی کے نام شقہ کسی کو فرمان لکھا جاتا ہے۔ شقوں میں شاہزادوں کے القاب نورِ چشم طول عمرہٗ، معزز امیروں کو فدوی خاص لکھتے ہیں۔ شقوں کی پیشانی پر سرمے کی قلم سے صاد صہ ہے۔

امیر غریب بادشاہ کو عرضی میں القاب جہاں پناہ سلامت لکھتے ہیں۔ بادشاہ عرضیوں میں سرمے کے قلم سے دستخط کرتے ہیں۔" ۶۴

دیوانِ خاص

دیوانِ خاص کا دربار مغلیہ جاہ و جلال اور شوکت و حشمت کا مکمل نمونہ تھا۔ دیوانِ خاص تک ہر کس و ناکس کی رسائی نہیں تھی۔ دیوانِ خاص میں داخل ہونے کے معیار بڑے سخت تھے۔ دیوانِ خاص کے آداب اور قرینوں سے وہی لوگ واقف ہوتے تھے جن کی کئی نسلیں دربار شاہی میں حاضری دیتے گزری تھیں۔ ظہیر دہلوی دیوانِ خاص کے آداب و قرائن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"دونوں پہلوؤں میں دو طرفہ دو صفیں درباریوں کی دست بستہ ایستادہ ہوتی تھیں۔ سب نیچی نگاہیں کیے رہتے تھے، خاموش! مجال کیا ہے کہ کوئی کسی طرف دیکھ لے یا کھجائے یا مسکرائے یا بات کرے۔ دربار کے دونوں گوشوں پر دو قطار لکڑی بردار دو لکڑیاں سرخ لیے کھڑے رہتے تھے۔ ذرا سی کسی نے بے اعتدالی کی اور گردن میں لکڑی ڈال کر دربار سے باہر کیا۔ اور رؤسائے ہند کا سا دربار نہ تھا۔ دیوانِ خاص کے مقابل لال پردے کا دروازہ تھا وہاں سرخ قنات کا پردہ کھچا رہتا تھا۔ جو شخص دروازے میں سے داخل دیوانِ خاص ہوتا تھا پہلے لال پردے کے آگے آکر سلام گہہ پر ایستادہ ہوتا تھا، آداب تسلیمات بجالاتا تھا اور تین سلام مؤدب بہت جھک کر بجالاتا اور نقیب لال پردے کے برابر آواز لگاتا۔ ملاحظہ آداب ہے آداب بجالاؤ۔ جہاں پناہ بادشاہ سلامت عالم پناہ، بادشاہ سلامت۔ بعد اس کے شخص سلامی پہلو میں ہو کر عقب حمام کی جانب کے زینے دیوانِ خاص کے چبوترے پر چڑھتا اور نعلین خالی کرکے اور دیوانِ خاص میں جاکر دوسری سلام گاہ پر آداب بجالاتا اور نقیب دربار بطور اول آواز لگاتا اور سلام کراتا۔ اگر نذر گزرانی ہوتی تو سیدھا تخت کی جانب جاکر نذر پیش کرے گا اور بادشاہ نذر اٹھا کر نذر و نثار کے داروغہ کو دے دیتے۔ نذر و نثار کا داروغہ تخت کے پہلو میں ایستادہ رہتا تھا اور ایک متصدی لکھتا جاتا تھا مگر نذر دے کر پچھلے قدموں ہٹ کر سلام گاہ تک جاتا اور

بہ قاعدۂ اوّل پھر اسی طرح آداب بجالاتا اور جہاں جا ملتی صفِ دربار میں جا ملتا تھا۔ تخت کے عقب میں خواص لوگ عہدے سے کھڑے رہتے تھے۔ وہ بالِ ہما سے مگس رانی کرتے تھے۔ اگر کچھ عرض و معروض کرنی ہے تو عرض بیگی دونوں صفوں میں دربار کے سرے پر کھڑے رہتے تھے۔ عرضی ان کو دے دی جاتی تھی اور وہ عرضی لے جاتے تھے۔ بادشاہ کے سامنے عرضی کھول کر ملاحظہ کرا دیتے تھے۔" ۶۵

تختِ ہما

جب ابوظفر بادشاہ بنے اور سراج الدین بہادر شاہ کا لقب اختیار کر کے تخت پر بیٹھے تو انھوں نے اپنے اجلاس کے واسطے ایک ہشت پہلو گنگا جمنی تخت تیار کرایا اور اس تخت کا نام انھوں نے 'تختِ ہما' رکھا۔ 'تختِ ہما' پر بیٹھ کر بہادر شاہ ظفرؔ صرف ایک ہی بار دربار کر سکے۔ اس کے بعد انگریزوں کی طرف سے بادشاہ کو اس تخت پر بیٹھنے کی ممانعت ہو گئی تھی۔ اس کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ بادشاہ نے گورنر جنرل لارڈ ایلن برا کو اپنے دربار میں بیٹھنے کے لیے کرسی پیش نہیں کی تھی۔ لہٰذا گورنر جنرل نے اسے اپنی توہین سمجھا اور اسی کے ردِّ عمل میں انگریزوں کی طرف سے 'تختِ ہما' پر بیٹھنے کی ممانعت ہوئی۔ ۶۶

بادشاہ کی سواری

بادشاہ کی سواری کا ذکر کرتے ہوئے ظہیرؔ دہلوی لکھتے ہیں کہ "بادشاہ کی سواری کی گاڑی میں سولہ گھوڑے لگائے جاتے تھے اور نواب زینت محل بیگم صاحبہ کی سواری میں آٹھ گھوڑے لگائے جاتے تھے۔" ۶۷

شعبہ جاتِ قلعہ

قلعۂ معلّا کے مختلف شعبوں کی تفصیل ظہیرؔ دہلوی نے اس طرح بیان کی ہے:

"کارخانہ جات بادشاہی

خاصۂ کلاں، خاصۂ خرد، آب دار خانہ، دوا خانہ، توشہ خانہ، جواہر خانہ (؟) خانہ، سلاح خانہ، اصطبل، خانسامانے فیل خانہ، بگھی خانہ، توپ خانہ،

شتر خانہ (؟)، خانہ، کارخانہ جلوس، ماہی مراتب (چتر و علم)، بخشی خانہ فوج، کتب خانہ، کبوتر خانہ، داروغہ نذر و نثار، داروغہ فراش خانہ، پالکی خانہ، داروغہ کہاران، داروغہ خاص پرداران، جمعدار صبیان ؟ نواب ناظر، افسر خواجہ سرایان......

تفصیل افواج

سپاہ پلٹن، اگری پلٹن، پچھیرا پلٹن، خاص برداران، رسالہ سواران۔

معززین دربارِ معلّا

وزرا، پیر و مرشد، اوستادان، علما، حکما، شاہزادگان، نواب ناظر بخشی فوج، برداران، کسان کمیدان، کاملین فن، مہتممان کارخانہ جات، عرض بیگیاں

صیغہ ہائے تقسیم تنخواہ

تنخواہ محلات شہزادگان، صیغہ سرکار قدیم، صیغہ علاقہ بخشی گری، صیغہ روزینہ داری، تعلقہ نظارت، معززین دربار، ملازمانِ فوج ۶۸

آمدنی

بہادر شاہ ظفر کے والد، اکبر شاہ ثانی کو انگریزی سرکار سے ایک لاکھ روپے ماہانہ پنشن ملتی تھی لیکن ان کے پاس اپنے والد، شاہ عالم ثانی کا اندوختہ بھی تھا اس لیے وہ نسبتاً آسائش کے ساتھ بسر کرتے رہے۔ آخر عمر میں جب یہ اندوختہ ختم ہوگیا اور محض سرکاری پنشن پر ہی گزارا رہ گیا تو بادشاہ نے انگریزوں سے پنشن میں اضافے کا مطالبہ کیا۔ لیکن اس مطالبے پر انگریزوں نے توجہ نہیں کی۔ چناں چہ اس سلسلے میں اکبر شاہ ثانی نے راجا رام موہن رائے کو اپنا سفیر بنا کر انگلستان کے لیے روانہ کیا۔ راجا رام موہن رائے کا قیام انگلستان میں تین برس رہا اور وہیں بالآخر وہ فوت ہو گئے۔ راجا رام موہن رائے کے مشن کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی کے وقت لال قلعے میں شاہی ٹھاٹھ باٹ کے اعتبار سے عسرت اور تنگدستی کا زمانہ تھا۔ اخراجات کا وہی عالم تھا اور آمدنی کے ذرائع مسدود تھے۔ ظہیر دہلوی بادشاہ کی آمدنی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"فقط ایک لاکھ روپیہ ماہ وار تو سرکارِ انگریزی سے آتا تھا اور کسی قدر پرگنات و محلات و تہہ بازاری کرایہ دکانیں و آمدنی باغات وطیول و نزول و خالصہ وغیرہ کی آمدنی تھی۔ من کل الوجوہ سوا لاکھ روپے ماہ وار تصور کر لینا چاہیے۔" ۶۹

مولوی ذکاء اللہ نے بھی ظفر کی آمدنی کا لگ بھگ یہی تخمینہ لگایا ہے:

"اس لاکھ روپیہ ماہ وار کے سوا بہادر شاہ کی آمدنی ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی علاقہ کوٹ قاسم کی اور شہر میں تیول شاہی کے کرایے کی اور تھی۔" ۷۰

جس طرح بہادر شاہ ظفر کے والد نے راجا رام موہن رائے کی خدمات حاصل کی تھیں، اسی طرح ظفر نے بھی اپنی مطلب برآری کے لیے ایک انگریز کو منتخب کیا تھا۔ اس انگریز کا نام جارج طامس تھا۔ اس شخص کی تحریر و تقریر کی بڑی شہرت تھی اور اسے ہندوستانی زبان پر عبور کامل تھا۔ جارج طامس بہادر شاہ ظفر کے سفیر بن کر انگلستان گئے اور انھوں نے بھی وہاں وہی فرائض انجام دینے کی کوشش کی، جو راجا رام موہن رائے نے کی تھی۔[۱] لیکن ایسا لگتا ہے کہ جارج طامس کی کوششوں کا بھی پہلا جیسا ہی انجام ہوا۔

بہادر شاہ ظفر کو برٹش گورنمنٹ کی طرف سے بارہ لاکھ روپے سالانہ وظیفے کے علاوہ کچھ اور مالی امداد بھی ملتی تھی لیکن اس کی صورت یہ تھی کہ عیدین، نوروز یا بادشاہ کی سال گرہ کے دن گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف کی طرف سے بادشاہ کو نذر پیش کی جاتی تھی۔ اس طرح کچھ رقم بادشاہ کو ان تقریبات کے اخراجات کے لیے مل جاتی تھی۔ جب بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوئے تو اس وقت بھی کمانڈر انچیف نے ان کو دستور کے مطابق نذر پیش کی تھی۔[۲] لیکن بعد میں یہ سلسلہ ختم کر دیا گیا اور بادشاہ کی آمدنی کا یہ ذریعہ بند ہو گیا۔ بڑی تگ و دو کے بعد سات آٹھ سال بعد جا کر یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ تہوار اور تقاریب کے خرچ کے لیے تین لاکھ روپے سالانہ یعنی پچیس ہزار روپے ماہانہ کا اضافہ ہوا۔ اس طرح ظفر کی پنشن ایک لاکھ کے بجائے سوا لاکھ روپے ماہانہ ہو گئی۔ کورٹ آف ڈائرکٹرز نے یہ فیصلہ ۴ دسمبر

۱۸۴۴ء کو کیا"۴۳ ۲۵ر اپریل ۱۸۴۵ء کے احسن الاخبار میں بادشاہ کی پنشن میں اضافے کی خبر اس طرح موجود ہے:

"صاحبانِ کورٹ آف ڈائرکٹرز بہادر نے تین لاکھ روپیہ سالانہ پر ۲۵ ہزار روپے کا اضافہ فرمایا۔"۴۴

کورٹ آف ڈائرکٹرز کے اس فیصلے کی اطلاع بادشاہ کو مزید چھے ماہ بعد دی گئی۔ چناں چہ ۱۴ر اکتوبر ۱۸۴۵ء کے احسن الاخبار کی اطلاع ہے:

"بروز شنبہ ۱۸ تاریخ کو نوّاب گورنر جنرل بہادر کی عرضی پہنچی کہ ۲۵ ہزار روپیہ ماہ وار کا اضافہ منظور کیا گیا۔"۴۵

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس فیصلے پر کافی دیر بعد عمل ہوا۔ چنانچہ طامس مٹکاف اپنی ڈائری میں ۱۰ر اپریل ۱۸۴۹ء کو لکھتا ہے:

"اس وقت تک انگریزی خزانے سے قلعے کے اندر تنخواہ کے ایک لاکھ روپے آتے ہیں۔ آئندہ سوا لاکھ آیا کریں گے۔"۴۶

گویا سوا لاکھ روپے ماہانہ بادشاہ کی پنشن اور تقریباً پچیس ہزار روپے ماہانہ پرگنہ کوٹ قاسم اور دیگر مکانات اور دکانوں وغیرہ کا کرایہ، اس طرح بادشاہ کی آمدنی کل ملا کر ڈیڑھ لاکھ روپے ماہانہ ہو گئی۔ لیکن شاہی اخراجات کے مقابلے میں یہ رقم اب بھی انتہائی حقیر تھی۔ آہستہ آہستہ بادشاہ مقروض ہوتے گئے یہاں تک کہ ایک وقت وہ آگیا کہ پرگنہ کوٹ قاسم کی آمدنی قرضوں کی ادائیگی میں جانے لگی اور بادشاہ کی آمدنی محض سوا لاکھ روپے ماہانہ ہی رہ گئی۔ ۲۹ر جون ۱۸۴۷ء کے احسن الاخبار کی خبر ہے:

"گیارہ ہزار چار سو روپے پرگنہ کوٹ قاسم کی آمدنی کے تحصیل دار صاحب نے بھیجے تھے نوّاب صاحب کلاں بہادر نے وہ سب روپیہ قرض داروں کی ادائیگی میں خرچ کر دیا۔"۴۷

۴ر دسمبر ۱۸۴۴ء کو جب کورٹ آف ڈائرکٹرز نے تہواروں اور تقریبوں کے لیے پنشن میں تین لاکھ روپے سالانہ کا اضافہ منظور کیا تھا تو اس کے ساتھ اصل پنشن میں بھی اضافے

کا وعدہ کیا تھا لیکن اس کی دو شرائط تھیں۔ اوّل یہ کہ بادشاہ مستقبل میں پھر کسی قسم کے اضافے کا مطالبہ نہیں کریں گے اور دوسرے یہ کہ تیول کی زمین کا انتظام برٹش گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہوگا۔ بادشاہ نے ابتدا میں ان دونوں تجاویز کو مسترد کر دیا لیکن ان پر قرض کا اتنا بار تھا کہ آخر ۱۸۴۳ء میں انھوں نے بادلِ ناخواستہ یہ شرائط مان لیں، لیکن تین ماہ بعد معاہدے نے آخری شکل اختیار کی تو معاملات کچھ سے کچھ ہو گئے۔ اس عہد نامے کی تفاصیل طامس مٹکاف نے اپنی ڈائری میں ۱۶ مارچ، ۲۷ مارچ اور ۱۱ اپریل ۱۸۴۹ء کی تاریخوں میں درج کی ہیں جو بجنسہٖ اس طرح ہیں :

"مورخہ ۱۶ مارچ ۱۸۴۹ء

کچھ عرصہ ہوا حضور بادشاہ سلامت نے انگریزی سرکار سے دو درخواستیں کی تھیں۔ ایک یہ کہ بادشاہ کی تنخواہ کم ہے خرچ پورا نہیں ہوتا، تنخواہ بڑھا دی جائے اور دوسری یہ کہ بادشاہ کے ذمّے جو قرضہ ہے وہ ادا کر دیا جائے۔

آج لفٹننٹ گورنر بہادر آگرہ نے درخواستوں کا حسب ذیل جواب بھیجا ہے جس میں سات شرطیں منظور کر لی جائیں تو حضور کی تنخواہ میں بھی اضافہ کر دیا جائے گا اور قرض بھی ادا کر دیا جائے گا۔

پہلی شرط یہ ہے کہ حضور والا کے اور شاہزادوں کے اور بیگمات کے اور تمام تیموری خاندان کے جس قدر دیہات، جاگیریں اور باغ اور کنویں اور مکانات وغیرہ ہیں سب انگریزی سرکار کے حوالے کر دیے جائیں۔

دوسری شرط یہ ہے کہ جو جائیداد مذکورہ اشخاص انگریزی سرکار کے حوالے کریں گے تو وہ اگر واپس مانگیں گے تو واپس نہ کی جائے گی۔

تیسری شرط یہ ہے کہ حضور والا نے اپنی ایک لاکھ روپے ماہوار کی تنخواہ میں سے اپنے شہزادوں اور بیگمات اور خاندان والوں کی جو

تنخواہیں مقرر کر رکھی ہیں اور جن میں حضور والا اضافہ کرانا چاہتے ہیں، یہ اس شرط سے منظور کیا جا سکتا ہے کہ جب وہ شخص مر جائے گا جس کی کوئی تنخواہ تھی اور جس پر اضافہ ہوا تھا تو وہ تنخواہ اور اضافہ دونوں بحقِ سرکارِ انگریزی ضبط ہو جائیں گے۔ مرنے والوں کے وارثوں کو کچھ نہیں دیا جائے گا۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ حضور والا نے لکھا کہ شاہ عالم اور اکبر شاہ اور بہادر شاہ کی اولاد کے علاوہ دوسرے ستّر شہزادوں کو قلعے سے باہر کر دیا جائے گا اور اس کے ساتھ ہی ان سب لوگوں کو بھی قلعے سے نکال دیا جائے گا جو مذکورہ ستّر آدمیوں کے علاوہ شاہ عالم سے پہلے بادشاہوں کی اولاد ہیں۔ اور بہ کثرت قلعے کے اندر آباد ہیں۔

پانچویں شرط یہ ہے کہ ہر مہینے تیموریہ خاندان کی حیات و ممات یعنی پیدا ہونے والوں اور مرنے والوں کا ایک نقشا انگریزی سرکار میں بھیجنا ہوگا تاکہ ہر شخص کی موت کے بعد اس کی تنخواہ ضبط کی جا سکے۔

چھٹی شرط یہ ہے کہ خرچ سے قلعے کے اندر انگریزی تعلیم کا ایک اسکول جاری کرنا ہوگا۔

ساتویں شرط یہ ہے کہ قلعے کی عمارتوں کی مرمت اور تنخواہوں کی تقسیم آئندہ ایجنٹ بہادر کی معرفت ہوا کرے گی۔" ۸

بہادر شاہ لاکھ مالی پریشانیوں کا شکار ہوں لیکن یہ شرائط اتنی کڑی تھیں کہ ان کو منظور کرنا ان کے لیے مشکل تھا۔ شرائط کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بادشاہ کو بالکل شکنجے میں کسنے کی کوشش کی جا رہی تھی لیکن ان کے پاس کوئی چارۂ کار رہ بھی نہیں گیا تھا۔ لہٰذا مجبوراً بادشاہ کو یہ شرائط ماننی پڑیں جس کا ذکر طامس مٹکاف نے ۲۷ مارچ ۱۸۴۹ء کو اس طرح کیا ہے:

"معلوم ہوا ہے کہ بادشاہ سلامت نے روپے کے لالچ میں لفٹننٹ

گورنر آگرہ کی سب شرائط منظور کر لی ہیں اس لیے بموجب حکم لفٹننٹ گورنر بہادر دہلی کے ایجنٹ مجسٹریٹ نے شاہی قرضے اور تنخواہوں کے اضافے کی تحقیقات کا کام کچہری ایجنسی میں شروع کر دیا ہے اور صاحب ایجنٹ بہادر نے ایک اہل کار اور کاغذات متعلقہ صاحب مجسٹریٹ دہلی کے حوالے کر دیے ہیں۔" ۹

انگریزوں کی تحقیقاتی کمیٹی نے جب شاہی قرضوں اور تحقیقات کا کام مکمل کر لیا تو اس کے بعد بادشاہ اور کمپنی کے درمیان ان شرائط کے مطابق جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے معاہدہ ہو گیا اور اس معاہدے کو عام رعایا کی اطلاع کے لیے سراج الاخبار میں شائع کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ معاہدے کی آخری شکل یہ تھی :

"(۱) حضور بادشاہ سلامت نے اپنی جیب خاص کے لیے پانچ ہزار روپے ماہ وار منظور فرمائے ہیں۔

(۲) جو کچھ بادشاہ سلامت اور ان کے خاص ملازمین کے ذمے قرضہ ہے اس قرضے کا ایجنٹ بہادر کے ذریعے انگریزی سرکار تمام و کمال انتظام کرے گی۔

(۳) سابقہ تجویز اہالیان بورڈ کے مطابق انگریزی سرکار نے شاہی تنخواہیں جن کی مقدار ایک لاکھ روپے ماہ وار ہے منظور کیا ہے کہ پچاس ہزار پانچ سو ستر ماہ وار اس تنخواہ میں اضافہ کیا جائے گا مگر اس اضافے سے پہلے قلعے کی مرمت کی جائے گی۔

(۴) جو شہزادے موجودہ بادشاہ کی اولاد نہیں ہیں، سلاطین سابق کی اولاد ہیں اور جو موجودہ بادشاہ کے قریبی قرابت دار بھی ہیں اور قلعے کے اندر آباد ہونا چاہتے ہیں ان کی تنخواہوں میں بھی سرکار انگریزی اضافہ کرے گی اور ان کو قلعے کے اندر آباد ہونے کی اجازت دے گی اور جو شہزادے قلعے کے باہر رہتے ہیں اور موجودہ بادشاہ

سے دور کی قرابت رکھتے ہیں ان کی تنخواہوں میں بھی اضافہ کیا جائے گا۔

(۵) موجودہ بادشاہ کی اولاد اور ان کے والد اکبر شاہ کی اولاد اور ان کے دادا شاہ عالم کی اولاد قریبی قرابت دار مانے جائیں گے اور ان میں تین بادشاہوں سے اوپر کے بادشاہوں کی اولاد کو دور کا قرابت دار تصور کیا جائے گا۔

(۶) جو دیہات شاہی ملکیت مانے جاتے ہیں وہ سب انگریزی سرکار کے حوالے کر دیے جائیں گے۔

(۷) ایسے سب دیہات کا نقشا اور بادشاہ کے قرابت داروں کا نقشا حکومتِ انگریزی کو بھیجا جائے گا۔" ۸۰

انگریزی سرکار کو محض دہلی کی چنگی سے لاکھوں روپے کی آمدنی تھی لیکن بادشاہ کو جس نے تمام ملک انگریزوں کے حوالے کر دیا تھا، محض سوا لاکھ روپے ماہانہ ملتا تھا۔ اس کی وجہ سے بادشاہ پیسے پیسے کو محتاج رہتے تھے اور معمولی حیثیت کے لوگوں کے آگے قرض کے لیے ہاتھ پھیلاتے تھے۔ اگر انگریز بادشاہ کو صرف دہلی کی چنگی کی آمدنی کا حق دار ہی قرار دے دیتے تو بادشاہ کی مالی حالت اتنی خراب نہ ہوتی۔ یکم اکتوبر ۱۸۴۷ء کے احسن الاخبار کی ایک خبر کے مطابق چنگی کی آمدنی ۱۸۴۵ء میں چھتیس لاکھ نوہزار پانچ سو اکیس روپے تھی اور اس لحاظ سے آمدنی کا ماہانہ اوسط تین لاکھ سے کچھ زیادہ ہوا۔ ۱۸۴۶ء میں یہ آمدنی بڑھ کر چھیالیس لاکھ اُنسٹھ ہزار دو سو ستاون روپے تک پہنچ گئی تھی۔ ۸۱

زر طلبی

بہادر شاہ ظفر کی آمدنی کم اور اخراجات ضرورت سے زیادہ تھے جس کی وجہ سے انھیں ہمیشہ مالی مشکلات کا سامنا رہتا تھا۔ ان مشکلات کے حل کے لیے انھیں ہر وقت روپے کی فراہمی کی فکر دامن گیر رہتی تھی جس کے لیے وہ مختلف ذرائع سے روپیا حاصل کرنے کی فکر میں مبتلا رہتے تھے۔ بادشاہ کی روپے کی اس ضرورت مندانہ طلب کو دیکھتے ہوئے لوگوں نے ان کے بارے میں یہ رائے قائم کرنی شروع کر دی تھی کہ وہ حریص اور زر پرست تھے۔ مولوی

ذکاء اللہ لکھتے ہیں :

"اس میں کسی قسم کی سازش کرنے کی لیاقت قدرت نے دی ہی نہیں تھی مگر وہ حریص و زر پرست تھا۔" ۸۲

روپیا حاصل کرنے کے سلسلے میں بعض اوقات ایسی باتیں بھی ہو جایا کرتی تھیں، جو ان کے شایانِ شان نہیں تھیں۔ مثلاً احسن الاخبار کی ایک خبر ہے :

"عرض کیا گیا کہ مرزا محمد شاہ رخ بیگ کے مکانوں میں سے ایک مکان کی دیوار گر پڑی ہے، باہر سے اندر کا سارا حصہ نظر آتا ہے۔ پرانے کلابتون سے بھرے ہوئے دو صندوق، سنہری کام کے بیلے، اشرفیوں کا دیگچہ، روپوں کا ایک دیگچہ باہر نکل کر گر پڑا ہے۔ حکم ہوا خزانہ، عامرہ میں داخل کیا جائے۔" ۸۳

۱۵ اکتوبر ۱۸۴۵ء

ایسے حالات میں جب کہ مرزا شاہ رخ بیگ زندہ ہوں اور ان کے بیوی بچے بھی موجود ہوں، یہ کسی طرح مناسب نہیں تھا کہ ان کے مال و متاع کو خزانہ، عامرہ میں داخل کر لیا جاتا۔ اسی طرح جب ولی عہد مرزا دارا بخت کا انتقال ہوا تو انتقال کے اگلے ہی ماہ بادشاہ نے ان کا تمام سامان مقفل کرا دیا۔ اس روداد کو طامس مٹکاف نے ۲۲ فروری ۱۸۴۹ء کو اپنے روزنامچے میں اس طرح لکھا ہے :

"کسی نے حضور سے کہا کہ ولی عہد مرحوم کا جو سامان کمرے کے اندر مقفل تھا۔ ولی عہد مرحوم کے لڑکوں نے دوسری کنجی سے کھول کر سب سامان نکال لیا۔ حضور والا نے یہ خبر سن کر آدمی بھیج کر لڑکوں کے مکان سے سامان اٹھوا کر منگوا لیا۔ لڑکوں نے عرضی دی سامان ہمارے والد کا تھا۔ حضور نے کیوں اٹھوا کر منگوا لیا۔" ۸۴

یہی نہیں بلکہ کچھ دن بعد بادشاہ نے یہ سامان نیلام بھی کرا دیا جس پر سرکاری حلقوں میں بڑی ناراضی کا اظہار کیا گیا اور لفٹیننٹ گورنر آگرہ نے رزیڈنٹ سے یہ دریافت کیا کہ ایسا کیوں ہوا۔ مٹکاف اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے :

"اگرے سے بھی یہ دریافت کیا گیا ہے کہ بادشاہ نے کن اختیارات کے بموجب ولی عہد مرحوم کا اسباب نیلام کرایا، اس کی کیفیت بھی بادشاہ سے دریافت کرکے لکھی جائے۔"[۸۵]

۲۷ مارچ ۱۸۴۹ء

اخراجات

بہادر شاہ ظفر کے اختیارات اگرچہ قلعے کی چہار دیواری تک ہی محدود تھے لیکن اس کے باوجود وہ خود کو سچ مچ کا بادشاہ سمجھتے تھے اور شاہانہ ٹھاٹھ باٹ سے ہی زندگی گزارنے کی کوشش کرتے تھے۔ داد و دہش، جشن اور تقاریب کا سلسلہ مغلیہ روایات کے مطابق جاری رہتا۔ اگر کسی کے ہاں موت ہو جائے تو اس سلسلے میں بھی وہ مدد کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ گوہر النساء بیگم کی وفات پر انھوں نے ساڑھے پانچ سو روپے تجہیز و تکفین کے لیے دیے۔[۸۶] اسی طرح جب مرزا مغل بیگ، مختارِ حکومت کا انتقال ہوا تو بادشاہ نے سات ہاتھی، سات رتھ اور دو تمن سپاہیوں کے جنازے کے جلوس کے واسطے بھیجے اور کچھ زرِ نقد مرزا مغل بیگ کی بیوہ کو بھیجا اور ساتھ ہی کہلا بھیجا کہ جنازہ عزت و احترام کے ساتھ اٹھایا جائے۔ جو کچھ اس میں صرف ہوگا، حضور سے مرحمت ہوگا۔"[۸۷]

بادشاہ، حضرت کالے صاحب کے مرید تھے اس لیے پابندی سے چار ہزار روپے سالانہ ان کی خدمت میں بھیجا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ جب بادشاہ نے روپیا قسطوں میں بھیجنا چاہا تو حضرت کالے صاحب نے واپس کر دیا۔[۸۸] احسن الاخبار ۴ دسمبر ۱۸۴۶ء کی ایک خبر سے پتا چلتا ہے کہ حضرت کالے صاحب کو یہ رقم یک مشت ملتی تھی اور عموماً بیگم زینت محل کی معرفت پہنچتی تھی۔[۸۹] مولوی ذکاء اللہ نے لکھا ہے کہ بارہ ہزار روپے سال بہادر شاہ، لکھنؤ میں اپنے بھتیجوں کی تنخواہ کے بھیجتے تھے۔[۹۰] ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہواروں پر بھی بادشاہ روپیا خرچ کرتے تھے۔[۹۱] یہاں مثال کے طور پر مٹکاف کی ڈائری کا ایک اقتباس پیش کیا جاسکتا ہے:

"سورج گرہن کے سبب بادشاہ ترازو کے ایک پلّے میں بیٹھے، دوسرے پلّے میں ست نگا غلّہ اور کچھ سونا چاندی وغیرہ رکھ کر وزن کیا گیا اور یہ ساری چیزیں اور ایک بھینسا اور ایک گھوڑا اور دس روپے خیرات کیے گئے۔"[۹۲]

قطب صاحب میں پھول والوں کی سیر بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی تھی۔ بادشاہ اس پر اچھا خاصا روپیا صرف کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے سوچا کہ میلے میں آنے والے تمام لوگوں کی دعوت کی جائے لیکن جب اخراجات کا حساب لگایا گیا تو ان کو اپنی رائے بدلنی پڑی۔[93] حضرت کالے صاحب کو جو حویلی بادشاہ کی طرف سے نذر کی گئی تھی اس کی تیاری میں معقول رقم صرف ہوئی تھی۔[94]

اپنے اخراجات پر قابو پانا بادشاہ کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ وہ مزاجاً فراخ دل تھے اور دوسرا یہ کہ ان کی طبیعت میں رحم کا مادہ بھی تھا۔ چناں چہ روپے کی قلت کے باوجود وہ بعض اخراجات قرض لے کر پورے کرتے تھے۔ پیرزادے یعنی میاں کالے صاحب کے لڑکے کی شادی کے مصارف انھوں نے اسی طرح قرض لے کر برداشت کیے۔ مٹکاف اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے:

"پیرزادے میاں کالے صاحب کے لڑکے کی شادی کے مصارف کے لیے چار ہزار روپے سرکاری تمسک کے ذریعے ساہوکار سے دلوانے کا حکم ہوا۔ یہ تمسک شاہی دیہات کی آمدنی پر لکھا گیا۔"[95]

۱۲ مارچ ۱۸۴۹ء

بسا اوقات یہ اخراجات اتنے پے در پے آتے تھے کہ بادشاہ کو قرض دینے اور دلوانے والے بھی پریشان ہو جاتے تھے۔ احسن الاخبار میں ایک جگہ پیرزادے کالے صاحب کے لڑکے کی شادی کے ساتھ اور دوسرے اخراجات کا ذکر اس طرح موجود ہے:

"محبوب علی خواجہ سرا سے فرمایا کہ ہمیں فی الحال پیرزادہ میاں کالے صاحب کے صاحب زادے کی شادی کے لیے چار ہزار روپے کی اور مرشد زادہ مرزا سلطان حیدر بہادر کی شادی کے لیے دو ہزار روپے کی اور اپنی منہ بولی بیٹی کی شادی کے لیے نواب نخی بیگم صاحبہ کے پاس بھیجنے کے لیے ایک ہزار روپے کی ضرورت ہے اور اس روپے کا بہت جلد انتظام ہونا چاہیے۔"[96]

قرض

شاہی خزانے میں روپے کے نام پر پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ اس لیے بادشاہ کو بات بات

پر قرض لینا پڑتا تھا۔ یہ قرض کبھی سود پر لیا جاتا تھا، کبھی تمسک لکھ کر اور کبھی کوئی جاگیر رہن رکھ کر۔ احسن الاخبار میں ان قرضوں سے متعلق بے شمار اطلاعات درج ہیں جن میں سے چند کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے:

"کنور دیبی سنگھ سے ارشاد ہوا کہ جو دیہات متعلقہ سلطانی تمہارے پاس ہیں ان میں نصف حصے کو چھوڑ دو اور اپنے قرضے کے اسی ہزار کا تمسک اسٹامی کاغذ پر تحریر کر کے بقیہ نصف حصے کو اپنے قبضے میں لے لو........۔ دوسرے شقے میں تحریر فرمایا تھا کہ نو لاکھ روپے کی قرض داری ہے اس کی ادائیگی کے لیے صدر دفتر میں رپورٹ کی جائے۔"[97]

۱۲ رجون ۱۸۴۵ء

"لالا زور آور چند سے ارشاد ہوا اطمینانِ خاطر کے ساتھ اپنے مقررہ کام کو انجام دیتے جاؤ۔ انشاء اللہ تمہاری کوڑی کوڑی ادا کر دی جائے گی۔"[98]

۷ر اپریل ۱۸۴۶ء

"نواب میر حامد علی نے صاحب کلاں بہادر سے عرض کیا کہ میرے ایک لاکھ اور کئی ہزار روپے حضور والا کے ذمے نکلتے ہیں اگر ان میں سے کچھ روپیہ مجھے اس وقت مرحمت کر دیا جائے تو بڑا کرم ہوگا۔ صاحب کلاں بہادر نے کہا میں نے سرکار والا سے عرض کیا تھا لیکن اس وقت انتظام ممکن نہیں۔"[99]

۲۶ رجون ۱۸۴۶ء

تنگ دستی کا یہ عالم تھا کہ روزمرہ کے خرچ کی رقم بھی بادشاہ کے پاس نہ نکلتی اور اس کے لیے بھی محبوب علی خاں خواجہ سرا سے رجوع کیا جاتا:

"نواب زینت محل بیگم صاحبہ نے فرمایا کہ مجھے گھر کے روزمرہ خرچ کے لیے کچھ روپیہ ملنا چاہیے۔ محبوب علی خاں خواجہ سرا کو ارشاد ہوا کہ ایک ہزار روپے کا بندوبست کر کے بیگم صاحبہ کی خدمت میں بھیج دو۔"[100]

احسن الاخبار سے اس طرح کی بھی بہت سی خبریں ملتی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ قرض خواہوں کے حوصلے اتنے بڑھ گئے تھے کہ وہ برملا بادشاہ سے اپنی رقم کا مطالبہ کرتے تھے:

"محبوب علی خاں خواجہ سرا نے عرض کیا کہ میرے قرض کے روپے میں سے نہ تو اصل رقم ملتی ہے اور نہ سود ہی وصول ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں نواب معظم الدولہ بہادر کے نام خط لکھا گیا کہ موضع کارولہ تو پہلے محبوب علی خاں خواجہ سرا کو دیا جا چکا ہے موضع پھرالہ اور باریکپور بھی قرضے کے عوض میں محبوب علی خاں کو دے دیے جائیں۔"[101]

اگرچہ حالات یہاں تک پہنچ گئے تھے لیکن قرض لینے کا سلسلہ پھر بھی برابر جاری تھا:

"خزانہ دار شاہی کے نام حکم جاری ہوا کہ چار ہزار روپیا قرض مہیا کیا جائے۔ یہ روپیا بائیس روپے ماہ وار قسط کے حساب سے ادا کیا جائے گا۔"[102]

"حضور انور نے نواب حامد علی خاں کی معرفت اسی ہزار روپیا ساہوکاروں سے فی صدی ایک روپیا سود پر قرض لیا ہے اور ساہوکاروں کے اطمینان کے لیے تمسک تحریر فرما کر نواب حامد علی خاں کے حوالے کر دیا۔"[103]

بادشاہ کے قرض مانگنے سے لوگ اس قدر پریشان ہو گئے تھے کہ اپنی دولت مندی کا اظہار کرتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں بادشاہ قرض نہ مانگ لیں۔ احسن الاخبار کی ایک خبر سے اس صورت حال پر اس طرح روشنی پڑتی ہے:

"مسٹر ٹامس صاحب سفیر شاہی نے لندن سے ایک عریضہ بادشاہ سلامت کی خدمت میں بھیجا کہ معاملات متعلقہ ستمبر ۱۸۴۶ء کی ابتدائی تاریخوں میں ولایت میں پیش کیے جائیں گے مگر ان کے لیے کثیر اخراجات کی ضرورت ہے۔ روپیا بہت جلد روانہ فرما دیجیے۔ بادشاہ نے خواجہ سرا محبوب کو بلا کر حکم دیا کہ ہمارے موضعوں کو اپنے پاس رکھ کر دس ہزار روپے حاضر کرو تاکہ سفیرِ لندن کو روانہ کر دیے جائیں۔ محبوب خواجہ سرا نے خیال کیا ایسا نہ ہو میری دولت مندی کا حال بادشاہ پر کھل جائے اس لیے اس نے عرض کیا کہ میرے پاس روپیہ موجود نہیں ہے۔"[104]

غرض بادشاہ کا بال بال قرض میں بندھا ہوا تھا۔ قرض خواہوں کی فہرست طویل سے طویل تر ہوتی جاتی تھی اور حالات رفتہ رفتہ ایسے پیدا ہوتے جا رہے تھے کہ قرض، جس پر زندگی کا دار و مدار تھا، ملنا بند ہو جائے گا چناں چہ اس مالی بحران کو روکنے کی آخری صورت یہ سمجھ میں آئی کہ نذرانوں کے سلسلے کو فروغ دیا جائے۔

نذرانے اور عہدے

مغل دربار میں بادشاہ کے حضور میں حاضر ہونے کی ایک شرط یہ تھی کہ حسبِ حیثیت بادشاہ کی خدمت میں کچھ نذرانہ پیش کیا جائے۔ اکثر امرا بڑی بڑی رقمیں نذرانے کے طور پر پیش کر کے بادشاہ کے دربار میں شرفِ باریابی حاصل کرتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں نذرانوں کے اس رواج کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ دربار میں رسائی کے لیے اب محض خاندانی شرافت اور نجابت ہی معیار نہیں رہ گئی تھی بلکہ ہر وہ شخص جو بادشاہ کی خدمت میں کثیر رقم نذرانے کے طور پر پیش کر سکتا، حلقۂ امرا میں داخل ہونے کا اہل تھا۔ نذرانے مغل دربار میں رسائی کا ایک آسان ذریعہ ہی نہیں بن گئے تھے بلکہ لوگ نیلام کی بولی کی طرح بڑھ چڑھ کر نذرانے پیش کرتے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ اگرچہ قاعدہ یہ تھا کہ نذرانے کی رقم شاہی خزانے میں بطور ضمانت جمع رہتی تھی اور ملازمت کے بعد متعلقہ شخص یا اس کا وارث اس رقم کی واپسی کا مطالبہ بھی کر سکتا تھا لیکن یہاں عالم یہ تھا کہ جس طرح قرض دار روپیا قرض لیتے ہوئے اکثر یہ نہیں سوچتا کہ اس کی ادائیگی کی کیا صورت ہوگی، ٹھیک اسی طرح بادشاہ بھی نذرانوں کی بڑی بڑی رقمیں قبول کرتے ہوئے یہ نہیں سوچتے تھے کہ ان کی ادائیگی کیوں کر ہوگی۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی شخص نے نذرانے کے طور پر معقول رقم دے کر کوئی منصب حاصل کیا اور جب اس شخص کا انتقال ہو گیا تو نذرانے کی رقم واپس کرنے کے بجائے اس کے لڑکے یا کسی اور وارث کو اسی عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ احسن الاخبار کے صفحات میں اس قسم کے بہت سے واقعات مندرج ہیں[۵۰]۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ رکی ہوئی تنخواہ کے لیے بھی نذرانہ دینا پڑتا تھا:

"سوہن لال متصدی بخشی گری بادشاہی عتاب کی وجہ سے قلعے

میں آنے جانے سے محروم تھے۔ اب بادشاہ سلامت کی مہربانیوں کے پانی نے غصّے کی آگ کو بجھا دیا اور قلعے میں آمد و رفت کی اجازت دے دی۔ لالہ جی نے شہزادہ شاہ رخ بہادر سے اپنی تنخواہ کا تذکرہ کیا۔ جواب دیا گیا کہ اگر چار سو روپیہ نذرانہ دیا جائے تو تنخواہ جاری ہو سکتی ہے۔"[106]

سوہن لال منصدی سے چار سو روپے نذرانہ طلب کیا گیا تھا لیکن تین سو روپے پر ہی معاملہ طے ہو گیا۔[107] چھوٹے چھوٹے ملازمین بھی نذریں داخل کر کے ترقی پاتے تھے۔

"مقرب علی دفعدار نے ایک سو پچاس روپیہ، عاشور بیگ دفعدار نے تین سو روپیہ اور چھ سپاہیوں نے پچاس پچاس روپیہ بطور نذرانہ شاہ رخ بہادر کی خدمت میں پیش کیے۔ دفعداروں کو جمعداری اور سپاہیوں کو دفعداری کے منصب پر ترقی دی گئی۔"[108]

اگر بادشاہ کسی سے ناراض ہو جاتے تو نذرانہ غصّہ فرو کرنے کا کام بھی کرتا تھا:

"مرزا سلطان علی خاں، بخشی سواران ملازم سلطانی، سے کئی مہینے سے بادشاہ سلامت ناخوش تھے۔ اب انھوں نے دو ہزار روپیہ نذرانہ پیش کیا تو بادشاہ نے ان کے قصوروں کو معاف کر کے ایک جوڑا بیش قیمت دوشالے کا مرحمت فرمایا اور پھر بخشی گری کی خدمت پر متعین کر دیا۔"[109]

کبھی کبھی قرض خواہوں کو بھی اپنی ڈوبی ہوئی رقم وصول کرنے کے لیے بادشاہ کو نذر دینی پڑتی تھی تب جا کر کہیں وصول یابی کی کوئی صورت نکلتی تھی:

"سوہن لال بہادر، مختار سابق امور سلطنت، نے درخواست دی کہ میرا سولہ ہزار روپیہ جو حضور کے ذمّے واجب الادا ہے اگر مرحمت کر دیا جائے تو عین غریب پروری ہے۔ حکم ہوا کہ دس ہزار روپیہ نقد خزانے میں داخل کر دو اس کے بعد پانچ ہزار روپے ماہ وار کی قسط کر دی جائے گی۔"[110]

بعض لوگ کسی عہدے پر محض اس لیے فائز رہتے کہ بادشاہ ان کے مقروض ہوتے تھے چناں چہ ایسے حالات میں اُس عہدے کے لیے کوئی شخص نذرانے کے طور پر کتنی ہی کثیر رقم کیوں نہ

پیش کرے بادشاہ اسے قبول کرنے سے معذور رہتے تھے۔

"سانگ رام پسر لالہ رام جتمل متوفی کی عرضی نظر فیض انور سے گزری اس میں مذکور تھا کہ اگر مجھے آغا حیدر ناظر کی جگہ نظارت پر مقرر کر دیا جائے تو میں دس ہزار روپیہ نذرانہ پیش کروں گا۔ حکم ہوا کہ جب ہم آغا حیدر حسن ناظر کا تمام روپیہ، جو ہمارے ذمے ہے، ادا کر دیں گے تو اس کے بعد دیکھا جائے گا۔"[111]

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، نذر کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ بطور ضمانت شاہی خزانے میں جمع رہتی تھی اور جب کوئی شخص اپنی ملازمت سے سبک دوش ہوتا تھا تو وہ رقم جو اس نے بطور نذر شاہی خزانے میں داخل کی تھی، اسے واپس مل جاتی تھی لیکن بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں نذر کے سلسلے کو اس لیے فروغ حاصل ہوا تھا کہ بادشاہ کے پاس روپے کی کمی تھی چناں چہ وہ کسی نہ کسی عنوان اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے روپیا حاصل کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ بادشاہ کی مالی حالت اتنی ناگفتہ بہ تھی کہ وہ رہن رکھی ہوئی جاگیریں نہیں چھڑا سکتے تھے، قرض خواہوں کا منہ نہیں بند کر سکتے تھے، ایسی حالت میں بھلا نذریں واپس کرنا ان کے لیے کیسے ممکن تھا چناں چہ آغا حیدر ناظر، جن کے بادشاہ بہت مقروض تھے جب فوت ہوئے تو بادشاہ اس قابل نہیں تھے کہ ان کے وارث کو نذر کی رقم واپس کر سکتے، لہذا بادشاہ نے بجائے نذر واپس کرنے کے ان کے وارث سے مزید نذر کا مطالبہ اس طرح کیا:

"آغا حیدر ناظر کے داماد حسین مرزا کی عرضی کے جواب میں فرمایا کہ تمھیں عہدۂ نظارت سے اس وقت سرفراز کیا جا سکتا ہے جب کہ سات ہزار روپیہ نذرانہ پیش کرو اور مرحوم آغا حیدر کے نذرانے سے دست بردار ی لکھ دو۔"[112]

بسا اوقات صاحب حیثیت لوگوں کو اس بات پر مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ بھاری نذریں دے کر بڑے بڑے عہدے سنبھالیں۔ نواب حامد علی خاں کے متعلق ایک جگہ درج ہے:

"نواب حامد علی خاں سے ارشاد فرمایا کہ اگر دس ہزار روپیا نذرانے کا پیش کرو تو تمھیں مختاری کے عہدے پر سرفراز کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے

عرض کیا کہ اگر اس عہدے پر کسی دوسرے کو مقرر کیا جائے یا نذرانہ معاف کر دیا جائے تو اچھا ہے ورنہ حکم کی تعمیل میں نذرانہ پیش کرنے اور اس منصب پر سرفراز ہونے کا افتخار حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔"[۱۱۳]

بعد میں خدا جانے کیا حالات پیش آئے کہ نواب حامد علی خاں نے بجائے دس ہزار روپے کے پندرہ ہزار روپے نذرانہ دے کر بادشاہ کے حکم کی تعمیل کی اور مختاری کا عہدہ قبول کیا:

"نواب حامد علی خاں بہادر نے پندرہ ہزار روپے نذرانہ امور سلطنت کی مختاری کے لیے اور پانچ اشرفی بطور شکرانے کے بادشاہ سلامت کی خدمت میں اور ایک اشرفی مرزا شاہ رخ بہادر کی خدمت میں اور ایک اشرفی نواب ملکۂ دوراں کی خدمت میں پیش کر کے بادشاہ کی نظر میں امتیاز و اختصاص کا درجہ حاصل کیا۔"[۱۱۴]

ایسا بھی ہوتا کہ کسی شخص نے کوئی خاص رقم بطور نذر پیش کر کے کوئی عہدہ حاصل کیا۔ اس کے بعد کسی دوسرے شخص نے اسی منصب کے لیے اور زیادہ نذرانے کی پیش کش کر دی۔ اول الذکر کو جب اس بات کا پتا چلا تو اس نے دربار کے رنگ کو دیکھتے ہوئے اپنے منصب کے تحفظ کے لیے مزید نذر پیش کر دی۔ مولوی تیغ علی کے ساتھ، جو عہدۂ کمیدانی پر فائز تھے، ایک مرتبہ ایسا ہی واقعہ پیش آیا:

"گزارش کی کہ حضور والا جب عہدۂ کمیدانی کے لیے میرا تقرر ہوا تھا تو میں نے دو ہزار روپے بطور نذرانہ پیش کیے تھے۔ اب میں نے سنا ہے کہ کوئی شخص اس عہدے کے لیے چار ہزار روپے نذر دینے کے لیے تیار ہے۔ ایک ہزار اور نذرانہ عطا کرتا ہوں امید ہے کہ حضور قبول فرما کر مجھے میرے عہدے پر حسبِ دستور برقرار رکھیں گے۔ بادشاہ سلامت نے از راہِ مکرمت مولوی تیغ علی کی درخواست قبول فرمائی۔"[۱۱۵]

بادشاہ کی اس کم زوری سے لوگ اس قدر واقف ہو گئے تھے کہ وہ اس کے ذریعے بڑے بڑے منصوبے پورے کرنے کی جرأت کرنے لگے تھے۔ چناں چہ بادشاہ کے مشیرِ خاص

حکیم احسن اللہ خاں کے مقابلے میں بھی ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے بادشاہ کو نذر کا لالچ دینے کی کوشش کی:

"ایک گمنام عرضی حضور کے سامنے پیش ہوئی جس میں لکھا تھا کہ اگر حکیم احسن اللہ خاں کی جگہ مجھے مقرر کیا جائے تو میں مبلغ چار ہزار روپے نذرانہ پیش کروں گا۔ چوں کہ عرضی میں بھیجنے والے کا نام نہیں تھا اس لیے حضور نے ان ملازموں پر غصہ ظاہر فرمایا جن کے توسط سے یہ عرضی حضور تک پہنچی تھی۔"[116]

یہ عرضی گم نام تھی اس لیے اس بارے میں بادشاہ کا رویہ واضح طور پر سامنے نہیں آیا۔

مالی مشکلات اور بد نظمی

بہادر شاہ کی مالی حالت اس قدر ابتر تھی کہ ان کے لیے اپنے نام نہاد کاروبار سلطنت کو چلانا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا۔ بادشاہ پیسے پیسے کو محتاج رہتے تھے جس کی وجہ سے کبھی قرض لے کر کبھی جائداد رہن رکھ کر شاہی کاروبار چلانے کی کوشش کی جاتی۔ جب اس سے بھی کام نہ بنا تو نذرانوں کو وسیلہ بنایا گیا لیکن یہ ذرائع بھی شاہی اخراجات کی کفالت کے لیے ناکافی تھے۔ غرض نوبت یہ آگئی تھی کہ دربار کا نظام درہم برہم ہوتا جا رہا تھا۔ چھوٹے بڑے تمام ملازمین تنخواہوں کے لیے پریشان رہتے تھے۔ سلاطین کا جو وظیفہ بادشاہ کی معرفت آتا تھا وہ بھی شاہی اخراجات کی نذر ہونے لگا۔ معمولی کاموں کی اجرت دینا بھی بادشاہ کے بس سے باہر تھا۔ ایک مرتبہ بدر الدین مہرکن سے کچھ مہریں بنوائیں تو بادشاہ کو رزیڈنٹ کے نام شقہ جاری کرنا پڑا۔

"صاحب کلاں بہادر کے نام شقہ جاری فرمایا کہ بدر الدین مہرکن آپ کے پاس آتے ہیں۔ انھیں پرگنہ کوٹ قاسم کی آمدنی میں سے ایک ہزار روپیہ دے دیا جائے کیوں کہ ان سے مہریں بنوائی تھیں ان کی اجرت باقی ہے۔"[117]

روپے کی کمی کی وجہ سے ملازموں کی تنخواہ بھی وقت پر نہیں مل پاتی تھی:

"زور آور چند رائے بہادر گیندا مل اور دوسرے اہل کاروں نے شرف نیاز حاصل کر کے عرض کیا کہ ابھی تک تنخواہیں تقسیم نہیں ہوئیں،

کیوں کہ خزانے میں تین ہزار ایک سو روپے کی کمی ہے۔" ۱۱۸

ملازمین کی تنخواہوں میں تاخیر کا سلسلہ بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ مئی ۱۸۴۷ء کے دہلی اردو اخبار کی اس خبر سے اس کا پتا چلتا ہے:

"سنا گیا ہے کہ تنخواہ دار قلعۂ مبارک کے اکثر بہت نالاں اور پریشان اور سوگوار رہتے ہیں...... کہتے ہیں کہ کوئی مہینہ ایسا نہیں گزرتا کہ تنخواہ غریب ملازمین کو سہولت سے تقسیم ہووے۔" ۱۱۹

ان حالات کی بنا پر ملازمین کی نظر میں بادشاہ اور قلعے کی کچھ بھی وقعت باقی نہیں رہی تھی۔ تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے لوگ پریشان ہو کر ملازمت بھی چھوڑ جاتے تھے۔ مولوی محمد تقی خاں جو ولی عہد کی سرکار میں مختار کے فرائض انجام دینے پر مامور تھے، ایک ہی مہینے میں اپنی ملازمت سے دست بردار ہو گئے:

"مولوی محمد تقی خاں، جو ایک مہینے سے نذرانہ دے کر بیچ سرکار ولی عہد بہادر کے مختار ہوئے تھے، سو مشہور ہے کہ بہ سبب دیکھنے بد انتظامی اس سرکار کی قلت آمدنی اور کثرت مصارف اور ہجوم قرضہ کے جو زیادہ چالیس ہزار سے ہے از خود ترک کر بیٹھے۔" ۱۲۰

یہ خبر تو ولی عہد بہادر کی سرکار سے متعلق تھی، خود بادشاہ کی سرکار کا بھی یہی احوال تھا۔ "محبِ ہند" میں لکھا ہے:

"وزیر حضور والا کے ہاں کوئی ٹھہرتا نہیں اور چند مہینے کے بعد بدلا جاتا ہے۔" ۱۲۱

تنخواہ نہ ملنے کے سبب لوگ نالاں رہنے لگے تھے جس سے شاہی وقار کو سخت صدمہ پہنچا تھا۔ قلعے میں آئے دن شور واویلا مچی رہتی تھی ــــ ان ہنگاموں کو دیکھ کر قرض خواہوں کے حوصلے بھی بڑھتے جا رہے تھے۔ دہلی اردو اخبار لکھتا ہے:

"قرض خواہوں نے زیرِ جھروکہ آن کے واویلا کی، سو حامد علی خاں کو حکم ہوا کہ درستی ان کے قرضے کی کرو۔" ۱۲۲

سلاطین نے اپنی تنخواہ نہ ملنے پر الگ پریشان کرنا شروع کر دیا تھا:

"عرض ہوئی کہ قریب ساٹھ سلاطین کے جمع ہو کر باعث نہ وصول ہونے تنخواہ کے واویلا کر رہے ہیں"۔ ۱۲۳

اس ابتری کو دور کرنے کی بہت سی تدابیر میں سے ایک تدبیر یہ نکالی گئی کہ مختلف عنوانات کے تحت تنخواہوں میں تخفیف کی جانے لگی۔ چونکہ بادشاہ کی مالی حالت کسی سے چھپی نہیں تھی لہٰذا اس تخفیف کو بھی لوٹ کھسوٹ ہی کا ایک طریقہ سمجھا گیا۔ دہلی اردو اخبار میں اس سلسلے میں یہ خبر دیکھنے کو ملتی ہے:

"سنا جاتا ہے کہ تنخواہ کی بڑی واویلا ہو رہی ہے۔ چھے مہینے میں دو مہینے بڑی مشکل سے ملتے ہیں اور اس پر کٹوتی کا دم چھلا لگا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ مختار برائے نام ہے ایک حکیم کا محکمہ بہت گرم سنا جاتا ہے یا دو ایک بنیوں کی بن آئی ہے۔" ۱۲۴

ان حالات میں قلعے کے ملازمین نے چوری اور غبن پر کمر باندھ لی۔ قرض خواہ بھی شورہ پشت اور نڈر ہو گئے۔ شاہی وقار بالکل مٹی میں مل کر رہ گیا۔ نچلے طبقے کے غریب عوام کے سوا جن سے بادشاہ کچھ نہیں وصول کر سکتے تھے، کسی کی بھی نظر میں بادشاہ کی کوئی وقعت نہیں رہی۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ قرض خواہ شہزادوں کو راستے میں روک لیتے اور ان سے روپے کا مطالبہ کرتے:

"اس ہفتے میں عجیب معرکہ درپیش ہوا یعنی مرزا دارا بخت بہادر ولی عہد اور مرزا شاہ رخ وغیرہ شہزادے بہ تقریب زیارت قدم شریف میلہ بارہ وفات میں گئے۔ راستے میں نیل کے کٹڑے کے پاس قرض خواہوں نے مرزا شاہ رخ کو آگھیرا اور درپے ہوئے۔" ۱۲۵

ایسا ہی ایک واقعہ مرزا جواں بخت کے ساتھ پیش آیا جو اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے:

"محبوب علی خاں خواجہ سرا کو عریضہ پہنچا کر قدم شریف کے میلے سے مرزا جواں بخت بہادر تشریف لا رہے تھے تو چند بدمعاشوں نے انگریزی سپاہیوں

کی اعانت سے ان کو گھیر لیا۔ گھوڑا، ایک بٹوہ جس میں تین اشرفیاں تھیں اور
ایک چاندی کی ہیکل چھین کر لے گئے۔" ۱۲۶

ملازمین شاہی کے اس طرزِ عمل کی وجہ سے بادشاہ کی مالی مشکلات میں اور اضافہ ہو گیا۔ اس معاملے پر روشنی ڈالتے ہوئے احسن الاخبار کا نامہ نگار اطلاع دیتا ہے :

"شہر میں یہ خبر گشت لگا رہی ہے کہ بعض شاہی ملازمین نے غبن اور تغلب پر کمر باندھ لی ہے یہاں تک کہ سلاطین کی تنخواہ بھی وقت پر ایمان داری سے ادا نہیں کرتے اور اس میں بد دیانتی کرتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو بادشاہ سلامت قرض دار ہو گئے اور دوسری طرف لوگوں کو سخت شکایتیں پیدا ہو گئیں۔" ۱۲۷

ان بدعنوانیوں میں معمولی ملازمین ہی نہیں، شہزادے اور سلاطین بھی شامل تھے۔ مرزا فخرو کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے :

"حضرت مرشد زادۂ آفاق مرزا ولی عہد بہادر نے عرض کیا کہ شہزادہ مرزا غلام فخر الدین بہادر نے گنج میر خاں کو اپنے خسر، حسین بخش کے حوالے کر دیا ہے اور وہاں کے سامان کو نکال کر بیچ رہے ہیں؛ اس سے حضرت کے مال و اسباب کا سخت نقصان ہوتا ہے۔ ارشاد ہوا کہ ان کو منع کریں گے۔" ۱۲۸

سلاطین کے حوصلے بھی اتنے بڑھ گئے تھے کہ ایک مرتبہ بادشاہ کو ان کے ڈر سے ملازمین کی تنخواہ قطب صاحب میں تقسیم کرانی پڑی :

"حضور کو اطلاع دی گئی کہ بعض سلاطین کا ارادہ ہے جس وقت روپیہ خزانۂ شاہی میں آئے تو جبراً روپے پر قبضہ کر لیں۔ حضور نے یہ خبر سنی تو صاحب کلاں بہادر کے نام شقہ جاری فرمایا کہ روپیہ قلعے میں نہ بھیجا جائے بلکہ ہاتھی سواروں کا ایک دستہ خزانے کے ساتھ معین کر کے حضور قطب الاقطاب قدس سرہٗ کے مزار کے متصل جو حویلی ہے وہاں روانہ کر دیا جائے۔ تمام تنخواہ داروں کو روپیہ وہیں تقسیم کیا جائے گا۔" ۱۲۹

لوٹ کھسوٹ اور غبن کے ساتھ ساتھ بادشاہ کی جعلی مہریں تک بنالی گئی تھیں:

"مرزا مور بہادر نے جو مہرِ سلطانی کی جعل سازی کے جرم میں قید تھے، بادشاہ سلامت کی خدمت میں ایک عریضہ بھیجا کہ میں درِ درگردہ کی وجہ سے زندگی سے مایوس ہوں اگر از راہِ مرحمتِ خسروانہ مجھے قید سے نجات دی جائے تو شاید میری زندگی دوبارہ ہو جائے۔ حضور والا نے فرمان صادر فرمایا کہ اچھا تم جاؤ اپنے بال بچوں میں بود و باش اختیار کرو مگر تمھاری نگرانی کے لیے تمھارے مکان پر دو خواجہ سراؤں کو مقرر کیا جائے گا۔" ۱۳۰

اس ابتری کے دور میں لال قلعے میں دن رات جس بدامنی اور افراتفری کا عالم تھا اس کا اندازہ احسن الاخبار کی چند خبروں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

"۲۹ر جون ۴۶ ۱۹ء: خبر مشہور ہے کہ قلعے کے برج کا تانبے کا کلس جس پر سونے کا ملمع تھا۔ قلعے سے چوری ہوگیا۔" ۱۳۱

"۱۰ر جولائی ۱۸۴۶ء: اطلاع دی گئی کہ مرزا عباس شکوہ خورد سال کے سونے کے کڑے کسی نے سوتے میں نکال لیے ہیں۔ خواجہ سراؤں اور لونڈیوں کو حکم دیا گیا کہ تلاش کرکے کڑے حاضر کرو ورنہ کڑوں کی قیمت تمھاری تنخواہ سے وضع کر لی جائے گی۔" ۱۳۲

"۱۱ر جولائی ۱۸۴۶ء: دو لونڈیوں نے نواب زمانی بیگم صاحبہ، بنت مرزا غلام فخرالدین بہادر شاہ شہزادے، کے زیور چرا لیے تھے اس جرم کی سزا کے طور پر انھیں قلعے سے نکال دیا گیا۔" ۱۳۳

"۳ر ستمبر ۱۸۴۶ء: بادشاہ سلامت کو یہ خبر پہنچی کہ باورچی خانے سے چینی کے برتن چوری ہو گئے ہیں تو آپ نے داروغۂ خاصہ کو بلا کر حکم دیا کہ پہرہ داروں سے اس چوری کا سبب دریافت کیا جائے اور ان سے تاکید کر دی جائے کہ آئندہ اس قسم کا واقعہ سرزد نہ ہوا اور اگر ہوا تو تم سب نوکری سے برطرف کر دیے جاؤ گے۔" ۱۳۴

عیش و عشرت

بہادر شاہ ظفر کیسے بھی بادشاہ سہی لیکن بادشاہوں جیسی رنگین طبیعت انھوں نے بھی پائی تھی۔ اگرچہ ان کے پاس نہ روپے کی فراوانی تھی اور نہ وہ شان و شوکت لیکن اپنے پیش رووں کی طرح عیش و عشرت کے دلدادہ بھی تھے۔ انھوں نے شراب نوشی تو نہیں کی لیکن عیش کوشی کے بعض اور سامان انھیں بھی میسر رہے۔ پینسٹھ برس کی عمر میں انھوں نے زینت محل بیگم سے شادی کی، اکھتر برس کی عمر میں شاہ آبادی بیگم سے نکاح کیا اور بہتر برس کی عمر میں ایک مطربہ زہرہ پیکر پر فریفتہ ہو گئے اور اس سے بھی نکاح کر لیا اور اسے اختر محل کے خطاب سے نوازا۔ بہادر شاہ طوائفوں کا ناچ بڑے شوق سے دیکھتے تھے۔ احسن الاخبار میں ایک جگہ لکھا ہے:

> "مرزا غلام فخر الدین بہادر شاہزادے نے اپنے بچّے کے دودھ چھٹنے کی خوشی میں رنڈیوں کے چار طائفوں کا ناچ کرایا تھا حضور انور اس محفل میں شریک ہو کر بہت محظوظ ہوئے۔" ۱۳۵

بہادر شاہ ظفر، زینت محل بیگم پر اس قدر فریفتہ تھے کہ اس معاملے میں انھیں اپنے شاہانہ وقار کا بھی کچھ پاس نہ رہتا تھا۔ زینت محل بیگم کے لیے انھوں نے دہلی کے بازار لال کنواں میں ایک حویلی تعمیر کرائی تھی۔ دہلی کا شہنشاہ اکثر کئی کئی دن قلعے سے باہر اس حویلی میں پڑا رہتا تھا۔ خلاصہ اخبار لکھتا ہے:

> "افواہ گرم ہے کہ بادشاہ قلعے سے باہر بارہ روز تک دن رات نواب زینت محل بیگم کی حویلی میں پڑے رہے جو اندرونِ شہر لال کنواں میں واقع ہے۔ بیگم موصوف نے حضور کی دعوت پر اور انھیں اپنے ہاں رکھنے پر ایک ہزار روپیہ یومیہ خرچ کیا ہے۔ سبحان اللہ، کیا بات ہے یعنی جس کسی کو بھی بادشاہ کو اپنے گھر طلب کرنا منظور ہو ہزار روپیا یومیہ خرچ کرے۔ بیگم موصوفہ کی حویلی کے خاکروب نے تھانے میں رپٹ درج کرائی ہے کہ بارہ روز سے شاہ دہلی کا قیام بیگم زینت محل کی حویلی میں ہے۔ کسی ظریف نے کیا خوب کہا ہے کہ وہ مراتب شاہی کی پروا نہ کرتے ہوئے رعایا کی طرح

رہتے ہیں۔"[۱۳۶] ۲۰ اپریل ۱۸۴۹ء

(فارسی سے ترجمہ)

جیسا کہ خبر کے انداز سے ظاہر ہے یہ محض خبر ہی نہیں بلکہ اس میں بادشاہ کے طرز زندگی پر ایک کڑی تنقید بھی کی گئی ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ بادشاہ کی اس بے عنوانی کی شکایت تھانے میں ایک خاکروب نے جا کر کی اور اس پر کسی ظریف نے یہ فقرہ بھی جڑ دیا کہ 'مراتب شاہی نہ داشتند وبطور رعایا شدند'۔

ولی عہد کا انتقال

۱۱ جنوری ۱۸۴۹ء[۱۳۷] کو بہادر شاہ ظفر کے فرزند اکبر مرزا دارا بخت کا انتقال ہو گیا۔ چوں کہ مرزا دارا بخت ولی عہد سلطنت بھی تھے اس لیے ان کی موت نے جہاں بادشاہ کو صدمہ پہنچایا وہیں ان کے لیے ایک بڑا مسئلہ بھی کھڑا کر دیا۔ بادشاہ کی چہیتی بیگم زینت محل اپنے بیٹے جواں بخت کی ولی عہدی کا خواب دیکھنے لگیں جب کہ انگریزوں کی خواہش کچھ اور ہی تھی۔

ظفر کی بیماری

بہادر شاہ ظفر نے طویل عمر پائی تھی۔ باسٹھ سال کی عمر میں وہ تخت نشین ہوئے۔ چوں کہ وہ عمر طبیعی کو پہنچ چکے تھے اس لیے انگریزوں کو بے چینی کے ساتھ ان کی موت کا انتظار تھا۔ انگریز بہادر شاہ ظفر کی آنکھ بند ہوتے ہی اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنا دینا چاہتے تھے۔ جب ان کی عمر لگ بھگ اٹھتر سال تھی تو وہ کسی موذی مرض کا شکار ہو گئے۔ اسپیر نے بادشاہ کی بیماری کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

> "بہادر شاہ ظفر کو ایسی کوئی بیماری نہیں ہوئی جس کا شکار عام طور پر مغل شہنشاہ کثرت شراب نوشی کے سبب ہوا کرتے تھے۔ شراب نوشی کے سوا بہادر شاہ ظفر نے مغل شہنشاہوں کے تمام شوق پورے کیے۔ ۱۸۵۳ء میں ان پر آنتوں کی بیماری کا حملہ ہوا اور ابھی وہ اس سے پوری طرح شفایاب بھی نہیں ہوئے تھے کہ کثرت عیاشی نے انھیں موت کے منہ پر لا کھڑا کیا۔ آم کا شوق شمالی ہند کے باشندوں کی ایک عام کمزوری ہے۔ بادشاہ بھی اس کمزوری کا شکار

تھے۔ بادشاہ پر جب آنتوں کی بیماری کا پہلا حملہ ہوا تو اس کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے آم اور سرخ مرچ کا ایک مرکب کھایا تھا اس کے بعد جب دہلی کے ریذیڈنٹ نے انھیں اور آم بھیجے تو انھوں نے وہ آم بھی کھا لیے۔" ۱۴۸ (انگریزی سے ترجمہ)

اسپیر کے قول کے مطابق بادشاہ کو یہ جان لیوا مرض ۱۸۵۵ء میں لاحق ہوا۔ اس وقت ولی عہد دارا بخت کا انتقال ہوئے چار برس ہو چکے تھے اور انگریزوں اور بادشاہ کے درمیان ولی عہدی کا جھگڑا شباب پر تھا۔ انگریز بادشاہ کی مرضی کے خلاف مرزا فخرو کو قلعہ خالی کر دینے کی شرط پر ولی عہد تسلیم کر چکے تھے اور اب انگریزوں کو اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لیے بادشاہ کی موت کا بے چینی سے انتظار تھا۔ سی۔ ایف۔ اینڈر یوس نے اس ضمن میں ایک واقعہ نقل کیا ہے جو ہو سکتا ہے اس بیماری سے متعلق ہو جس کا ذکر اسپیر کے حوالے سے اوپر کیا جا چکا ہے۔ اینڈر یوس لکھتا ہے:

"ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ شہنشاہ بہادر شاہ ظفر بیمار ہو گئے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس بیماری سے جاں بر نہ ہو سکیں گے۔ برطانوی ایڈمنسٹریٹر نے صرف اس خیال سے کہ کہیں شہنشاہ کا انتقال ہوتے ہی حصولِ تخت کے لیے شہزادوں میں باہمی تنازعات نہ شروع ہو جائیں قلعے کے دروازوں پر سپاہیوں کی ایک پلٹن بٹھا دی جنھیں یہ احکام دیے گئے تھے کہ وہ ایک قدم آگے نہ بڑھیں اور نہ کسی طرح سے مداخلت ہی کریں۔ قلعے کے ملازموں نے بوڑھے بیمار بادشاہ کو اس واقعے کی اطلاع دی۔ جب انھوں نے یہ خبر سنی تو برطانوی کمشنر کے نام جو شہر کے باہر رہا کرتا تھا یہ پر وقار درخواست لکھ بھیجی:

'جناب عالی کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ میری لاش انگریزوں سے جنگ کرے گی۔ کیا مجھے اطمینان و سکون کے ساتھ مرنے کی بھی اجازت نہیں ہے'۔ جب کمشنر موصوف کو یہ پیغام ملا اس نے معذرت کے ساتھ سپاہیوں کی پلٹن کو فوراً واپس بلا لیا اور بوڑھا شہنشاہ تن تنہا چھوڑ دیا گیا۔" ۱۴۹

بہادر شاہ ظفر کی اس بیماری پر، جو اپنی عمرِ طبیعی کو پہنچ چکے تھے، انگریزوں کا یہ ردِّ عمل افسوس ناک سہی لیکن غیر متوقع نہیں تھا۔ انگریز، بہادر شاہ ظفر کے جیتے جی انھیں اپنے راستے سے نہیں ہٹا سکتے تھے۔ ظفر کو جان سے مار دینے یا مروا دینے کو بھی وہ خلافِ مصلحت سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک جب ظفر اپنی ضعیف العمری کے باعث خود ہی موت کے دہانے پر کھڑے تھے تو ان کے خون کا الزام اپنے سر لینے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ چناں چہ اس عمر میں ظفر کے کسی جان لیوا مرض میں مبتلا ہو جانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ متوقع گھڑی آن پہنچی ہے جس کا انگریزوں کو بے چینی سے انتظار تھا اور یہی ان کے اس ردِّ عمل کا جواز تھا۔

جواں بخت کی شادی

شہزادہ جواں بخت، بہادر شاہ ظفر کی سب سے چہیتی بیگم، نواب زینت محل بیگم کے بطن سے تھا، نواب زینت محل اور بہادر شاہ ظفر دونوں ہی اسے بہت چاہتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر نے ۱۸۴۰ء میں زینت محل سے شادی کی تھی[۴۰] اور غالباً اس شادی کے ایک ہی سال بعد یعنی ۱۸۴۱ء کے آس پاس جواں بخت کی ولادت ہوئی۔ سانڈرس نے، گورنمنٹ آف انڈیا کے نام اپنے ایک خط میں، جو دسمبر ۱۸۵۸ء میں لکھا گیا تھا جواں بخت کی عمر سترہ سال بتائی ہے۔[۴۱] اس اعتبار سے جواں بخت کا سالِ پیدائش ۱۸۴۱ء ہونا چاہیے۔ جواں بخت کی شادی پر غالب اور ذوق، دونوں نے سہرے کہے تھے۔ جس کا ایک مطلب یہ ہوا کہ جواں بخت کی شادی ذوق کی زندگی ہی میں ہو گئی۔ ولی عہدی کے جھگڑے سے متعلق نیشنل آرکائوز میں جو دستاویزیں موجود ہیں ان میں گورنر جنرل کے نام بادشاہ کے ایک خط کا ذکر ہے، جو جولائی ۱۸۵۲ء میں لکھا گیا تھا۔ اس خط میں درخواست کی گئی ہے کہ جواں بخت کی شادی کے لیے جو قرض لیا گیا تھا، سرکار اس کی ادائیگی کا بندوبست کر دے[۴۲]۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جواں بخت کی شادی جولائی ۱۸۵۲ء سے پہلے ہو چکی تھی۔ اس طرح بہ ظاہر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جواں بخت کی شادی ۱۸۵۲ء کے اوائل میں ہوئی ہوگی جب کہ اس کی عمر صرف گیارہ سال تھی۔ جواں بخت کی شادی میں اس درجہ عجلت کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ ان کی عمر اس وقت اسّی برس کے قریب پہنچ چکی تھی اور کچھ ہی دن پہلے وہ ایک

موذی مرض میں مبتلا ہوکر مرتے مرتے بچے تھے۔ جواں بخت کی اس کم سنی کی شادی کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زینت محل بیگم نے یہ سوچا ہو کہ ان کے بیٹے کی شادی جس شان و شوکت کے ساتھ بادشاہ کی زندگی میں ہو سکتی ہے ایسی بعد میں ممکن نہیں۔ جواں بخت کی شادی شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ ہوئی اور بادشاہ نے اس میں کافی روپیہ خرچ کیا۔ ظہیر دہلوی اس شادی کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تقریب شادی کتخدائی مرزا جواں بخت

ہر چند کہ تقریبات بسیار ریاست ہائے ہندوستان میں نظر سے گزریں۔ مگر جیسی شادی بازیب و تجمل مرزا جواں بخت بہادر مرحوم کی ہوئی ایسی رنگین محفل تقریبِ دل فریب با جاہ و حشم اس دریا دلی کے ساتھ کہیں نظر سے نہیں گزری بیانِ تکلفاتِ رسوم ساچق، مہندی و برات و آرائشِ شہر و روشنی نقار خانہ جات وغیرہ فضول جان کر قلم انداز کیا جاتا ہے۔ البتہ دو امر قابلِ نگارش ہیں۔ ایک یہ کہ قرینۂ محفل سب سے جداگانہ تھا۔ دیوان کی بارہ دری میں جدا جدا محفلیں ترتیب دی گئی تھیں۔ ہر در میں ایک طائفہ جدا رقص کرتا تھا۔ شاہزادگان کی محفل جدا تھی، ملازمینِ معززین کی انجمن جدا، فرقۂ سپاہ کی بزم جدا تھی، شاگرد پیشہ کے لیے جدا، اس طرح ہر فریق کی محفل جدا تھی۔ اہلِ شہر کے لیے حکم عام تھا کہ آئیں اور تماشے، رقص و سرود سے محظوظ ہوں۔ رقاصانِ پری پیکر ہر طرف سرگرم ناز و ادا تھیں و مہ جبینانِ ناہید نوا زمزمہ پرداز۔ دس بارہ روز تک یہ محفلیں گرم رہیں۔ کل ملازمینِ شاہی اور رؤسائے شہر کے واسطے تورہ جات کا حکم تھا۔ جس کا جی چاہے زرِ نقد پچاس روپیہ تورے کی قیمت لے خواہ تورہ لے۔ جتنے قلم کے نوکر تھے نام بنام سب کو تورے تقسیم کیے جاتے تھے۔ مثلاً میرے والد کا تورہ جدا، میرے نام جدا، میرے چھوٹے بھائی کے نام جدا، وہ بھی نوکر تھا۔ میری والدہ کے نام جدا، کیوں کہ ایک تنخواہ ان کے نام کی بھی تھی۔ میں نے مہتمانِ تورہ بندی سے کہلا

بھیجا کہ آٹھ روز کے بعد ایک تورہ بھجوا دیا کرو۔ اس دربار دلی سے تقسیم تورہ جات کی ہوئی تھی۔ جس روز تورہ آتا تھا تمام عزیز و اقارب و دوست احباب کے گھر کھانا تقسیم ہوا کرتا تھا۔ ایک تورے میں طعام اس قدر ہوا کرتا تھا کہ ایک محفل شکم سیر ہو کر کھالے۔ میرے مکان کا تمام دالان بھر جاتا تھا۔ ایک ایک طباق میں پانچ پانچ سیر کھانا ہوتا تھا۔ چار چار پانچ پانچ طرح کے پلاؤ، رنگ برنگ کے میٹھے چاول، سرخ، سبز، زرد، اودے، پانچ سیری باقر خانی، ایک شیریں ایک نمکین اور کئی قسم کے نان غرض کہ اقسام خوردنی سے کوئی شے باقی نہ رکھی گئی تھی۔ مختصر یہ کہ کسی ریاست میں ایسی پر تکلف کوئی تقریب نظر سے نہیں گزری جو اس گئی گزری سلطنت میں دیکھنے میں آئی۔ اس کے علاوہ جن شعرا نے قصائد تہنیت اور سہرے وغیرہ لکھے تھے باوجودیکہ ملازم تھے مگر سب کو صلے و خلعت و انعام عطا ہوئے۔ شاگرد پیشہ کو جوڑے تقسیم ہوئے۔" ۱۴۴

بیگمات

قلعے کے رواج کے مطابق شاہزادوں کی شادیاں کم عمری ہی میں کر دی جاتی تھیں۔ خود بہادر شاہ نے اپنے لڑکے جواں بخت کی شادی کم عمری ہی میں کر دی تھی۔ اسی طرح بہادر شاہ ظفر کی شادی کا سلسلہ بھی لڑکپن ہی کی عمر سے شروع ہو گیا تھا یہاں تک کہ اپنے تخت نشین ہونے سے پہلے ہی وہ پوتوں پوتیوں والے بن چکے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کی بیگمات کی صحیح تعداد کا پتا نہیں چلتا۔ مختلف ذرائع سے جو چند نام سامنے آتے ہیں، ان میں شرافت محل بیگم، زینت محل بیگم، تاج محل بیگم، شاہ آبادی بیگم، اختر محل بیگم اور سردار محل بیگم کے نام ہیں۔ ان میں سے شرافت محل بیگم مرزا مغل کی اور زینت محل بیگم مرزا جواں بخت کی والدہ تھیں۔ باقی کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلتا کہ کون کون سے شاہزادے کن کن بیویوں کے بطن سے تھے۔ یہاں اجمالی طور پر ان بیگمات کا تذکرہ کیا جاتا ہے جن کے نام اوپر بیان کیے گئے ہیں۔

شرافت محل بیگم: یہ مرزا مغل کی والدہ تھیں۔ ان کا ذکر عرش تیموری نے مرزا قمقام الدین مصنف مظفر نامہ کے حوالے سے کیا ہے۔ جس وقت میجر ہڈسن مرزا مغل، مرزا خضر سلطان

اور مرزا ابوبکر کو ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار کر کے شہر لا رہا تھا تو مرزا مغل کا خواص حسین مرزا رتھ ہنکار رہا تھا۔ شہزادوں کا قتل اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس وقت کے تاثرات حسین مرزا کے الفاظ میں عرش تیموری نے اس طرح بیان کیے ہیں :

"جب فوج آگے بڑھ گئی تو میں رتھ سے اترا۔ تینوں لاشوں کو ٹٹولا مرزا مغل کے بازو پر ایک پٹکا بندھا ہوا تھا وہ میں کھول لایا۔ کچھ عرصے کے بعد مرزا مغل کی والدہ شرافت محل صاحبہ کی خدمت میں پیش کیا مگر انھوں نے نہ لیا اور دیکھ کر پھیر دیا۔" ۱۴۴

زینت محل بیگم : دہلی اردو اخبار کی خبر سے پتا چلتا ہے کہ ان کا اصل نام شاید کچھ اور تھا جو معلوم نہیں۔ زینت محل کا خطاب انھیں بہادر شاہ کی طرف سے ان کے نکاح میں آنے کے بعد ملا تھا۔ یہ شادی ۱۸۴۰ء میں ہوئی تھی۔ بہادر شاہ ظفر کی عمر اس وقت پینسٹھ سال اور زینت محل کی انیس سال تھی۔ ۱۴۵ (الف) دہلی اردو اخبار لکھتا ہے :

"حضور انور نے نواب احمد قلی خاں کی صاحب زادی کو ساتھ خطاب زینت محل کے ممتاز کیا اور پانچ سو روپے تنخواہ بیگم صاحبہ موصوفہ کی اور پانچ سو روپے تنخواہ ان کے لواحقین کی مقرر کی۔ سات لاکھ روپے کا مہر بندھا۔" ۱۴۵ (ب)

زینت محل بیگم، بادشاہ کی سب سے چہیتی بیگم تھیں۔ بادشاہ ان کی بات بہت مانتے تھے۔

تاج محل بیگم : یہ بھی بادشاہ کی محبوب بیوی تھیں۔ ان کا ذکر احسن الاخبار میں اس طرح آیا ہے :

"نواب تاج محل بیگم صاحبہ کو آثارِ حمل ظاہر ہوئے اس لیے میاں کالے صاحب پیرزادہ حفاظت کا تعویذ دینے کی غرض سے قلعۂ معلآ میں تشریف لے گئے۔" ۱۴۶

تاج محل بیگم کی حویلی مالی واڑے میں تھی۔ یہ بادشاہ کی جلاوطنی کے زمانے میں ان کے ساتھ الٰہ آباد تک گئی تھیں۔

شاہ آبادی بیگم : ان کا اصل نام بندی بائی تھا۔ دسمبر ۱۸۴۷ء میں بہادر شاہ نے ان سے نکاح کیا اور شاہ آبادی بیگم کے خطاب سے نوازا۔ ۱۴۷

اختر محل بیگم : یہ ایک مطربہ تھیں اور ان کا اصل نام مان بائی تھا۔ احسن الاخبار لکھتا ہے :

"حضرت عالی نے حکم نافذ کیا کہ مان بائی منکوحہ جدید کے واسطے خطاب اختر محل کی ایک مہر تیار کی جائے۔" ۱۴۸

مان بائی سے بہادر شاہ ظفر نے ۱۸۴۷ء میں راکھی سلونوں کی تقریب کے موقعے پر نکاح کیا تھا جس کی تفصیل احسن الاخبار نے اس طرح بیان کی ہے:

"حضور انور نے راکھی سلونوں کی تقریب میں راجا بھولا ناتھ کو پچاس روپے اور تخت خاص کے سواروں کو ایک اشرفی مرحمت فرمائی۔ اس عیش و عشرت کے وقت حضور انور نے ایک مطربۂ زہرہ پیکر ماہ طلعت کو شرفِ مناکحت بخشا اور امتیاز و اعتبار کا رتبہ عطا فرمایا۔ اختر محل خطاب دیا، دوسو روپیہ ماہوار مقرر فرمایا ایک خواجہ سرا و خدمت گار ڈیوڑھی پر مقرر کیے اور اعلیٰ اعلیٰ قسم کے بہت سے زیور عطا کیے۔" ۱۴۹

سرداری محل بیگم: ان کا اصل نام نہیں معلوم اور نہ یہ معلوم ہے کہ ان کا تعلق کس مذہب سے تھا۔ ناصر نذیر فراق نے ان کے بارے میں جو روایت نقل کی ہے وہ یہ ہے کہ زنانہ بھنڈا خانے کی داروغہ کے پاس ایک غریب عورت ملازم تھی جو کوئلوں کا تھیلا اور تمباکو کا ڈبہ داروغہ کے ساتھ لیے پھرتی تھی۔ جس مقام پر بادشاہ تشریف رکھتے یہ عورت کسی آڑ کی جگہ میں بیٹھ کر چقماق کی مدد سے کوئلے روشن کرتی اور چلم تیار کر کے داروغہ کو دے دیتی اور داروغہ چلم رکھ کر بادشاہ کے روبرو بھنڈا سجاتیں۔ ایک دن بادشاہ ہوادار میں بیٹھ کر لال قلعے کے باغ کی سیر کو گئے، پھر بارہ دری میں آ بیٹھے۔ شام ہو چکی تھی بادشاہ نے یہیں مغرب کی نماز پڑھی اور بھنڈا طلب کیا۔ داروغہ نے ادھر اُدھر دیکھا تو تھیلے والی غائب تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ نمودار ہوئی تو داروغہ نے پوچھا، کلموہی کہاں غارت ہو گئی تھی تھیلے والی نے کہا، میں آپ کو باغ میں ڈھونڈتی پھر رہی تھی کہ اچانک گولر کے درخت کے جھنڈ پر میری نظر پڑی تو پیڑ کی پھننگ پر چکی کے پاٹ کے برابر ایک چیز گول انگارے کی طرح دہک رہی تھی اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں چکا چوند آ گئی اور میں سر پر پیر رکھ کر بھاگی تو یہاں آ کر دم لیا۔ اس کے جواب میں جو کچھ داروغہ نے تھیلے والی سے کہا اسے فراق نے راوی کے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے:

"اصرار کیا تھا آج دوالی کی رات ہے۔ گولر کا پھول اسی رات کو کھلا کرتا ہے جس مرد کو دکھائی دے جاتا ہے وہ راجا ہو جاتا ہے یا بادشاہ اور جو عورت اسے دیکھ لیتی ہے وہ رانی یا بادشاہ کی جورو بنتی ہے۔ اب تیرے نصیب جاگے تو نے گولر کا پھول دیکھا۔ جہاں پناہ کے محل میں داخل ہو گی۔ سرداری محل خطاب پائے گی۔ موئی جھوٹی لپاٹن .... خیر گولر کا پھول اصل رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو چند ہی روز میں وہ جہاں پناہ کی منظور نظر ٹھہری اور بیگم بن گئی۔ سچ ہے جسے پیا چاہے وہی سہاگن ہے۔"[۵۷]

اولاد و اخلاف

عرش تیموری نے بہادر شاہ ظفر کی اولاد یعنی ان کے بیٹوں اور بیٹیوں کی جو تفصیل بیان کی ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ ان کے سولہ لڑکے اور اکتیس لڑکیاں تھیں۔

بیٹے: ظفر کے سولہ بیٹوں کے نام اس طرح بتائے گئے ہیں:

۱۔ مرزا دارا بخت بہادر میراں شاہ ولی عہد اول
۲۔ مرزا محمد شاہ رخ بہادر، وزیر اعظم و مختار عام
۳۔ مرزا کیومرث بہادر (ولی عہد دوم بقول مرزا غیاث الدین مصنف باغ شاداب)
۴۔ مرزا سلطان فتح الملک بہادر (ولی عہد سوم)
۵۔ مرزا قویش بہادر (جو زمانۂ غدر میں ولی عہدی کے مستحق تھے)
۶۔ مرزا ظہیر الدین عرف مرزا مغل بہادر
۷۔ مرزا فرخندہ بخش بہادر
۸۔ مرزا خضر سلطان بہادر
۹۔ مرزا بختاور شاہ بہادر
۱۰۔ مرزا سہراب ہندی
۱۱۔ مرزا ابو النصر
۱۲۔ مرزا محمد ی بہادر

۱۳۔ مرزا عبداللہ بہادر

۱۴۔ مرزا کوچک سلطان بہادر

۱۵۔ مرزا شاہ عباس بہادر

۱۶۔ مرزا جواں بخت بہادر۔" [151]

ان سولہ لڑکوں میں سے، جن کا ذکر عرش تیموری نے کیا ہے، مرزا دارا بخت بہادر ولی عہد اوّل کا انتقال[152] ۱۸۴۹ء میں ہو چکا تھا۔ مرزا شاہ رُخ بہادر، جو وزیر اعظم اور مختار عام کے فرائض انجام دے رہے تھے، دارا بخت کے انتقال سے دو سال پہلے ہی ۱۸۴۷ء میں[153] فوت ہو چکے تھے۔ مرزا کیومرث بہادر بھی، جنھیں عرش تیموری نے ولی عہد دوم لکھا ہے۔ اور مرزا فخرو سے بڑا بتایا ہے، ۱۸۵۷ء سے قبل ہی کسی زمانے میں وفات پا چکے تھے۔[154] مرزا فخرو کا انتقال جولائی ۱۸۵۶ء میں ہیضے کی بیماری میں ہو گیا تھا۔[155] غرض، ۱۸۵۷ء سے پہلے یہ چار شہزادے فوت ہو چکے تھے گویا سولہ شہزادوں میں سے صرف بارہ شاہزادے ۱۸۵۷ء تک زندہ تھے۔ لیکن فریزر نے ہارن بل کے نام اپنے ایک خط میں، جو اس نے ۱۲ر جنوری ۱۸۵۷ء کو لکھا ہے، شہزادوں کی تعداد گیارہ بتائی ہے۔ ان کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ سات شہزادے تو قلعے میں رہتے ہیں اور چار قلعے سے باہر رہتے ہیں۔[156] عرش تیموری نے شہزادوں کے جو سولہ نام لکھے ہیں ان میں صرف دو نام ایسے ہیں جن کا ذکر کہیں اور نہیں ملتا۔ ایک تو مرزا کیومرث بہادر جنھیں ولی عہد دوم بتایا گیا ہے اور دوسرے مرزا محمدی بہادر، مرزا کیومرث کے بارے میں عرش تیموری نے مرزا غیاث الدین کا حوالہ دیا ہے لیکن مرزا محمدی کے بارے میں کوئی تفصیل درج نہیں کی۔ اس مقالے میں بھی مرزا محمدی کے علاوہ ہر شہزادے کا ذکر کہیں نہ کہیں ضرور آ گیا ہے۔

مرزا فخرو کے انتقال کے بعد جب ولی عہدی کا جھگڑا دوبارہ شروع ہوا تو بہادر شاہ نے ٹمسن فریزر کے نام ایک خط جواں بخت کی حمایت میں روانہ کیا تھا، جس پر نو شہزادوں کے دستخط تھے۔ مرزا قویش اور مرزا جواں بخت تو اس جھگڑے میں فریقین تھے۔ لہٰذا ان کو ملا کر شہزادوں کی تعداد گیارہ ہو جاتی ہے جن شہزادوں نے اس خط پر دستخط کیے تھے ان کے نام حسب ذیل ہیں:

مرزا محمد سلطان، مرزا ابوالحسن، مرزا ابو لنصر، مرزا ابو طاہر، سلطان سہراب، مرزا خضر سلطان، بختاور شاہ، مرزا کوچک سلطان، مرزا شاہ عباس

ایک اہم نام اس فہرست سے یقیناً خارج ہے اور یہ نام مرزا ظہیر الدین عرف مرزا مغل بہادر کا ہے۔ کیوں کہ مرزا قویش کے بعد یہی سب سے بڑے تھے، اس لیے ہو سکتا ہے کہ یہ خود ہی ولی عہد بننا چاہتے ہوں اور اس لیے انھوں نے اس خط پر دستخط نہ کیے ہوں جو جواں بخت کی حمایت میں بھیجا گیا تھا۔ مرزا مغل کو شامل کر لینے کے بعد شہزادوں کی تعداد بارہ ہو جاتی ہے یعنی نو شہزادے تو وہ جنھوں نے جواں بخت کی حمایت میں دستخط کیے، ایک مرزا مغل جو غیر جانب دار رہے اور دو فریقین یعنی مرزا قویش اور مرزا جواں بخت۔ اس طرح عرش تیموری کا بیان صحیح ثابت ہو جاتا ہے۔ عرش تیموری کے نقل کردہ تین نام ایسے ہیں جن کی تین ایسے ناموں کے ساتھ کوئی مماثلت نہیں، جو اس خط میں ملتے ہیں جو جواں بخت کی حمایت میں لکھا گیا تھا۔ یہ چھے نام اس طرح ہیں:

(الف) مرزا فرخندہ شاہ بہادر، مرزا محمدی بہادر، مرزا عبداللہ بہادر[۵۷]

(ب) مرزا سلطان، مرزا محمد ابوالحسن، مرزا ابو طاہر[۵۸]

لیکن یہ بات پھر بھی وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ مرزا مغل کا نام ان چھے ناموں میں سے کوئی سا بھی نہیں ہے۔ اوپر کے پہلے تین ناموں میں مرزا فرخندہ شاہ اور مرزا عبداللہ بہادر کا نام جانا پہچانا ہے اور ان ناموں کا ذکر بار بار آ چکا ہے۔ بعد کے تین ناموں میں سے صرف ایک نام مرزا محمد ابوالحسن کا مانوس نظر آتا ہے۔ گویا امکان اسی بات کا ہے کہ یہ چھے نہیں بلکہ تین ہی نام ہیں لیکن چوں کہ ایک ایک آدمی کے دو دو نام بھی ہوتے تھے اس لیے مختلف ناموں کے استعمال سے یہ الجھن پیدا ہو گئی۔ مثلاً مرزا فتح الملک کا نام مرزا فخرو بھی تھا اور غلام فخر الدین بھی تھا۔ گویا مرزا فخرو تین مختلف ناموں سے پکارے جاتے تھے۔ اسی طرح مرزا قویش کو مرزا قویاش بھی کہا جاتا تھا۔ بقول ذکاءاللہ ان کا نام مرزا قویش تھا جو بعد میں بگڑ کر مرزا قویاش ہو گیا۔[۵۹]

بیٹیاں: بہادر شاہ کی بیٹیوں کی تفصیل عرش تیموری کے بیان کے مطابق اس طرح ہے:

[۶۰] ۱۔ کاشفہ بیگم	۲۔ ننھی بیگم	۳۔ آغا بیگم
۴۔ بلاقی بیگم	۵۔ براتی بیگم	۶۔ شبیہہ بیگم
۷۔ مکھولی بیگم	۸۔ دبیر النساء بیگم	۹۔ حسن زمانی بیگم
۱۰۔ نواب بیگم	۱۱۔ حاجی بیگم	۱۲۔ کلثوم بیگم

۱۳۔ جمیا بیگم	۱۴۔ اورنگ زمانی بیگم	۱۵۔ پیاری بیگم
۱۶۔ بستی بیگم	۱۷۔ ننھی بیگم (خرد)	۱۸۔ حمید الزمانی بیگم
۱۹۔ ثالث زمانی بیگم	۲۰۔ قطبی بیگم	۲۱۔ بلاقن بیگم
۲۲۔ مریم زمانی بیگم	۲۳۔ رابعہ بیگم	۲۴۔ حاتم زمانی بیگم
۲۵۔ قریشیہ سلطان بیگم	۲۶۔ سلطان زمانی بیگم	۲۷۔ خیر النسار بیگم
۲۸۔ ستارہ بیگم	۲۹۔ افسر زمانی بیگم (یہ دو لڑکیاں توام پیدا ہوئیں)	
۳۰۔ تہنیت آرا بیگم	۳۱۔ خاتون زمانی بیگم "۱۶۰	

ولی عہدی کا جھگڑا

۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ ثانی کے انتقال کے بعد جب بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوئے تو اس وقت گورنر جنرل کی ہدایت کے بموجب اس بات کی کوشش کی گئی تھی کہ بادشاہ، ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقابلے میں اپنے تمام دعووں سے دست بردار ہو جائیں لیکن بادشاہ نے اس تجویز کو منظور کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ بادشاہ کے سامنے دوسری تجویز یہ رکھی گئی تھی کہ وہ لال قلعہ خالی کر کے قطب صاحب چلے جائیں لیکن یہ تجویز بھی انھوں نے سختی کے ساتھ مسترد کر دی تھی۔[۱۶۱] انگریزوں نے موقع محل کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے دونوں تجویزوں کو خاموشی کے ساتھ واپس لے لیا اور اپنے ارادوں کو وقتی طور پر ملتوی کر دیا۔

بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی کے ساتھ ہی ان کے بڑے لڑکے مرزا دارا بخت کو ولی عہد نامزد کر دیا گیا تھا۔[۱۶۲] مرزا دارا بخت کا انتقال ۱۱ جنوری ۱۸۴۹ء کو بہادر شاہ ظفر کی زندگی ہی میں ہو گیا۔[۱۶۳] مرزا دارا بخت کے انتقال کے تیسرے ہی دن یعنی ۱۳ جنوری ۱۸۴۹ء کو دہلی گزٹ نے مرزا دارا بخت کے انتقال سے متعلق جو خبر شائع کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کو اب اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے راستہ صاف نظر آ رہا تھا۔

طامس مٹکاف نے دہلی گزٹ کی خبر کو اپنی ڈائری میں اس طرح نقل کیا ہے:

"جمعرات کی صبح ولی عہد سلطنت مرزا دارا بخت کا انتقال ہو گیا اور ان کے بعد شہزادہ فخر الدین، ولی عہدِ سلطنت قرار پائیں گے۔ ہمارے پاس اس

امر کے یقین کرنے کے وجوہ ہیں کہ شاہی گھرانے کا حق جانشینی ان کے بعد ختم ہو جائے گا۔ اس لیے کہ انفرادی طور پر ان سے اس کی ذمّے داری کر لی گئی ہے اور ایسی ذمّے داری اور کسی فرد خاندان سے نہیں کی گئی۔ ہم صدق دلی سے اعتماد کرتے ہیں کہ صورتِ حال درحقیقت ایسی ہی ہے اور یہ کہ ہماری حکومت بادشاہ کے انتقال پر خاندان کو منتشر کرنے کا معقول انتظام کرے گی اور گزارے کے لیے معقول پنشن کا بندوبست کرے گی۔[۱۶۴]"

ولی عہد کے انتقال پر بہادر شاہ ظفر نے تاریخ وفات بھی کہی تھی۔ جسے طامس مٹکاف نے اپنے روزنامچے میں نقل کیا ہے۔ یہ تاریخ اس طرح ہے:

آں ولی عہدے کہ دارا بخت بود
کرد چوں رحلت ازیں دنیاے دوں
شد درونِ خلق داغ از سوزِ غم
گشت سالِ رحلتش 'داغِ دروں'
(۱۲۶۵ھ/۱۸۴۹ء)

مرزا دارا بخت کے بعد ولی عہدی کے حق دار مرزا شاہ رخ بہادر ہوتے تھے جو عہدۂ وزارت پر مامور تھے لیکن ان کا انتقال مرزا دارا بخت سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ احسن الاخبار کی خبروں کی رو سے مرزا شاہ رخ کا انتقال ۹ اپریل اور ۲۳ اپریل ۱۸۴۷ء کے درمیان کسی تاریخ کو ہوا تھا۔ احسن الاخبار کی ۹ اپریل کی خبر ہے:

" مرزا شاہ رخ بہادر کے نام شقہ جاری فرمایا کہ چوں کہ اب سردی کا موسم ختم ہو گیا ہے اور گرمیاں آ رہی ہیں لہٰذا شکارگاہ سے واپس آ جاؤ۔ اور بہت جلد ہمارے دربار میں پہنچ کر سعادت اندوز ہو۔"[۱۶۵]

آگے چل کر ۲۳ اپریل کے اخبار میں معاً یہ خبر سامنے آتی ہے:

" ارشاد ہوا کہ حضرت ولی عہد بہادر اور تمام اولاد امجاد اور سلاطینِ قلعہ شہزادہ مرزا شاہ رخ بہادر کی فاتحہ خوانی کے لیے مسجد جہاں نما میں جمع ہوں۔

یکے بعد دیگرے سب لوگ مسجد میں جمع ہو گئے۔ مسجد بھر گئی تو مرزا عبداللہ نے اپنے والد ماجد مرزا محمد شاہ رُخ بہادر کی وفات کی کیفیت، علاج کی ناموافقت حکیم محمد اسماعیل خاں کی بے توجہی از اوائل تا آخر بیان کی۔"[۱۶۶]

قلعۂ معلّٰی میں ولی عہدی کے جھگڑے کا آغاز اور اس سلسلے میں مختلف سازشوں کی ابتدا:

اصل میں ولی عہد مرزا دارا بخت کی موت کے بعد سے ہوتی ہے۔ دارا بخت کے انتقال کے بعد بہادر شاہ کی چہیتی بیگم نواب زینت محل کی یہ خواہش تھی کہ ان کے نورِ نظر جواں بخت کو، جس کی عمر اس وقت مشکل سے آٹھ سال تھی، ولی عہد مقرر کیا جائے۔ اس بنا پر خود بہادر شاہ ظفر کی بھی یہی رائے تھی اور وہ اس بات کے لیے کوشاں تھے کہ جواں بخت ہی کو اپنا ولی عہد نامزد کریں۔ چنانچہ ولی عہد دارا بخت کی وفات کو ابھی ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ بیگم زینت محل کی کوششیں زور شور سے شروع ہو گئیں۔ ۱۱ر جنوری کو ولی عہد کا انتقال ہوا اور ۱۸ر جنوری کو جو حالات قلعے میں رونما ہونے شروع ہوئے ان کی کیفیت یہ تھی:

"بادشاہ سلامت لال قلعے میں رونق افروز ہیں۔ معظم الدولہ ایجنٹ بہادر کو زبانی پیام بھیجا کہ زینت محل بیگم احمد قلی خاں کی بیٹی ہیں اور احمد قلی خاں احمد شاہ درّانی کے خاندان سے ہیں لہٰذا زینت محل کی اولاد کو بادشاہت کا استحقاق ہے۔ اس لیے بیگم مذکور کے بیٹے مرزا جواں بخت کو ولی عہد بنا دیا جائے۔"[۱۶۷]

انگریز جواں بخت کو ولی عہد نامزد کرنے کی تجویز کے خلاف تھے اور بادشاہ، زینت محل کے دباؤ سے، جواں بخت کے لیے کوشاں تھے۔ شاہ عالم ثانی کے عہد تک مغل شہنشاہوں کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ کسی بھی فرزند کو اپنا ولی عہد مقرر کر سکتے تھے لیکن جب مغل شہنشاہ انگریزوں کے پنشن خوار ہو گئے تو یہ حق ان سے چھین لیا گیا۔ اسی بنا پر بہادر شاہ ظفر کے والد اکبر شاہ ثانی اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود اپنے چہیتے بیٹے مرزا جہانگیر کو ولی عہد نامزد کرانے سے قاصر رہے تھے اور اب پھر اسی بنا پر بہادر شاہ ظفر کو اپنے بیٹے جواں بخت کو ولی عہد نامزد کرانے میں کامیابی حاصل نہیں ہو رہی تھی۔ انگریزوں نے اگرچہ جواں بخت کو


بہادر شاہ ظفر اور ان کے صغیر سن فرزند مرزا فخرو

ولی عہد تسلیم نہیں کیا تھا لیکن بہادر شاہ ظفر اور ان کی بیگم زینت محل نے اپنے دل کو سمجھانے کے لیے انھیں ولی عہد تصور کر لیا تھا۔ طامس مٹکاف اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے :

"عرض کیا گیا کہ شاہزادہ مرزا جواں بخت قدم شریف کو جائیں گے۔ زینت محل کے کہنے کے بموجب ولی عہدی کے جلوس کا سامان پچاس سوار اور چار شاہی نشان مقرر فرما دیے۔ ۶ر فروری ۱۸۴۹ء" ۱۶۸

"قطب صاحب کے عرس کی تیاری کے لیے دو سو روپے مرزا جواں بخت کو عنایت کیے اور ولی عہدی کے جلوس کے مطابق پچاس سوار، چار دستے سپاہیوں کے اور سات ہاتھی مرزا جواں بخت کے ساتھ جانے کے لیے مقرر کر دیے۔

۹ر فروری ۱۸۴۹ء" ۱۶۹

بہادر شاہ ظفر کے منجھلے بیٹے مرزا فتح الملک بہادر عرف مرزا فخرو، مرزا دارا بخت اور مرزا شاہ رخ بہادر کی موت کے بعد سب سے بڑے تھے۔ وہ انگریزوں کے فارمولے کے مطابق بھی ظفر کے جائز اور قانونی وارث تھے لیکن بہادر شاہ اور زینت محل، دونوں ان کے حق میں نہیں تھے اس لیے وہ عہدۂ ولی عہدی کے لیے انگریزوں کے ساتھ ہر قسم کی شرائط اور سودے بازی کے لیے تیار تھے۔ خود انگریز بھی مرزا فخرو کے حق میں تھے لیکن مرزا فخرو کو انگریزوں کی جو حمایت حاصل تھی اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ انگریز مرزا فخرو کو انصاف دلانا چاہتے تھے بلکہ اصلیت یہ تھی کہ وہ مرزا فخرو کو ولی عہد مقرر کر کے اپنے ان منصوبوں کی تکمیل کرنا چاہتے تھے جن کو وہ اس سے پہلے شاہ عالم ثانی ... اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کے دور میں عملی جامہ پہنانے سے قاصر رہے تھے۔

بہادر شاہ ظفر انگریزوں کے اس خیال سے قطعی متفق نہیں تھے کہ مرزا فخرو کو ولی عہد مقرر کیا جائے۔ مرزا دارا بخت کے انتقال کے بعد جب زینت محل نے جواں بخت کی ولی عہدی کا خواب دیکھنا شروع کیا تو بہادر شاہ ظفر بھی ان کے ہم خیال ہو گئے۔ کچھ تو اس لیے کہ وہ خود بھی جواں بخت کو بہت چاہتے تھے اور کچھ اس لیے بھی کہ وہ مرزا فخرو سے نالاں تھے۔ مرزا فخرو انگریزوں کے خیر خواہ تھے اور انھی کے اشارے پر چلتے تھے۔ ولی عہد مرزا دارا بخت کی زندگی میں بھی جب

کہ مرزا فخرو کے ولی عہد بننے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا، وہ انگریزوں سے ساز باز رکھتے تھے چناں چہ ایک مرتبہ بادشاہ نے ایک شقہ جاری کر کے انھیں تنبیہہ کی تھی کہ وہ اس قسم کی حرکتوں سے باز رہیں۔ احسن الاخبار لکھتا ہے :

"بادشاہ سلامت نے ایک شقہ مرزا فخرو کے نام اس مضمون کا روانہ کیا کہ تم ہندو راؤ اور حسین علی کے ساتھ راج پورہ چھاؤنی میں انگریزوں کی کوٹھیوں پر آتے جاتے ہو۔ یہ امر حد درجہ نامناسب ہے۔ تم کو چاہیے کہ یہ طریقہ چھوڑ دو بھلا تمہیں انگریزوں سے ملنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر آئندہ سننے میں آیا کہ تم انگریزوں سے ملاقات کے لیے جاتے ہو تو تمھاری تنخواہ موقوف کر لی جائے گی۔ اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔"[١٧٠] ۴ ستمبر ۱۸۴۶ء

انگریزوں کے ساتھ ان تعلقات کو استوار کرنے اور افسران بالا سے براہ راست گفتگو کرنے کی غرض سے ہی غالباً مرزا فخرو نے انگریزی پڑھنی شروع کر دی تھی :

"ناظر قلعہ کے نام حکم جاری کیا گیا کہ مرزا فخر الدین بہادر شاہزادے نے انگریزی پڑھنے کے لیے ایک انگریز نوکر رکھا ہے۔ لہٰذا انگریز مذکور کو قلعے میں آنے جانے سے نہ روکا جائے۔"[١٧١]

بہادر شاہ ظفر نے جواں بخت کے لیے عہدۂ ولی عہدی کی وکالت کرتے ہوئے اس بات پر بھی زور دیا تھا کہ جواں بخت دوسرے شہزادوں کے مقابلے میں نجیب و شریف ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مرزا فخرو کی مخالفت بادشاہ کی جانب سے اس لیے بھی ہوئی ہو کہ وہ اس طرح 'نجیب و شریف' نہیں تھے۔ مرزا فخرو کے خلاف جنسی بے راہ روی کی ایک شکایت کا ذکر احسن الاخبار میں اس طرح ملتا ہے :

"صاحب کلاں بہادر کی عرضی ملاحظے کے لیے بھیجی گئی۔ اس میں لکھا تھا کہ مرزا فخر الدین بہادر شہزادہ، شہر سے فریب دے کر ایک فاحشہ عورت کو قلعے میں لے آئے ہیں۔ حکم دیا جائے تاکہ وہ اس عورت کو عدالت فوج داری میں روانہ کر دیں۔"[١٧٢]

ان تمام باتوں کے باوجود مرزا فخرو کو انگریزوں کی حمایت حاصل تھی اس لیے بادشاہ اور بیگم کی کچھ نہ چل سکتی تھی۔ مرزا فخرو نے انگریزوں کے مفاد اور منشا کے مطابق ان کے ساتھ ایک خفیہ معاہدہ کر لیا تھا اور اس طرح دہلی کے تاج و تخت کا سودا بہادر شاہ ظفر کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا۔ شمالی مغربی صوبہ جات کے سیکرٹری نے سیکرٹری گورنمنٹ آف انڈیا کو اس معاہدے کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا کہ شہزادہ مرزا فخرو ہر چہار شرائط کو پوری طرح مان گئے ہیں بشرطیکہ انھیں اس کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنے والد کے انتقال کے بعد تخت کے وارث قرار دیے جائیں اور انھیں تمام شاہانہ خطابات اور تزک و احتشام سے نوازا جائے۔"[۳]

۴ر جون ۱۸۵۲ء کو انگریزوں اور مرزا فخرو کے درمیان ولی عہدی کے سلسلے میں جو چار شرطیں طے ہوئیں وہ یہ تھیں:

"(۱) مرزا فخرو جب بھی گورنر سے ملیں گے برابری کے رشتے سے ملیں گے۔

(۲) شاہی زمینوں کا بندوبست برٹش گورنمنٹ کرے گی۔

(۳) سلاطین کو قلعے سے نکال دیا جائے گا اور کسی جرم کا مرتکب ہونے پر ان پر عام عدالت میں مقدمہ چلایا جائے گا۔

(۴) لال قلعہ خالی کر کے ولی عہد قطب صاحب چلے جائیں گے۔"[۴]

اس سلسلے میں مرزا فخرو کا وہ مراسلہ بھی کافی اہم ہے جو انھوں نے اپنے دستِ خاص سے لکھ کر انگریزوں کو روانہ کیا تھا اور جس کی نقل نیشنل آرکائوز کے فائل میں موجود ہے۔ یہی وہ مراسلہ ہے جس کی روشنی میں مندرجہ بالا چار نکاتی معاہدہ عمل میں آیا تھا۔ یہ مراسلہ فارسی میں ہے جس کا اردو ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے:

"نقل اقرار نامہ از جانب مرزا محمد فتح الملک شاہ عرف مرزا غلام فخر الدین بہادر۔

حضور والا کے انتقال کے بعد انگریزی سرکار تیموریہ خاندان کی صدارت معہ شاہی خطاب و دیگر لوازمات، ماہی مراتب کا لحاظ اور سواری کے موقع پر کمپنی کی توپوں کا حق مجھے دے گی۔ کمپنی کے ساتھ مندرجہ ذیل شرائط پر عمل ہوگا:

اوّل یہ کہ جو صاحب بھی گورنری کے منصب پر فائز ہو کر شاہ جہاں آباد تشریف لائیں گے، یہ بندہ ان کے ساتھ کسی قسم کا فرق اور تفاوت نہیں برتے گا۔

دوم یہ کہ یہ بندہ شاہ جہاں آباد کا قلعہ، جو قلعۂ مبارک کہلاتا ہے، اس کی سکونت چھوڑ کر بجملہ سلاطین کے ساتھ خالی کر کے سرکارِ دولت مدار کے سپرد کر دے گا اور خود اپنی اولاد کے ساتھ جا کر خواجہ صاحب میں رہے گا لیکن وہاں بندے کے رہنے کے لیے سرکار کو ایک مناسب مکان تعمیر کرانا ہوگا۔

سوم یہ کہ تمام دیہات اور جاگیری املاک کا بندوبست انگریزی سرکار کے سپرد ہوگا۔ اس کا انتظام انگریزی سرکار کرے گی لیکن اس کی آمدنی کا حق بندے کو ہوگا۔ فقط تحریر بتاریخ سیوم جنوری ۱۸۵۲ء" ۱۶۵

(فارسی سے ترجمہ)

جیسا کہ ظاہر ہے مذکورہ بالا خط مرزا فخرو نے ۳ جنوری ۱۸۵۲ء کو لکھا جب کہ معاہدے کی شرائط ۲۰ جون ۱۸۵۲ء کو طے ہوئیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ چند باتیں ایسی بھی تھیں جن کی پیش کش خود مرزا فخرو کی طرف سے ہوئی اور ان میں مزید شرائط کا اضافہ انگریزوں نے کر دیا۔

عرش تیموری نے مرزا قمقام الدولہ کے حوالے سے مرزا خورشید عالم خلف مرزا فخرو کی روایت نقل کی ہے جس کی رو سے اقرار نامہ پہلی مرتبہ اس وقت عمل میں آیا جب کہ ۱۸۴۴ء میں لارڈ ہارڈنگ دہلی آئے۔ اس اقرار نامے کی شرائط یہ تھیں:

"اوّل: بعد انتقالِ حضور بادشاہ بہادر شاہ کے قلعہ خالی کر دینا ہوگا۔

دوم: تمام خاندان کو ساتھ لے کر قطب صاحب میں سکونت اختیار کرنی ہوگی۔

سوم: ایک کروڑ روپیہ معاوضہ لال قلعہ اور ایک کروڑ روپیہ قطب صاحب میں تعمیر مکانات کے لیے دیے جائیں گے۔ وہاں اپنی مرضی کے مطابق مکانات بنانے کا اختیار ہوگا۔

چہارم: بموجب عہدنامہ سلطانی تین لاکھ روپے ماہوار کے حساب سے چھتیس لاکھ روپے سالانہ سرکار انگریزی سے دیے جائیں گے۔

پنجم: انتظام کے لیے پانچ ہزار فوج رکھنے کی اجازت دی جائے گی۔
ششم: نواب گورنر جنرل بہادر اور نواب لفٹیننٹ بہادر کو دربار میں کرسی دینی اور عظمت کرنی ہوگی۔

ہفتم: ہر موقعے پر رؤسا ے با اختیار میں اوّل نمبر دیا جائے گا۔" ۱۷۶

مندرجۂ بالا عہد نامے کی دوسری، تیسری اور چوتھی شرطوں کے علاوہ باقی تمام شرائط وہی ہیں جن پر آخر میں فیصلہ ہوا۔ مرزا فخرو نے اپنی ولی عہدی کے لیے ایک طرف تو انگریزوں سے ساز باز کی اور دوسری جانب بادشاہ اور زینت محل بیگم کی خوشامد میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ چناں چہ جس زمانے میں یہ شرائط طے ہو چکی تھیں اور انگریزوں کی جانب سے ان کی ولی عہدی کا اعلان ہونے ہی والا تھا تو انھوں نے احتیاط کے طور پر بادشاہ کو ایک ساتھ تین خط لکھے۔ یہ تینوں خط ایک ہی تاریخ یعنی ۲۰ ستمبر ۱۸۵۲ء کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان خطوط کے اصل مسوّدات مرزا فخرو کی مہر کے ساتھ نیشنل آرکائوز میں موجود ہیں۔ خصوصاً درج ذیل خط میں مرزا فخرو نے بادشاہ اور اپنی سوتیلی والدہ زینت محل بیگم کی کافی خوشامد کی ہے:

"میں مرزا محمد سلطان فتح الملک شاہ بہادر اپنے پورے ہوش و حواس کے ساتھ .... اقرار کرتا ہوں اور یہ لکھ کر دیتا ہوں کہ اگر حضور قدر قدرت پیر و مرشدِ برحق جناب خلافت مآب اس کم ترین غلام درگاہِ آسماں جاہ پر توجہ، عنایت اور غلام نوازی کی نظر مبذول فرمائیں .... اور منصب ولی عہدی پر سرفراز فرمائیں تو اپنی تمام زندگی آپ کی اطاعت، غلامی، دوست خواہی اور فرماں برداری میں گزاروں گا اور اس میں بال برابر قصور کا مرتکب نہ ہوں گا۔ اور حضور کے احکام کے خلاف کوئی عمل نہ کروں گا۔ اور جناب عفّت مآب حضرتِ والدہ صاحبہ ملکۂ دوراں نواب زینت محل بیگم صاحبہ مدظلہا کو اپنی والدۂ حقیر سے زیادہ سمجھوں گا اور کوئی دقیقہ ان کی تابع داری، فرماں برداری اور ارادت کیشی میں فروگذاشت نہ کروں گا اور حضرت ظلّ سبحانی خلیفۃ الرحمانی و جناب والدہ صاحبہ موصوفہ کی رضا مندی کو مثل خدا اور رسولؐ کی رضا مندی کے

تصور کروں گا اور والدہ صاحبہ اور برادرِ عزیز از جان مرزا محمد جواں بخت بہادر کی خوشنودی و فلاح و بہبود و رونق آبرو کو .... مقدم تر جانوں گا اور ان کی عزت و حرمت کو اپنے فرزندوں کی عزت و حرمت سے زیادہ سمجھوں گا' اور جان و دل سے ان کے حفظ و حمایت و فلاح کے لیے کوشاں رہوں گا اور کبھی بھی کسی برائی' یا خلل یا خلش کا سبب نہیں ہوں گا اور اس عطیہ عظمیٰ یعنی مرقوم الصدر عہدے کے حصول کو اپنے حق میں اللہ کا انعام سمجھوں گا اور اس عنایت اور بے پایاں احسان کے لیے درگاہِ الٰہی میں سجدۂ شکر ادا کروں گا۔ اگر خدانخواستہ مجھ سے کوئی عمل اپنی اس تحریر کے خلاف سرزد ہو تو میں اپنے اس جرم کے لیے درگاہِ الٰہی و رسالت پناہی و کلام اللہ شریف کے سامنے جواب دہ ہوں گا اور درگاہِ بادشاہِ عالم پناہ کا مجرم ہوں گا۔ اس لیے یہ چند کلمے ایک مکمل دستاویز کے طور پر لکھے ہیں کہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔"

(فارسی سے ترجمہ)

اسی تاریخ کو مرزا فخرو نے بادشاہ کو جو دوسرا خط لکھا اس میں اس بات کی یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ بادشاہ پر جتنے بھی قرضے ہیں خصوصاً مرزا جواں بخت کی شادی کا قرضہ اور دوسرے تمسک اور اسٹامپ وغیرہ ان سب کی ادائیگی کر دی جائے گی۔ ساتھ ہی اس بات کا یقین دلایا گیا تھا کہ والدہ صاحبہ (زینت محل بیگم) اور ان کے لواحقین کی منشا کے خلاف کوئی کام نہیں کیا جائے گا۔" اپنے تیسرے خط میں مرزا فخرو نے بادشاہ کو اس بات کا یقین دلایا تھا کہ نواب زینت محل اور جواں بخت کی تنخواہیں اسی طرح بحال رہیں گی اور انھیں کسی قسم کی مالی پریشانی کا شکار نہ ہونے دیا جائے گا۔"[9]

بہادر شاہ ظفر کو صاف نظر آ رہا تھا کہ اب دنیا کی کوئی طاقت مرزا فخرو کو ولی عہد بننے سے نہیں روک سکتی۔ چوں کہ انھوں نے ولی عہدی کے معاملے میں مرزا فخرو کی مخالفت کی تھی اس لیے انھیں یہ بھی اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی آنکھ بند ہو جانے کے بعد نواب زینت محل بیگم اور جواں بخت کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی ہو۔ انھیں ان دونوں کے مستقبل کے بارے میں

تشویش تھی لہٰذا وہ پہلے ہی گورنر جنرل کو ایک خط بھیج چکے تھے جس کا خلاصہ سرکاری کاغذات میں اس طرح موجود ہے :

"بادشاہ نے گورنر جنرل کو ایک خط لکھا جس میں درخواست کی گئی تھی کہ ان کے انتقال کے بعد ان کی چہیتی بیگم نواب زینت محل اور ان کے بیٹے مرزا جواں بخت کو ۳۳۲۲ روپے اور ۲۰۷۷ روپے ماہانہ علی الترتیب وظیفہ دیا جائے اس کے علاوہ بیگم کو چار گاؤں بھی عطا کیے جائیں۔ اس خط میں یہ بھی تحریر کیا تھا کہ شہزادہ جواں بخت کی شادی کے سلسلے میں جو رقم قرض لی گئی تھی سرکار اس کی ادائیگی کا بندوبست کرے۔ یہ خط یکم جولائی ۱۸۵۲ء کو لکھا گیا تھا گورنر جنرل کی طرف سے اس کا جواب ۱۳ ستمبر ۱۸۵۲ء کو روانہ ہوا جس میں بادشاہ کو مطلع کیا گیا تھا کہ حکومت برطانیہ نے مرزا فخرو کو ولی عہد تسلیم کر لیا ہے۔ حضور والا نے جو مراعات بیگم اور شہزادہ جواں بخت کے لیے حاصل کرنی چاہی ہیں ان کے بارے میں حضور کو خود ہی سمجھ لینا چاہیے کہ یہ مراعات دینی ممکن نہیں۔" ۱۸۰

(انگریزی سے ترجمہ)

انگریزوں کی منشا اور منصوبے کے مطابق مرزا فخرو ولی عہد نامزد ہو چکے تھے۔ ان سے اس بات کی ضمانت لے لی گئی تھی کہ بہادر شاہ کے انتقال کے بعد وہ لال قلعہ چھوڑ دیں گے۔ اب انگریز اس فکر میں تھے کہ کب بہادر شاہ کا انتقال ہو اور وہ قلعے کو اپنے قبضے میں کریں۔ اسی اثنا میں جب سمن فریزر دلی کا ایجنٹ مقرر ہوا تو اسے مندرجۂ ذیل ہدایات موصول ہوئیں :

"بادشاہ کے انتقال کے بعد تم کو بھی انھی ہدایات پر عمل کرنا ہوگا جو تم سے پہلے افسران کو دی جا چکی ہیں۔ دہلی کے تاج و تخت کی آئندہ وراثت کے سلسلے میں گورنمنٹ آف انڈیا کے جدید احکام یہ ہیں کہ شاہی خطابات تو جوں کے توں رہیں لیکن ولی عہد کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ قلعہ خالی کر دیں۔ ایسی صورت میں قلعہ گورنمنٹ آف انڈیا کی ملکیت

ہو جائے گا۔ ولی عہد اور اس کے خاندان کے علاوہ تمام سلاطین کے لیے وہ قانونی مراعات ختم کر دی جائیں گی جن کا وہ اب تک فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔" ۱۸۱

بہادر شاہ ظفر بالکل بے بس اور لاچار تھے۔ اپنی ضعیف العمری کی وجہ سے وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ چراغِ آخر شب ہیں لیکن انھیں سب سے زیادہ فکر اپنی بیگم اور نو عمر شاہزادے جواں بخت کی تھی۔ وہ دن رات ان کے مستقبل کے لیے پریشان رہتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے ۱۶ مئی ۱۸۵۲ء کو پھر ایک خط گورنر جنرل کے نام لکھا جس کا مضمون یہ تھا:

"اب ہماری عمر اسّی سال سے متجاوز ہے اور محض گنتی کے دن زندہ رہنے کے لیے باقی ہیں۔ ہم عرصے سے اپنے خاندان کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں ہیں، خصوصاً نواب زینت محل اور شہزادہ جواں بخت کے لیے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بعد انھیں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ہمیں یقین ہے کہ کوئی شخص ان کی زندگی کے درپے نہ ہوگا اور ہم امید کرتے ہیں کہ ان کے وظائف اسی طرح جاری رہیں گے۔ تاہم احتیاط کے طور پر ہم جناب والا سے یہ گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ ان لوگوں کے ساتھ منصفانہ رویہ قائم رکھا جائے۔" ۱۸۲

(انگریزی سے ترجمہ)

بادشاہ کے ان پے درپے خطوط اور ان کے اضمحلال کو دیکھتے ہوئے "صاحبان عالی شان" نے ۴ جون ۱۸۵۲ء کو ایک مجلس منعقد کی جس میں یہ فیصلہ ہوا کہ بادشاہ کو یقین دلایا جائے کہ ان کی وفات کے بعد زینت محل اور جواں بخت کسی غیر منصفانہ رویے کا شکار نہیں ہوں گے۔ خود گورنر جنرل نے ۱۰ جون ۱۸۵۳ء کو بادشاہ کے نام ایک مراسلہ بھیجا جس میں بادشاہ کو یقین دہانی کراتے ہوئے لکھا گیا ہے:

"حکومت برطانیہ ہمیشہ سب کے ساتھ انصاف کرتی ہے۔ لہٰذا حضور والا خاطر جمع رکھیں بیگم زینت محل اور جواں بخت کے ساتھ کوئی غیر منصفانہ سلوک نہیں کیا جائے گا اور نہ ان کے ساتھ کسی طرح کی دل آزاری کی جائے گی۔" ۱۸۳

(انگریزی سے ترجمہ)

انگریزوں کے منصوبے کے مطابق تمام حالات درست ہو گئے تھے۔ اور اب انگریز اطمینان کے ساتھ صرف بوڑھے بادشاہ کی موت کا انتظار کر رہے تھے لیکن معاً وقت نے ایک ایسی کروٹ لی جس سے انگریزوں کے تمام منصوبے مٹی میں مل کر رہ گئے۔ اچانک مرزا فخرو کی موت واقع ہو گئی اور مغل حکومت کے خاتمے کا جو پروگرام مرزا فخرو کے واسطے سے بنایا گیا تھا وہ فی الحال ٹل گیا۔ مرزا فخرو کا انتقال ۱۰ر جولائی ۱۸۵۶ء کو شام کے سات بجے ہوا۔[۱۸۴]

مرزا فخرو کے انتقال کے بعد شہزادہ جواں بخت کو ولی عہد نامزد کرانے کی تحریک میں ایک بار پھر سے جان پڑ گئی۔ بادشاہ نے سمن فریزر کے نام ایک خط جواں بخت کی حمایت میں پھر روانہ کیا اور اس کے ساتھ ہی علاحدہ سے ایک درخواست اپنے نو شہزادوں کے دستخطوں کے ساتھ روانہ کی۔ اس درخواست میں دستخط کنندگان نے جواں بخت کی ولی عہدی کی حمایت کی تھی۔ جن نو شہزادوں کے دستخط اس درخواست پر ملتے ہیں ان کے نام یہ ہیں:

"مرزا محمد سلطان،	مرزا محمد ابوالحسن،	مرزا محمد ابوالنصر
مرزا ابو طاہر،	سلطان محمد سہراب،	مرزا خضر سلطان
بختاور شاہ،	مرزا کوچک سلطان،	مرزا شاہ عباس"[۱۸۵]

اس اثنا میں خفیہ طور پر مرزا فخرو کی جگہ مرزا قویش کی ولی عہدی کا فیصلہ ہو چکا تھا اس بات کا اندازہ مذکورۂ بالا اس درخواست سے بھی ہوتا ہے جس پر جواں بخت کی حمایت میں نو شہزادوں نے دستخط کیے تھے اور ان دستخط کنندگان میں مرزا قویش کا نام شامل نہیں ہے۔ اِدھر بہادر شاہ ظفر سمجھتے تھے کہ اب شاید راستہ صاف ہو گیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ مرزا فخرو کا انتقال ہو چکا ہے۔ نو شاہزادوں نے جواں بخت کے حق میں اپنی رائے دے دی ہے اور پھر تھوڑا بہت وزن ان کی بات کا ہو گا اس لیے اب مسئلہ آسانی سے حل ہو جائے گا لیکن ہوا اس کے برعکس — گورنر جنرل کی طرف سے شمالی مغربی صوبہ جات کے سکریٹری کو جو خط لکھا گیا اس کو دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ اب اس معاملے میں انگریز اور زیادہ سخت قدم اٹھا رہے تھے۔ اس خط میں لکھا تھا:

"تخت سلطنت کی وراثت کا سوال حال اور مستقبل دونوں کے لیے

سرے سے ختم ہو گیا ہے اور اگر بادشاہ کے خط کا جواب دینا واقعی ضروری ہے تو ان کو مطلع کر دیا جائے کہ گورنر جنرل، مرزا جواں بخت کی ولی عہدی تسلیم نہیں کر سکتے۔ ساتھ ہی مرزا قویش بھی اتنے خوش امید نہ ہوں کہ وہ یہ سمجھنے لگیں کہ ان کے ساتھ بھی وہی شرائط عمل میں آئیں گی جو مرزا فخرو کے ساتھ طے پائی تھیں۔ بادشاہ کے زندہ رہنے تک اب کسی قسم کی خط و کتابت حضور والا یا کسی اور شخص سے نہ کی جائے گی۔ نیز یہ کہ اگر بادشاہ کا انتقال ہو جائے یا وہ قریب المرگ ہوں تو فوراً مرزا قویش کو مطلع کیا جائے اور کسی قسم کی سازش یا خوف و ہراس کو پھیلنے نہ دیا جائے لیکن مرزا قویش پر یہ واضح کر دیا جائے کہ گورنمنٹ ان کو محض شاہی خاندان کے سرپرست کی حیثیت سے تسلیم کرتی ہے اور ان کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جائے گا جو ان کے بڑے بھائی مرزا فخرو کے ساتھ طے ہوا تھا۔ البتہ بادشاہ کا خطاب اور دوسری شان و شوکت ختم کر دی جائے گی اور (بادشاہ کے بعد) ان کی حیثیت آل تیمور کے شہزادے ہی کی سی رہے گی۔ جہاں تک وظیفے کا تعلق ہے بادشاہ کے انتقال کے بعد ان کو پندرہ ہزار روپے ماہانہ وظیفہ ملا کرے گا۔" ۱۸۶ (انگریزی سے ترجمہ)

اس خط کی عبارت سے پتا چلتا ہے کہ انگریزوں نے بادشاہ کی مرضی کے خلاف اور ان کو اطلاع دیے بغیر مرزا قویش کو ولی عہد مقرر کر دیا تھا۔[۱۸۷] لیکن مرزا قویش کے ساتھ ان تمام باتوں کے علاوہ جن کی فتے داری مرزا فخرو نے لی گئی تھی ایک نیا شگوفہ یہ کھلا کہ وہ بادشاہ کے انتقال کے بعد بھی بادشاہ نہیں کہلائیں گے بلکہ شہزادے ہی رہیں گے۔ مزید برآں انھیں صرف پندرہ ہزار روپے ماہانہ وظیفہ ملا کرے گا جب کہ مرزا فخرو کے ساتھ تین لاکھ طے ہوا تھا۔ اس طرح گویا اس بات کا تو فیصلہ ہو ہی چکا تھا کہ دہلی کی بادشاہت ظفر پر ختم ہے۔ پھر بھی جواں بخت کو ولی عہد بنوانے کی کوششیں اب بھی جاری تھیں۔ ان کوششوں میں شاید خود بادشاہ کی دلچسپی اتنی نہیں تھی جتنی کہ ان کی بیگم زینت محل کی تھی۔ اپنی بیگم کی پذیرائی کے لیے ان کوششوں میں ان کا وقار مٹی میں مل کر رہ گیا تھا اس لیے کہ ہر بار ان کی تجویز کو بڑی بے نیازی کے ساتھ مسترد

کر دیا جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زینت محل کے لیے جواں بخت کی ولی عہدی کا معاملہ بادشاہ کے وقار سے بھی زیادہ اہم تھا۔ ۱۰ دسمبر ۱۸۵۵ء کو بادشاہ نے جواں بخت کی حمایت میں پھر ایک شقہ مسٹر فریزر ایجنٹ شمال مغربی صوبہ جات کی معرفت لفٹیننٹ کے نام جاری کیا۔ اس شقے کی انگریزی تلخیص نیشنل آرکائیوز کے فارن ڈپارٹمنٹ کے ریکارڈ میں موجود ہے۔ اس شقے کے ساتھ بادشاہ نے ایک خط بھی منسلک کیا تھا جس میں اس امر سے بحث کی گئی تھی کہ آخر کن بنیادوں پر جواں بخت ہی ولی عہدی کا حق دار ہے۔ بادشاہ نے اپنے خط میں سات ایسی وجوہ بیان کی ہیں جن کی رو سے جواں بخت ولی عہدی کا حق دار تھا۔ یہ وجوہ اس طرح ہیں:

(۱) وہ (جواں بخت) نجیب الطرفین ہے کیوں کہ اس کی والدہ احمد قلی خاں کی صاحب زادی ہیں جن کے اجداد سلطنت (مغلیہ) کے ابتدائی دور میں وزیر رہ چکے ہیں۔ دوسرے شہزادوں میں سے کوئی اس اعتبار سے نجیب نہیں۔

(۲) حقیقت یہ ہے کہ ایسے خاندانی لوگوں میں قدرت ان کے مرتبے کے مطابق صفات بھی ودیعت کرتی ہے اور وہ اپنے فرائضِ منصبی کو اسی خوب صورتی سے پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جس سے عوام میں ان کا خاندانی وقار قائم رہتا ہے۔

(۳) خدا کی مہربانی اور مابدولت کی تربیت کے طفیل مرزا (جواں بخت) غیر معمولی طور پر باصلاحیت ہے۔ ساتھ ہی وہ مختلف زبانوں اور علوم و فنون پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرے شہزادوں کی مثال ایسی ہی ہے جیسے سورج کے مقابلے میں چراغ۔ عاقلوں کا قول ہے "کوئی بھی کام ان لوگوں کو سونپو جو اس کے اہل ہوں۔"

(۴) شہنشاہوں کے ہاں خصوصاً اور سرداروں میں عموماً یہ قاعدہ رہا ہے کہ وراثت اس شخص کو سونپی جاتی ہے جو سب سے زیادہ لائق ہوتا ہے۔ لہٰذا اکثر ایسا ہوا ہے کہ لیاقت کی بنا پر چھوٹا بیٹا بڑے پر سبقت لے گیا ہے۔ سعدی کا قول ہے۔ "بزرگی کا تعلق عقل سے ہے نہ کہ عمر سے۔"

(۵) سب سے زیادہ ٹھوس دلیل یہ ہے کہ جواں بخت کی اہلیت کے مدنظر مابدولت

کے باقی تمام بیٹے اس (جواں بخت) کے حق میں وراثت سے دست بردار ہو گئے ہیں۔ جب کہ اس کے بڑے بھائی SENTORS اپنے حقوق سے دست بردار ہو چکے ہوں تو پھر اس کے ولی عہد بننے میں کیا چیز مانع ہو سکتی ہے۔

(۶) علاوہ ازیں جواں بخت اور (مرزا قویش) میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس (مرزا قویش) کے ہم نوا عزت کی نظر سے نہیں دیکھے جاتے اور اس کی حرکات اور تفریحات شریفانہ نہیں ہیں۔ اس کی بے راہ روی کی یہی مثال کافی ہے کہ اس کی تنخواہ تک بند کر دی گئی ہے۔

(۷) حکومت برطانیہ نے چھوٹے فرزند (جواں بخت) کے لیے بیلپور کی وراثت تسلیم کر ہی لی ہے اور بھی بہت سی باتیں اس کے حق میں جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ بادشاہ کی خوشنودی کا خیال رکھتے ہوئے بھی ہر طرح یہی جائز اور حق بجانب ہے کہ مرزا (جواں بخت) کی ولی عہدی کا اعلان کر دیا جائے۔"۱۸۸ (انگریزی سے ترجمہ)

بادشاہ کا شقہ اور منسلکہ خط فریزر نے ۲۴ دسمبر ۱۸۵۶ء کو ہارن بل قائم مقام سیکرٹری حکومت شمال مغربی صوبہ جات کو روانہ کر دیا۔ فریزر نے اس کے ساتھ اپنا جو خط منسلک کیا اس میں یہ بھی لکھ دیا کہ جب تک گورنمنٹ کی طرف سے کوئی باقاعدہ جواب نہیں آتا میں اس بات کی بھی ضرورت نہیں سمجھتا کہ اس سلسلے میں بادشاہ کو کوئی تحریری جواب دوں۔ ہارن بل نے بادشاہ کے شقے اور فریزر کے خط کے جواب میں جو ہدایات فریزر کو بھیجیں ان میں سب سے زیادہ قابل توجہ بات یہ ہے:

"مجھے ہدایات دی گئی ہیں کہ میں آپ کو اطلاع دوں کہ آئندہ بادشاہ کی خط و کتابت کا جواب دینے کی چنداں ضرورت نہیں۔ حضور والا کو یقیناً اس حقیقت سے آگاہ ہونا چاہیے کہ گورنمنٹ اس سلسلے میں اپنے قطعی فیصلے کا اعلان کر چکی ہے۔"۱۸۹

فریزر کی جانب سے بادشاہ کے نام یہ خط ۱۳ جنوری ۱۸۵۷ء کو روانہ کیا گیا اور اس کے ٹھیک چار ماہ بعد بغاوت ہو گئی جس نے ہندوستان کی سیاست کی بساط ہی الٹ کر رکھ دی۔ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو جب باغی سپاہ دہلی پہنچی، تو دہلی پر سے عارضی طور پر انگریزوں کا تسلط

ختم ہوگیا۔ قلعۂ معلّا اور شہر باغیوں کے قبضے میں آگیا جنھوں نے بہادر شاہ کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ مرزا مغل انقلابی فوج کے سپہ سالار مقرر ہوئے اور تمام افواج کی قیادت انھیں سونپ دی گئی۔ مرزا مغل کے علاوہ مرزا خضر سلطان اور مرزا عبداللہ نے بھی اس تحریک میں نمایاں حصہ لیا[9]۔ مرزا جواں بخت کی عمر اس وقت پندرہ سولہ سال کے درمیان تھی[9]۔ اس لیے کچھ تو اس کی کم عمری نے اور کچھ زینت محل کی مصلحت کوشی نے اسے تحریک سے علاحدہ ہی رکھا۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت میں اگرچہ بہادر شاہ کو ہندوستان کا بادشاہ تسلیم کر لیا گیا تھا لیکن اس کے باوجود سیاسی اور سرکاری امور میں بادشاہ انقلابیوں کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہ تو کرتے تھے اور نہ کر سکتے تھے۔ مرزا مغل نے فوج کی قیادت، شہری انتظام اور امور مملکت میں اتنا بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کہ ان کی شخصیت کافی نمایاں ہو گئی۔ عام طور پر لوگوں کا خیال یہی تھا کہ انگریزوں پر فتح پا لینے کے بعد مرزا مغل ہی وہ واحد شہزادہ ہوگا جو سلطنتِ مغلیہ کی ولی عہدی کا مستحق سمجھا جائے گا۔ چناں چہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے زمانے کی اکثر تحریروں میں ایسے اشارے موجود ہیں کہ وہ لوگ، جنھیں مرزا مغل کے ولی عہد نامزد ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا، خود کو مرزا مغل کے خیر خواہوں اور حامیوں میں شمار کرنے لگے۔ بہت سے لوگ اس فکر میں رہنے لگے کہ کسی طرح مرزا مغل کے حلقۂ احباب میں شامل ہو جائیں۔ ایک خط سے اس رجحان پر اس طرح روشنی پڑتی ہے:

"حضرت صاحب عالم و عالمیان سلامت

بندہ عرض کرتا ہے

جناب عالی محلِ معلّا سے تعلق رکھنے والے اکثر لوگ ولی عہدی کے عہدے پر مقرر ہونے کے سلسلے میں تفوّل کے لیے اس فدوی کے پاس آئے اور دریافت کیا اور تفوّل بھی بندگان عالی کے نام پڑا۔ چناں چہ اس فدوی خاص نے تفوّل کی خوش خبری بندگانِ عالی کو دے دی۔ پس اس صورت میں یہ فدوی خسروانی تفضلات کا مستحق ہے اور امید کرتا ہے کہ ولی عہدی کے عہدے پر تقرری کے وقت فدوی کی پرورش فرمائی جائے گی تاکہ روٹی میسر آئے اور آپ کے اقبال کو دعا دوں۔

خدا کرے آفتابِ دولت تاباں اور درخشاں رہے۔

فدوی عبدالحکیم[192]

ایک اور خط میں بھی اسی قسم کی باتیں ہیں۔ یہ خط خلیفہ احمد جان، محمد جان، علی مرزا، ولی مرزا کی طرف سے ہے جو حافظ مرزا جان کے بیٹے تھے۔ انھوں نے مرزا مغل سے درخواست کی تھی کہ چوں کہ آپ ولی عہد ہونے والے ہیں لہٰذا ہمیں اپنی خدمت کا موقع دیں اور ہمارے وظیفے مقرر کر دیں۔ ان لوگوں نے یہ بھی کہا کہ مرزا مغل اپنے دستخط کی مہر کے ساتھ انھیں ایک طمانیت نامہ عطا کریں تاکہ ان کے ولی عہد بن جانے کے بعد یہ لوگ وہ طمانیت نامہ دکھا کر ان کے حلقہ مقربین میں داخل ہو سکیں[193]۔

مرزا مغل پر خود بھی یہ حقیقت آشکارا ہو چلی تھی کہ وہ موجودہ نظامِ حکومت کے ایک اہم رکن ہیں اور قطعی طور پر ولی عہد بنائے جانے کے مستحق ہیں۔ چناں چہ انھوں نے اور مرزا عبداللہ نے مشترکہ طور پر ایک خط بادشاہ کی خدمت میں بھیجا جس میں مبہم طور پر یہ لکھا تھا کہ انگریزوں پر فتح پا لینے کے بعد ان کا معاملہ حسبِ منشا طے ہونا چاہیے۔ اس خط کا مطلب یہی سمجھنا چاہیے کہ انھوں نے بالواسطہ طور پر ولی عہدی ہی کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ خط ۷ر جولائی ۱۸۵۷ء کو لکھا گیا تھا[194]۔ اس خط کا جواب بادشاہ نے انتہائی ہمدردانہ مگر قدرے مبہم لہجے میں ہی دیا۔ خط کی عبارت سے پتا چلتا ہے کہ بادشاہ، مرزا مغل سے خوش ہی نہیں تھے بلکہ بے پناہ اخلاقی دباؤ میں بھی تھے۔ یہ خط بادشاہ نے مرزا مغل کو ۱۵ر جولائی ۱۸۵۷ء کو لکھا۔ خط کی عبارت یہ ہے:

"برخوردار نامدار مرزا محمد ظہیر الدین عرف مرزا مغل بہادر کو معلوم ہو کہ ہر قدر کہ نظرِ تفضلاتِ خسروانہ برخوردار کے حال کی جانب تہِ دل سے مبذول ہے جو کچھ مناسب ہوگا گوارِ خاطر ہے۔ انشاء اللہ منصبِ ظہور، جلوہ نما ہوں گے۔ ہر طرح سے خاطر جمع رکھیں۔ زیادہ تفصیلات (کذا)

مرقوم ۳ر ذی الحجہ سنہ ۲۱ر معلّیٰ"[195]

(فارسی سے ترجمہ)

اس کے علاوہ ایک موقعے پر افسران نے بھی بادشاہ سے مشترکہ طور پر یہ درخواست کی تھی کہ شہر کے امن و امان اور نظم و نسق کو برقرار رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مرزا مغل کی ولی عہدی کا اعلان

کر دیا جائے۔[196] غرض حالات کچھ ایسے تھے کہ اگر یہ تحریک کامیاب ہو جاتی تو مغل حکومت کے اگلے بادشاہ شاید مرزا مغل ہی ہوتے۔[197] مرزا جواں بخت نے اس تحریک کا کوئی ساتھ نہیں دیا اور نہ شاید وہ اس کے اہل ہی تھے۔ بادشاہ کی جانب سے مرزا جواں بخت کی ولی عہدی پر اس وقت تک زور دیا جاتا رہا جب تک کہ یہ اختیار انگریزوں کے ہاتھ میں تھا۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے حالات بالکل بدل کر رکھ دیے۔ دیسی فوج کا تسلط اور اقتدار بڑھ گیا تھا۔ بادشاہ ان کے منصوبوں کو رد نہیں کر سکتے تھے اس لیے کہ وہ صرف شاہ شطرنج ہو کر رہ گئے تھے۔ مرزا مغل کے ہاتھوں میں فوج کی کمان تھی لہٰذا اب بادشاہ کے پاس نواب زینت محل بیگم کی اس بے جا خواہش کا کوئی جواز نہیں تھا کہ جواں بخت کو ولی عہد نامزد کیا جائے۔ بادشاہ نے اس کے بعد جواں بخت کی ولی عہدی کے بارے میں نہ تو کوئی کوشش کی اور نہ کسی خواہش کا اظہار کیا۔ ستمبر ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے دہلی کو فتح کر لیا۔ بخت خاں کو فرار ہو جانا پڑا۔ مرزا مغل، مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر کو ہڈسن نے گولی مار دی اور بادشاہ اپنی بیگم زینت محل اور جواں بخت کے ساتھ ہمایوں کے مقبرے میں پناہ گزیں ہو گئے۔[198]

جب میجر ہڈسن بادشاہ کو گرفتار کرنے کے لیے ہمایوں کے مقبرے پہنچا تو حفظ ما تقدم کے طور پر مقبرے میں خود داخل نہیں ہوا بلکہ مرزا الٰہی بخش کی معرفت بادشاہ اور بیگم کو یہ پیغام بھجوایا کہ وہ خود کو میجر ہڈسن کے حوالے کر دیں۔ اس کے جواب میں بادشاہ اور بیگم نے جو شرائط ہڈسن کے سامنے رکھیں ان میں قابلِ ذکر بات وہ ہے جو بیگم زینت محل نے کہلوائی۔ زینت محل نے انگریزوں کے سامنے پیش ہونے کی جو بنیادی شرط رکھی وہ بقول ہڈسن یہ تھی:

"بیگم نے مطالبہ کیا کہ ان کے لڑکے کو ولی عہد تسلیم کیا جائے اور اس کے لیے تخت سلطنت کی وراثت کی ضمانت دی جائے۔"[199] (انگریزی سے ترجمہ)

حیرت ہوتی ہے کہ ایسے حالات میں جب کہ بادشاہ کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے، سلطنت جاہ و حشمت، عزت و وقار سب خاک میں مل چکے تھے، اس وقت بھی زینت محل کو سب سے پہلی بات یہی سوجھی کہ جواں بخت کو ولی عہد بنا دیا جائے۔ یہ صورتِ حال جتنی افسوس ناک ہے اتنی ہی مضحکہ خیز بھی ہے۔ سانڈرس نے زینت محل کے بارے میں بالکل صحیح لکھا ہے۔

"اصل حقیقت یہ ہے کہ زینت محل اپنے لڑکے جواں بخت کی ولی عہدی کے لیے بہت زیادہ فکرمند تھیں۔ یہی اصل بنیاد ہے اس بات کی کہ وہ غدر کے دوران دربار کی سیاسی سازشوں سے الگ تھلگ رہیں۔" ۲۰۰

(انگریزی سے ترجمہ)

اٹھارہ سو ستاون کے ہنگامے ہی میں جواں بخت کے کردار پر پہلی بار روشنی پڑتی ہے۔ اب تک وہ اس ڈرامے کا ایک خاموش کردار تھا۔ اس کی حیثیت بس ایک کھلونے کی سی تھی۔ جس میں بہت کچھ دخل اس کی کم سنی کو تھا۔ والدین کا بے انتہا لاڈ پیار، صغرسنی کی شادی اور اس کی والدہ بیگم زینت محل کا اس کی شخصیت پر بھرپور تسلط، ان تمام چیزوں نے اس کی شخصیت کا کوئی نقش ابھرنے ہی نہیں دیا۔ بادشاہ اور زینت محل کا جو امتیازی سلوک اس کے ساتھ تھا اور ولی عہدی کے معاملے میں ہر شہزادے کے بالمقابل اسے جس طرح ممتاز رکھا گیا اس کی وجہ سے وہ اس پورے معاشرے میں جس کا وہ خود بھی ایک جزو تھا، اجنبی سا بن کر رہ گیا تھا۔ وہ شاید نہ کسی سے محبت کرنا جانتا تھا نہ نفرت۔ اٹھارہ سو ستاون کے ہنگامے کے دوران زینت محل بیگم یہ سوچتی رہی ہوں گی کہ اگر فتح ہندوستانیوں کی ہوگئی تو ولی عہد منتخب کرنے کا مکمل اختیار بادشاہ کو ہوگا اور وہ اپنے دباؤ سے جواں بخت کو ولی عہد بنوا لیں گی لیکن اگر اس جنگ میں انگریز جیت گئے تو یہ کہہ کر انگریزوں پر اپنی خیر خواہی اور وفاداری ثابت کریں گی کہ اس ہنگامے کے دوران وہ بالکل خاموش رہی ہیں۔ لیکن انگریزوں کی عیاری کے سامنے ان کی یہ تدبیر کارگر نہ ہو سکی اور انگریز، جیسا کہ سانڈرس نے خیال ظاہر کیا تھا، زینت محل کے کردار کو بخوبی سمجھ گئے تھے۔ ہنگامہ ختم ہو جانے کے بعد، جب کہ شاہی خاندان ابھی دلّی میں ہی اسیر تھا، ایک واقعہ اور ایسا سامنے آیا جو ایک بار پھر یہی ثابت کرتا ہے کہ جواں بخت اس ڈرامے کا سب سے اجنبی اور سب سے بے تعلق کردار تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے ماں باپ سے بھی بے تعلق تھا۔ جب بادشاہ اور ان کے خاندان کو ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار کر کے قید کر دیا گیا تو سانڈرس ان سے ملنے گیا۔ اس ملاقات کا حال وہ اس طرح بیان کرتا ہے:

"جب مجھے دوبارہ بادشاہ سے ملنے کا موقع ملا تو میں نے شاہی

زیورات کا مطالبہ کیا جو تھوڑی سی پس وپیش کے بعد بیگم نے پردے کے پیچھے سے نکال کر پیش کر دیے۔ جب میں بادشاہ کی جائے قیام سے رخصت ہونے لگا تو مرزا جواں بخت دروازے تک میرے پیچھے آئے اور بہت ہی مدھم آواز میں مجھ سے کہا کہ اگر میں ان کے والد اور والدہ کو نہ بتاؤں تو وہ اپنی والدہ کے مکان میں ایک ایسی خفیہ جگہ کا پتا بتا سکتے ہیں جہاں بہت سے جواہرات، روپیا پیسہ اور دیگر قیمتی اشیا دفن ہیں ...... چناں چہ تلاش کے بعد مجھے اپنی فوج کے اخراجات کے لیے اس سے کہیں زیادہ دولت ہاتھ آگئی جس کا وعدہ دگرفتاری کے وقت جاں بخشی کے وعدے پر مڈسن سے) بادشاہ اور بیگم نے کیا تھا۔" ۲۰۱

(انگریزی سے ترجمہ)

اس طرح مغل حکومت کے خاتمے کے ساتھ ساتھ وراثت کی یہ جنگ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

شیعت اور ایران دوستی

جب کمپنی نے بہادر شاہ کی مرضی کے خلاف مرزا جواں بخت کے بجائے مرزا فتح الملک عرف مرزا فخرو کو ولی عہد نامزد کر دیا تو بادشاہ انگریزوں کی طرف سے بہت کبیدہ خاطر ہو گئے۔ اس واقعے کے کچھ روز بعد لکھنؤ سے بادشاہ کے بھتیجے مرزا حیدر اور ان کے بھائی مرزا مراد دلی آئے اور انھوں نے بادشاہ سے ملاقات کی۔ یہ دونوں مرزا سلیمان شکوہ کے پوتے تھے اور خاندانی طور پر شیعہ تھے۔ بقول حکیم احسن اللہ خاں:

"مرزا حیدر کوئی معمولی آدمی نہیں تھا بلکہ وہ بادشاہِ دلی کا خاص رشتے دار یعنی بھتیجا تھا اور لکھنؤ سے ایک ہزار روپیا ماہوار وظیفہ پاتا تھا۔ وہ خاندانی شیعہ تھا اس کے دادا سلیمان شکوہ اور اس کے والد خان بخش دونوں شیعہ مذہب کے تھے۔" ۲۰۲

خیال ہے کہ مرزا حیدر ۱۸۵۲ء یا ۱۸۵۳ء میں دلی آئے ہوں گے۔ اس لیے کہ وہ مرزا فخرو کے ولی عہد نامزد ہونے کے بعد دلی آئے تھے اور انگریزوں کی طرف سے مرزا فخرو کی ولی عہدی

کا اعلان جون ۱۸۵۳ء میں کیا گیا تھا۔[۲۰۳] بہادر شاہ ظفر کے سیکرٹری مکند لال نے عدالت میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا:

"بادشاہِ دہلی دو سال گزرے جب برٹش گورنمنٹ سے بدظن ہو گئے تھے اور طے کر لیا تھا کہ وہ آئندہ انگریزوں کی بالکل خاطر اور عزت نہ کیا کریں گے۔ مفصّل حالات یہ ہیں کہ جب مرزا حیدر شکوہ اور مرزا مراد فرزندان مرزا جان بخش ابن مرزا سلیمان شکوہ لکھنؤ سے یہاں آئے تو شاہ حسن عسکری نے بادشاہ دہلی کو بادشاہِ ایران کے پاس خط روانہ کرنے کی رائے دی۔"[۲۰۴]

مکند لال کے اس بیان سے، جو اس نے بادشاہ کے مقدمے میں ۱۲ فروری ۱۸۵۸ء کو دیا، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا حیدر اور مرزا مراد دو سال قبل یعنی ۱۸۵۵ء میں دہلی آئے لیکن مکند لال نے دو سال کا عرصہ محض اندازاً بیان کیا ہے ورنہ ۱۸۵۶ء میں تو اودھ کا الحاق بھی ہو چکا تھا اور یہ اس سے پہلے کی بات ہے۔ اس لیے قیاس یہی کہتا ہے کہ مرزا حیدر شکوہ ۱۸۵۳ء کے آس پاس دہلی آئے ہوں گے۔ کہا جاتا ہے کہ ظفر کو اپنی علالت کے دوران ایک بار بشارت ہوئی تھی کہ وہ حضرت عباس کی درگاہ میں علم چڑھائیں۔ مرزا حیدر شکوہ سے منسوب ایک خط میں اس واقعے کا ذکر اس طرح ملتا ہے:

"میں کلکتے میں تھا اور مجھے شاہی شقّہ پہنچا جس میں خواب کا بیان اور حضرت کی درگاہ میں علم چڑھانے کا ذکر تھا۔ اس کے بعد جب میں حاضر ہوا تو پھر خواب دیکھنے کا حال بیان فرمایا اور اہلِ بیت کی محبت کا اظہار اور تعمیر امام باڑہ کا قصد برائے تعزیہ داری سیّد الشہدا مثل اپنے جدّ اعلا امیر تیمور صاحب قران بیان کیا۔"[۲۰۵]

اسی خط کی عبارت سے ملتی جلتی ایک خبر دہلی اُردو اخبار میں اس طرح دیکھنے کو ملتی ہے:

"چہار شنبہ کو حضور والا نے نقشا ایک علم کا بیت تحفہ اپنے ہاتھ سے مع طغرائے اسم مبارک حضرت عباس علیہ السلام کے کھینچ کر کاری گروں کو دیا، اور حکم ہے جلد تیار کرو۔ اور صاحب عالم مرزا نور الدین بہادر سے حضور والا نے فرمایا

کر تم جا کے لکھنؤ میں بآدابِ شائستہ درگاہ میں جناب عباس علیہ السلام کے چڑھا کے جلد پھر حضور میں حاضر ہو۔ سنا جاتا ہے کہ اس کی بشارت ہوئی تھی"۔ ۴ ستمبر ۱۸۵۳ء[۲۰۶]
دہلی اردو اخبار کی ایک اور خبر سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ دہلی کے لوگ شیعت کی جانب بادشاہ کے اس رجحان سے خوش نہیں تھے۔ اخبار لکھتا ہے :

"بدھ کے دن مرزا عالی بخت کے مکان میں (بادشاہ) شریک مجلس ہوئے اور دیر تک مرثیے سنے اور آپ بھی فضیلتِ ائمہ بیان کرتے رہے اور جمعرات کو علم جو حضور والا نے تیار کروایا ہے اور وہ بہت خوب صورت بن کر آیا ہے، حضور والا نے کمال آداب و قرینے سے اپنے سرِ مبارک پر رکھا اور صاحبِ عالم مرزا نورالدین بہادر کو وہ علم سپرد کر کے بہ سبیل ڈاک لکھنؤ رخصت کیا۔ ہر چند علم مبارک کے بنانے پر اکثر آلِ تیمور مغفور مانع بھی رہے مگر حضور نے کسی کی بھی نہ سنی اور جو ذہن مبارک میں آیا وہی کیا۔ بعض لوگ اس بات سے بہت رنجیدہ ہوئے کہ حضور والا سے ان کے برخلاف یہ امر جلیل ہوا ہے بلکہ حضور والا نے اکثر اپنی زبان مبارک سے حاضرین دربار معلّا سے فرمایا کہ اکثر آلِ تیموری اور اشخاص نے مجھ سے عرض کی کہ اس علمِ مبارک کے بنانے میں اور لکھنؤ بھیجنے میں آپ رافضی مشہور ہوں گے، میں نے جواب دیا کہ مجھ کو الفتِ پنجتن پاک میں سب باتیں منظور ہیں اگر ان کی محبت سے آدمی رافضی ہوتا ہے تو جو جس کا جی چاہے کہے۔ کہنے والے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔"[۲۰۷]

۹ اکتوبر ۱۸۵۳ء

دہلی اردو اخبار کی اس عبارت سے یہ بات پتا چلتی ہے کہ بادشاہ کے لکھنؤ علم بھیجنے پر قلعے اور شہر کے لوگ ناخوش تھے اس لیے کہ بادشاہ کے ایسا کرنے سے وہ رافضی مشہور ہو سکتے تھے۔ بہرحال — لکھنؤ پہنچ کر مرزا حیدر نے شاہ عباس کی درگاہ میں بادشاہ کی طرف سے ایک علم چڑھایا اور مجتہد کو ایک رقعہ پنسل سے لکھا ہوا دیا جس پر بادشاہ کی مہر ثبت تھی۔ اس میں تحریر تھا کہ بادشاہِ دہلی نے شیعہ عقائد اختیار کر لیے ہیں"۔ جب یہ خبر دہلی پہنچی تو کچھ علما، بادشاہ

کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے اس کی وضاحت چاہی۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ مرزا حیدر نے اپنے ہاتھ سے مہر لگائی تھی اور انھوں نے اپنے ہی ہاتھ سے یہ رقعے لکھے تھے۔ بادشاہ نے اس بات کو قبول کیا کہ انھوں نے ایک فرمان مجتہد کو ضرور بھیجا تھا لیکن اس میں صرف یہ لکھا تھا کہ وہ اہل بیت سے محبت کرتے ہیں اور جو ان سے محبت نہ کرے وہ مسلمان نہیں۔ دراصل بہادر شاہ ظفر ایک وسیع المشرب انسان تھے۔ وہ ہندوؤں کے جذبات کی بھی قدر کرتے تھے اور ان کی بعض رسوم بھی ادا کرتے تھے اسی طرح شیعت کے بارے میں بھی ان کے دماغ میں کسی طرح کا تعصب نہ ہوگا۔ ہوسکتا ہے انھوں نے شیعت کی بعض خوبیوں کو سراہا بھی ہو لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ انھوں نے شیعہ مذہب قبول کر لیا تھا۔ چناں چہ جب لکھنؤ سے مرزا بلند بخت نے بادشاہ کو ایک عرضی میں یہ لکھا کہ حضور والا نے شیعت قبول کر کے بڑی ناسمجھی کا ثبوت دیا ہے تو اس کے جواب میں بادشاہ نے فوراً ہی ایک شقہ جاری کرنے کا حکم دیا کہ یہ خبر مرزا حیدر شکوہ کے دماغ کی اختراع ہے جو سراسر غلط ہے۔[209] چناں چہ بادشاہ کی جانب سے ایک شقہ حسب ذیل مضمون کا جاری کیا گیا جس میں بادشاہ نے اپنے شیعہ ہونے سے انکار کیا:۔

"سر بہ مہر

حقائق آگاہان معارف دست گاہِ سالکان مسالکِ حقیقت ناہجان مناہجِ طریقت حضرتِ غلام نظام الدین و سید عبداللہ و علاؤالدولہ، سید محی الدین خاں و سید حسن عسکری و میاں نیاز احمد صاحبان کو معلوم ہو کہ حضور کی نسبت جو مذہب اہل سنّت کو ترک کرنے اور مذہب شیعہ اختیار کرنے کی تہمت کے بارے میں کہا گیا ہے اور جو آئینِ دین و اسلام کے منافی ہے اور گمراہی کی خبر دیتا ہے اس اندیشے کا تصور قطعی طور پر باطل ہے جس کا نتیجہ گمراہی اور ضلالت کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ اور یہ بات صداقت سے کوسوں دور ہے۔ یہ فاسد خیال تک ہرگز ذہن میں آنا ممکن نہیں کجا کہ اس گمراہی کا راستہ اختیار کیا جائے۔ خداوند کریم کی قسم کہ جو سب سے بڑا جاننے والا ہے کہ حضور پر نور کے عقائد میں اصلاً اور مطلقاً کوئی فتور یا فساد واقع نہیں ہوا۔ یہ تمام مرزا حیدر شکوہ اور مرزا نورالدین

کی اختراع دروغ ہے کہ محض حسد کی بنا پر حضور کو بدنام کرنے کے لیے ایسا کیا گیا ہے اور اگر خدانخواستہ حقیقت میں ایسی کوئی بات ہوتی تو ان امور کی ادائگی میں کیا چیز مانع ہو سکتی تھی کہ لکھنؤ ہی میں ایسا ہوتا۔ یہی بات ان جھوٹی خبروں کو باطل ٹھہرانے کے لیے کافی ہے۔ ان جھوٹی خبروں پر جو حضور سے منسوب کی گئی ہیں، اعتماد نہ کیا جائے کہ یہ محض جھوٹ ہے اور وہ لوگ جن سے اس معاملے کے بارے میں پوچھا گیا ہے انھیں اطمینان خاطر ہونا چاہیے کہ اس مکتوب کے ذریعے ان کے جھوٹے دعوے کو باطل قرار دیں۔ فقط۔[۲۱۰]"

بہادر شاہ ظفر کے مقدمے میں اکثر گواہوں نے یہ بات کہی تھی کہ بادشاہ، پیرزادہ حسن عسکری کے بہت معتقد تھے اور حسن عسکری نے بادشاہ کو ذہنی طور پر اپنی گرفت میں لے رکھا تھا اس کے ساتھ ہی یہ بیان بھی دیا گیا کہ پیرزادہ حسن عسکری اور حیدر شکوہ کی صلاح سے شاہ ایران کو خطوط لکھے گئے۔ اور انھی ایام میں بادشاہ نے شیعہ مذہب قبول کیا۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ بادشاہ، پیرزادہ حسن عسکری کے اثر میں تھے، ان کے بے پناہ معتقد تھے اور ہر بات ان کی صلاح و مشورے سے کرتے تھے تو شاید اس بات میں شبہے کی گنجائش کم ہے کہ انھوں نے شیعہ مذہب بھی قبول کر لیا تھا لیکن معاملہ یہ ہے کہ حسن عسکری بظاہر نام سے تو شیعہ معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل وہ چشتیہ سلسلے کے ایک صوفی بزرگ تھے۔ اور صوفی شاہ سلیمان کے خاص مریدوں میں تھے۔[۲۱۱] بادشاہ کا شیعہ ہونا دو ہی صورتوں میں سمجھ میں آ سکتا ہے: ایک تو یہ کہ حسن عسکری خود شیعہ ہوتے یا پھر اعلا مرتبے کا کوئی دوسرا شیعہ عالم بادشاہ کے اسی قدر قریب ہوتا جتنا کہ حسن عسکری تھے۔ بادشاہ کو اس الزام کی تردید کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ انھیں دہلی کی رائے عامہ کا پاس تھا اس لیے کہ دہلی میں اسی طرح سنّیوں کا غلبہ تھا جس طرح لکھنؤ میں شیعوں کا تھا۔[۲۱۲]

مکند لال اور احسن اللہ خاں کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا حیدر شکوہ دہلی اس لیے آئے تھے کہ بادشاہ سے شیعہ مذہب قبول کروا کے لکھنؤ اور دہلی کے بادشاہوں میں گہرا ربط پیدا کر دیں اور اس کے بعد ایران کے بادشاہ کو بھی، جو شیعہ تھا، اپنی مدد کے لیے ہموار کرنے کی کوشش کریں۔ گویا دہلی، لکھنؤ اور ایران یہ ایک ایسا مثلث قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی

جو اہلِ تثلیث کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کو روک سکے۔ ہوسکتا ہے کہ ایران کے بادشاہ سے مدد لینے کا خیال بہادر شاہ ظفر کے دل میں گزرا ہو لیکن اس طرح کے کوئی ثبوت فراہم نہیں ہیں کہ انھوں نے اس معاملے میں کوئی عملی قدم اٹھایا تھا۔ البتہ بادشاہ کے شیعہ مذہب قبول کرنے کا چرچا، انگریزوں اور ایرانیوں کی جنگ اور مرزا حیدر شکوہ کے ذریعے دہلی اور لکھنؤ کی حکومتوں کے درمیان ربط پیدا ہونے کے امکانات، ان تمام چیزوں نے مل کر اس شبہے کی فضا پیدا کر دی تھی کہ بادشاہِ دہلی شاہ ایران کے ساتھ کچھ خفیہ ساز باز کر رہے ہیں۔[۲۱۳] بہادر شاہ ظفر کے مقدمے میں بھی اس پہلو کو بہت زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی لیکن یہ الزام ان پر کسی طرح ثابت نہیں ہو سکا۔ چناں چہ بادشاہ پر جو جرم ثابت ہوئے ان میں ایران کے ساتھ ساز باز کرنے کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

بہادر شاہ ظفر کے مقدمے میں مکند لال اور حکیم احسن اللہ خاں نے شاہ ایران کے ساتھ خط و کتابت کے معاملے پر کافی تفصیلی بیانات دیے ہیں لیکن اگر دونوں کے بیانات کا جائزہ لیا جائے تو ان میں بجائے خود تضاد موجود ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اس الزام کا اضافہ مقدمے میں محض اس لیے کیا گیا تھا تاکہ بادشاہ پر زیادہ سے زیادہ جرم عائد کر کے انھیں خطاوار ثابت کیا جا سکے۔ مکند لال کا بیان ہے:

> "شیدی قنبر کو زادِ راہ کے لیے ایک سو روپیے محبوب علی خاں کی معرفت ادا کیے گئے اور وہ خط مذکور لے کر ایران روانہ ہو گیا۔ اس کے بعد مرزا حیدر اور اس کا بھائی لکھنؤ واپس چلے گئے جہاں انھوں نے مرزا نجف، بادشاہ کے ایک دوسرے رشتے دار کو...... ویسا ہی ایک خط دے کر ایران روانہ کیا۔"[۲۱۴]

مکند لال کے بیان کے مطابق بادشاہ نے پہلے شیدی قنبر کو ایران روانہ کیا۔ اس کے بعد جب مرزا حیدر شکوہ لکھنؤ پہنچے تو انھوں نے بادشاہ کے ایک رشتے دار مرزا نجف کو بھی ایک خط شاہ ایران کے نام لکھ کر ایران روانہ کیا۔ اس کے برعکس احسن اللہ خاں کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے مرزا نجف کو ایران بھیجا گیا تھا اور جب کافی عرصہ گزر گیا تو شیدی قنبر کو اس لیے روانہ کیا گیا کہ وہ مرزا نجف کے پاس جا کر پچھلی خط و کتابت کا جواب لائے۔ احسن اللہ خاں کا بیان ہے:

"چند ماہ بعد شیدی قنبر نے حج کی تیاری کی اور مکہ جانے کی اجازت چاہی۔ پیرزادہ حسن عسکری کی معرفت رخصت مل گئی اور زادِ راہ کے لیے کچھ خرچ بھی دیا گیا....... خواجہ سراؤں سے خفیہ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ دراصل وہ ایران گیا ہے اور پیرزادہ حسن عسکری کی معرفت رات کے وقت اسے چند کاغذات دیے گئے تھے، جن میں بادشاہِ دہلی کی مہر ثبت تھی۔ اس سے مجھے معلوم ہوتا ہے کہ شیدی قنبر، مرزا نجف کے پاس گیا تھا کہ پچھلی خط و کتابت کا جواب لائے۔"[215]

حسن عسکری نے اپنے بیان میں ان تمام معاملات سے لاعلمی ظاہر کی۔ یہاں تک کہ انھوں نے سرے سے شیدی قنبر کے وجود ہی سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ۹ فروری ۱۸۵۸ء کو مقدمے کی آٹھویں روز کی کارروائی میں پیرزادہ حسن عسکری اور عدالت کے درمیان اس معاملے پر اس طرح سوال و جواب ہوئے:

"سوال: کیا تم ایامِ غدر میں دہلی میں تھے اور اگر تھے تو کیا کام کرتے تھے؟

جواب: جی ہاں میں دہلی میں تھا۔ میرا کام پیری مریدی تھا۔ ایک موقعے پر بادشاہ بیمار ہوئے اور کئی درویش دعا کرنے کے لیے لائے گئے۔ اس وقت مجھے بھی طلب کیا گیا تھا۔ جب میں نے کچھ دعائیں پڑھ کر دم کیں اور بادشاہ نے شفا پائی تو اکثر مجھے طلب کرنے لگے لیکن بار بار کی طلبی سے عاجز آکر میں نے بادشاہ سے التجا کی کہ آئندہ مجھے نہ طلب کیا جائے۔ اس وقت بادشاہ نے قسم کھا کر وعدہ کیا کہ اب وہ صرف اس وقت بلایا کریں گے جب بہت سخت بیمار ہوں گے۔

سوال: کیا شیدی قنبر شاہی ملازم کو تم جانتے ہو؟

جواب: میں بادشاہ کے اکثر مسلح حبشی ملازمین کو صرف صورت سے پہچانتا ہوں۔ دو تین کے نام بھی جانتا ہوں مگر شیدی قنبر ان میں سے نہیں ہے۔

سوال: عدالت ہٰذا کے روبرو شہادت دی گئی ہے کہ تم نے ایک حبشی شیدی قنبر کو شاہِ دہلی کا خط دے کر شاہِ ایران کے پاس روانہ کیا۔ تم اس بات کی بابت کیا کہتے ہو؟

جواب : میں اس معاملے میں کچھ نہیں جانتا۔"[216]

نصرت نامہ گورنمنٹ کے مؤلف نے، جو بہادر شاہ کا ہم عصر ہے 'غدر' کے چشم دید حالات بیان کرتے ہوئے پیرزادہ حسن عسکری کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی یہ پتا نہیں چلتا کہ حسن عسکری نے بہادر شاہ ظفر کو شاہ ایران سے ساز باز کرنے پر اکسایا تھا یا شیدی قنبر کو ایران بھجوایا تھا۔ مؤلف ہٰذا نے ایک واقعے کا مبہم سا ذکر کیا ہے لیکن اس سے بھی کسی طرح ایسا کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا جس سے مکند لال یا حکیم احسن اللہ خاں کے بیان کی تائید ہوتی ہو۔ اس کے علاوہ نجف خاں کا ایران بھیجا جانا مکند لال اور حکیم احسن اللہ خاں دونوں کے بیان کے مطابق 'غدر' سے قبل ظہور میں آیا جب کہ نصرت نامہ گورنمنٹ کے مطابق نجف خاں' بادشاہ کے حضور ہنگامہ 'غدر' میں حاضر ہوا :

"غدر کے ہنگامے میں نجف خاں جرنیل ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے دو کمبل اور ایک تلوار بطور تبرک نجف خاں کو دی اور ایک خط بھی جو کسی امیر کے نام تھا فوج کی فراہمی کے لیے لکھا تھا۔ اس جرم میں پندرہ شوال ۱۲۷۴ھ کو ہفتے کے دن پھانسی دے دی گئی۔"[217]

نصرت نامہ گورنمنٹ 'غدر' کے بعد اس وقت لکھی گئی جب کہ باغیوں کے مقدمے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ اور تمام حقائق صاف ہو کر سامنے آچکے تھے۔ اس لیے کتاب ہٰذا کے مؤلف غلام حسن خاں نے شیدی قنبر اور حسن عسکری کے معاملے کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ شاید اسی لیے کہ یہ فرضی باتیں تھیں اور پھر مقدمے میں بادشاہ پر جو جرم عائد کیے گئے تھے ان میں سے شاہِ ایران کے ساتھ ساز باز کرنے کا جرم ان پر ثابت نہیں ہوا تھا۔

شہر میں جب بادشاہ کے شیعہ مذہب قبول کرنے کی خبر گرم ہوئی تو اس نے طرح طرح کی افواہوں کو جنم دیا۔ جن میں سب سے زیادہ اس بات نے شہرت پائی کہ چوں کہ بادشاہ نے شیعہ مذہب قبول کر لیا ہے لہٰذا اب شیعہ ہونے کے ناتے شاہِ ایران' بادشاہ کی مدد کو آئیں گے۔ اور انھیں انگریزوں کے چنگل سے آزاد کریں گے۔ چناں چہ' غدر' کے زمانے کے اخبارات میں بھی اس قسم کی خبریں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ البتہ اتنا ضرور تھا کہ اس قسم کی خبر شائع کرتے ہوئے

اخبار کے اڈیٹر خبر پر شبہے کا اظہار ضرور کر دیا کرتے تھے۔ مارچ ۱۸۵۷ء میں شاہِ ایران کی طرف سے جاری کیے گئے ایک اعلان کی کاپیاں گلیوں اور سڑکوں پر چسپاں کر دی گئی تھیں۔ ۱۹ر مارچ ۱۸۵۷ء کے صادق الاخبار میں اس اعلان کا خلاصہ اس طرح شائع ہوا تھا:

"جو لوگ مذہبِ حق کا دعویٰ کرتے ہیں، ان کا فرض ہے کہ عیسائیوں کی مدد نہ کریں اور حق وراست پر ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی ترقی میں اپنی تمام طاقت صرف کر دیں اور وہ وقت قریب آ رہا ہے جب کہ مابدولت (شاہِ ایران) تخت پر متمکن ہوں گے اور رعایا کو اتنا ہی خوش حال بنا دیں گے جتنا کہ انگریزوں نے مفلوک الحال کر کے ذریعۂ معاش سے محروم کر دیا ہے۔ پس ہم خود کو ان کی ترقی اور بہبودی کی طرف متوجہ کریں گے۔ ہم کسی کے مذہب میں دخل نہیں دیا کرتے اور نہ وہاں دیں گے۔"[۲۱۸]

آگے چل کر اس اخبار کا اڈیٹر لکھتا ہے:

"ایک شخص محمد صادق نامی جس کے ذریعے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ ۹ر تاریخ تک انیس ہزار ایرانی سپاہی مع چند افسران کے ہندوستان میں داخل ہو چکے ہیں اور خاص دہلی میں پانچ سو سپاہی تبدیل لباس میں مختلف صورتوں میں موجود ہیں، وہ اپنی نسبت کہتا ہے کہ ۴ر مارچ کو میں دہلی پہنچا جہاں اعلان چسپاں کر دیے گئے تھے۔ اس کا بیان ہے کہ ہر حصۂ ملک سے اس کے پاس خبریں آتی رہتی ہیں اور وہ ہر شہر کی باقاعدہ اطلاع شاہ ایران کے پاس روانہ کرتا رہتا ہے۔ آئندہ وہ ایرانی فوج کی نقل و حرکت بذریعۂ اعلان ہر فرد و بشر پر ظاہر کر دیا کرے گا۔

لوگ کہتے ہیں کہ اعلان چند بے فکروں کا گھڑا ہوا ہے اور میں بھی ان کا ہم خیال ہوں کہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ محمد صادق کے آخر دہلی آنے کا مدعا کیا ہے؟ اگر اس کا مقصد جنگ ہے تو اس طریقے سے اس کا آنا بے سود ہے۔ اگر وہ جاسوس کی حیثیت سے آیا ہے تو اپنے آنے کو مشتہر کرنا بالکل بے عقلی

اورمشن کے اخراجات میں بے کار روپیا ضائع کرنا ہے۔"[219]

اس کے بعد ۲۲ مارچ ۱۸۵۷ء کے صادق الاخبار میں اس خبر کا ذکر کرتے ہوئے اوڈیٹر لکھتا ہے :

"سابق میں چند مفسدین نے دہلی میں ہنگامہ برپا کرنے کے لیے یہ سمجھ کر کہ شہرت ہوگی، جامع مسجد کی پشت پر ایک اعلان شاہ ایران کی طرف سے منسوب کرکے پبلک کو مغالطے میں ڈالنے کے لیے چسپاں کر دیا تھا۔ اس اعلان کا لب لباب یہ تھا کہ ہندو مسلمان دونوں عیسائیوں کی مدد نہ کریں اور شاہ ایران عنقریب ایران فتح کرے گا اور لوگوں کو انعام و اکرام دے کر خوش کرے گا۔ جس شخص نے یہ اعلان مشتہر کیا ہے اپنا نام محمد صادق بتاتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اس لغو و لایعنی بات سے حکام دہلی بہت خفا ہیں۔ مجھے یقین ہے جو شخص اس جعل ساز کاذب کو گرفتار کرے گا خاطر خواہ انعام پائے گا لیکن خدا معلوم وہ اب ہاتھ بھی آئے گا یا نہیں۔"[220]

صادق الاخبار کے علاوہ خلاصۃ الاخبار نے بھی اس قسم کی خبریں شائع کی تھیں اور اس اخبار کے مدیر نے بھی ان خبروں کی صداقت پر شبہ ظاہر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ 'محرر اخبار ان تمام باتوں کو خرافات اور حمق پر مبنی سمجھتا ہے'۔[221]

مرزا حیدر شکوہ کا دہلی آنا، بادشاہ کے شیعہ مذہب قبول کرنے کی خبر کا پھیلنا اور اخبارات میں ان خبروں کا چھپنا کہ شاہ ایران عنقریب ہندوستان پر حملہ آور ہوگا اور بادشاہ دہلی کو انگریزوں کے چنگل سے نجات دلائے گا، ان تمام باتوں سے انگریزوں کو بادشاہ کے خلاف ایک اور الزام تراشنے کا موقع مل گیا اور انھوں نے اس سلسلے میں اپنے وفاداروں سے بادشاہ کے مقدمے میں ان کے خلاف طرح طرح کے بیانات دلوا ڈالے۔ تاہم یہ الزام پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکا۔

ایامِ غدر میں ایک اشتہار شاہزادۂ ایران کے خیمے سے نکلا تھا جس میں شاہ ایران کی جانب سے ایک طویل اعلان جاری کیا گیا تھا۔ صادق الاخبار نے یہ اعلان[222] نقل کیا ہے جو اس طرح ہے :

" صادق الاخبار　　　　　　مطبوعہ سیز دہم ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ

جلد چہارم　　　　　　مطابق ۷ر جولائی ۱۸۵۷ء

اعلام شاہ ایران

زبانی ایک آیندہ کی مدرک ہوکہ شاہ نصیرالدین والی ایران نے ایک اعلام جاری کیا ہے۔ مضمون اس کا یہ ہے کہ تمام سپاہ فارس سرحداتِ ملک ایران میں برائے مقاتلۂ دشمنانِ مذہب یعنی انگریزان' اور اقوام عرب کو چاہیے کہ فرمان برداری کریں کلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی' کلامِ پیغمبر میں فرمایا ہے آنحضرتؐ نے کہ قتل کر رنج دینے والے کو کہ جس طرح وہ تیرے رنج دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اب چاہیے کہ تمام پیر و جوان خورد و کلاں، عقل مند اور جاہل، کسان اور سپاہی بغیر از تامل تائید کریں اپنے ہم مذہبوں کی اور ہتھیاروں سے جسم کو آراستہ کر رکھیں اور ایک جھنڈا احمدی لگادیں اور تمام ہم قوم کو جہاد کی اطلاع دیں۔ خدا کے نام پر کہ وہ برکت دے گا غازیوں کو اور ہم ان سے نہایت خوش ہوں گے ...... اضلاع افغانستان وغیرہ کو فتح کرتے ہوئے آگے بڑھیں اور زیر حکم سردار سلطان احمد خاں اور سردار شاہ دولہ خاں اور سردار سلطان علی خاں اور سردار محمد حاکم خاں ہندوستان کو جائیں۔ خدا نے چاہا تو فتحِ ہند ہوگی اور انگریزوں کا ٹھکانہ لندن سے ورے نہ رکھیں۔ پس اب یہ وقت ہے کہ باشندے اس ملک اور افغان و اہل ہند جو کہ قرآن شریف پر ایمان رکھتے ہیں اور فرمودۂ پیغمبر خداؐ پر چلتے ہیں الم نشرح جہاد کریں اور دین کا ساتھ دیں اور اپنے مسلمانوں کے دست گیر بنیں کہ اس میں مفادِ دین و دنیا متصور ہے۔ لازم کہ جمیع اہل اسلام اس میں کوشش کریں اور تمام اقوام افغانستان اور ہند کو روشن ہو کہ شاہ ایران کا یہ ارادہ نہیں کہ ملک افغانستان کو فتح کرکے شامل ممالک محروسہ کرے بلکہ اصل منشا یہ ہے کہ قندھار سردار محمد علی خاں اور کہندل خاں کے کنبے میں سے اور کابل امیر دوست محمد خاں ماتحت حکومت اور ہند زیر حکم خاندانِ تیموریہ۔ امیر کو چاہیے کہ بمصلحت رشتے' داران خود تائید اسلام

کریں اور لاکھ روپیہ ماہوار کا لالچ دل سے دور کرے۔ حدیث: کیوں کہ فرمایا
حضرت پیغمبر نے کہ جو کوئی اہلِ مذہب کی مدد کرے گا ثمرہ اس کا نیک پاوے گا اور
قبل از اجرا۔ اس اشتہار کے امیر دوست محمد خاں کہا کرتا تھا کہ اگر سپاہ ایران
انگریزوں پر چڑھائی کرے گی تو میں زور زور سے اس کا شریک ہوں گا اب وہ
وقت آن پہنچا ہے سو امیر دشمنانِ اہلِ اسلام کو ہلاک کرے جہاں تک ہو سکے
اس سے بہتر کوئی نعمتِ عظمیٰ نہیں۔ کس لیے؟ کہ اگر مر جائے تو رتبہ شہادت کا
پائے اور اگر زندہ بچے تو غازی کہلائے۔ بہرحال جہاد بہت اچھی چیز ہے۔ اگر
خدانخواستہ امیر نے اس کے خلاف کیا تو بے شک وہ کرستان کہلائے گا اور عنقریب
اس پر غضبِ خدا آئے گا اور شاہ ایران نے ایک نامہ بھی امیر دوست محمد کے
پاس اس مضمون کا بھیجا ہے۔ امیر تو انگریزوں سے شریک ہو کر بے ایمان ہو گیا۔
مگر ہم از راہِ مسلمان تجھ کو فہمائش کرتے ہیں کہ اس قوم سے علیحدہ ہو اور ہم سے
مل کر تدبیر غارت کرنے انگریزوں کی کر اور کل اہلِ اسلام یہی کہتے ہیں کہ
امیر نے انگریزوں سے مل کر مسلمانوں کا نام ڈبویا اگر تجھ کو طمع زر ہے تو ہم سے
دو چند لے اور کیا تو نے نہیں سنا کہ اس قوم نے ہندوستان کے شہزادوں اور
امیروں سے کیا کیا ...."[۲۲۳]

یہ اعلان اگرچہ کافی طویل ہے اور اس میں تفصیل کے ساتھ بہت سی چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے لیکن پھر بھی اس اعلان سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ بہادر شاہ ظفر اور شاہ ایران کے درمیان کوئی خفیہ ساز باز ہو رہی تھی۔ اس اعلان کا ذکر کرتے ہوئے رسالہ اسبابِ بغاوت ہند میں سرسید نے لکھا ہے:

"اشتہار جو مشہور ہے کہ شاہ زادے ایران کے خیمے میں سے نکلا اس کا کوئی لفظ ہندوستان کی سازش پر دلالت نہیں کرتا۔ اس کا مضمون صاف اپنے ملک کے لوگوں کو ترغیب کا ہے۔ ہندوستان کی خرابی کا ذکر اس بنیاد پر ہے کہ ایرانیوں کو زیادہ تر آمادگی لڑائی پر ہو اس مطلب سے نہیں کہ ہندوستان سے سازش ہو چکی تھی۔"[۲۲۴]

سرسید نے تو بلکہ یہاں تک کہا ہے کہ اگر بالفرض بادشاہ نے شاہ ایران کے نام کوئی فرمان بھیجا تو بھی وہ سرکشی کی بنیاد نہیں ہو سکتا۔ وہ لکھتے ہیں:

"دلی کے معزول بادشاہ کا ایران کو فرمان لکھنا ہم کچھ تعجب نہیں سمجھتے ...
.... مگر حاشا کہ وہ کسی طرح بھی سازش کی بنیاد ہو۔ کیا تعجب نہیں آتا کہ اتنی بڑی سازش اور اتنی مدت سے ہو رہی ہو اور ہمارے حکام بالکل بے خبر رہیں سرکشی کے بعد بھی کیا فوجی اور کیا ملکی کسی باغی نے بھی آپس میں کسی قسم کی سازش کا کبھی تذکرہ نہیں کیا حالاں کہ سرکشی کے بعد ان کو کس کا ڈر تھا"[225]

غرض کسی بھی طرح یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی کہ بہادر شاہ ظفر نے شیعہ مذہب قبول کر لیا تھا یا یہ کہ انھوں نے شاہ ایران کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف کوئی سازش کی تھی۔ ذکاء اللہ کا خیال ہے کہ ان دنوں اخبارات میں جو خبریں شائع ہوتی تھیں وہ زیادہ تر جھوٹی اور بے بنیاد ہوتی تھیں۔

"جب ۱۸۵۷ء کے شروع میں برٹش گورنمنٹ اور شاہ ایران کے درمیان لڑائی ہوئی تو اوپر کی سب باتیں ظہور میں آئیں مگر اس میں یہ نیا شگوفہ کھلا کہ بادشاہِ دہلی اور شاہِ ایران کے درمیان برٹش گورنمنٹ کے خلاف سازش ہوئی۔ اس لیے جب بہادر شاہ قید ہوا تو اس کی تحقیقاتِ جرائم میں اس سازش کے باب میں بھی بال کی کھال نکالی گئی۔ جس کا ماحصل یہ ہوا کہ یہ سازش نہ تو بالکل جھوٹی کہانی نکلی اور نہ وہ ایسی مستند شہادت سے ثابت ہوئی کہ ایک تاریخی واقعیت سمجھی جاتی۔"[226]

اگر واقعی بہادر شاہ ظفر اور شاہ ایران کے درمیان پہلے سے کوئی ساز باز ہوتی یا بادشاہ نے اپنا کوئی ایلچی ایران بھیجا ہوتا تو ایامِ غدر میں وہ اس کا تذکرہ باغی افسران سے ضرور کرتے اور اس بحرانی دور میں ضرور شاہ ایران سے مدد طلب کرنے کی کوشش کرتے، لیکن پوری تحریک کے دوران شاہ ایران کی مدد کا سوال یا اس نامہ و پیام کا ذکر، جو بادشاہ اور شاہ ایران کے درمیان بتایا گیا، کہیں نہیں آیا، یہاں تک کہ انگریزوں نے دہلی فتح کر لی۔ بادشاہ اور دوسرے

سیاسی قیدی چار ماہ حوالات میں بند رہے، اس کے بعد تین مہینے تک مقدمہ چلتا رہا، اور مقدمے کے دوران اچانک مکند لال اور حکیم احسن اللہ خاں نے (غالباً انگریزوں کے ایما پر ہی) یہ انکشاف کیا کہ بہادر شاہ، ایران کے بادشاہ کے ساتھ ساز باز کر رہے تھے۔ معاصرین نے اس سلسلے میں جو بھی کچھ لکھا ہے اس میں بادشاہ کی ایران دوستی کا کہیں کوئی ذکر نہیں۔ سر سید نے چوں کہ اپنی کتاب میں بغاوت ہی کے موضوع سے بحث کی ہے اس لیے انھوں نے اس کا تذکرہ ضرور کیا ہے لیکن انھوں نے بھی اس کی نفی کی ہے۔[۲۲۶]

۱۸۵۷ء

۱۸۵۷ء کی تحریک انقلاب میں، جسے انگریزوں نے 'غدر' کا نام دیا ہے، ملک کے مختلف طبقوں نے اپنے اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے حصہ لیا تھا۔ اس انقلاب میں فوج کے علاوہ حکمراں طبقہ، ملازمت پیشہ اور طبقۂ علما سبھی طرح کے لوگ شامل تھے۔ ان سب کے مقاصد یقیناً جدا جدا تھے لیکن چوں کہ سبھی کو ایک مشترکہ دشمن کا سامنا تھا اس لیے وہ بظاہر آپس میں متحد تھے۔

ہنگامے کی ابتدا تو تقریباً ۲۶ فروری ۱۸۵۷ء کو ہو چکی تھی یعنی اس وقت جب بیرک پور کی ۱۹ نمبر پلٹن نے چربی والے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ۲۹ مارچ ۱۸۵۷ء کو منگل پانڈے کے خون میں جوش آیا اور اس نے میجر ہڈسن کو گولی کا نشانہ بنایا اور ساتھ ہی لفٹیننٹ واگھ کو بھی ختم کر دیا۔ اپریل کے مہینے میں میرٹھ، انبالہ اور لکھنؤ وغیرہ میں بہت سے انگریزوں کے مکانات جلا دیے گئے۔ ۶ مئی کو میرٹھ میں پھر نوّے سپاہیوں کو آزمائش کے طور پر چربی والے کارتوس دیے گئے۔ پچاس سپاہیوں نے ان کارتوسوں کو استعمال کرنے سے صاف انکار کر دیا اور اس جرم میں ان کا کورٹ مارشل ہو گیا۔ اس پر ۱۰ مئی کو میرٹھ میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ جیل کی دیواریں گرا دی گئیں اور ہندو مسلم سپاہ انگریزوں کا خاتمہ کرنے پر تل گئیں۔ ۱۰ مئی کی رات ہی کو میرٹھ کے سپاہی علم بغاوت بلند کرتے ہوئے دہلی کی طرف روانہ ہوئے اور ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو پیر کے روز صبح آٹھ بجے یہ لوگ دین دین کے نعرے لگاتے ہوئے دہلی میں داخل ہوئے۔ ۲۶ فروری سے ۱۱ مئی تک تقریباً ڈھائی مہینے ملک کے مختلف مقامات میں فوجی بدنظمی اور انگریزوں کے کشت و خون کی وارداتیں ہوتی رہیں لیکن بہادر شاہ ظفر ان تمام معاملات سے قطعی بے تعلق تھے۔ ۱۱ مئی کی صبح کو جب

بادشاہ حسب معمول بیدار ہوئے تو انھوں نے غیر متوقع طور پر انقلابیوں کو انگریزوں کے خلاف سرگرم عمل پایا۔ بادشاہ ان معاملات سے اتنے بے تعلق تھے کہ شروع میں انھیں یہ بھی اندازہ نہیں ہو سکا کہ اس ہنگامے کی نوعیت کیا ہے۔ ظہیر دہلوی اس وقت کی روداد رقم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جھروکے کی جانب سب کی نگاہ ہے کہ یکایک بالائے جھروکہ سے ہنکارنے کی آواز آئی۔ میر فتح علی ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھا۔۔۔۔۔۔ دریا کے پل کی جانب ایسا ہوا۔ اب دریا کی جانب جو نگاہ کی تو دیکھا کہ دریا پار جو میر بحری کا بنگلہ ہے اس میں آگ لگ رہی ہے۔۔۔۔۔۔ میر فتح علی نے رسالدار کو حکم دیا کہ سوار بھیج کر خبر منگاؤ کہ یہ روشنی کیسی ہے۔۔۔۔۔ کوئی پانچ منٹ میں واپس آکر خبر دی کہ کوئی غنیم دلی پر چڑھ آیا ہے۔ بنگلہ پھونک دیا، میر بحری کو مار ڈالا۔ پیش گاہ حضور پر نور سے میر فتح علی اور حمید خاں کو حکم ہوا کہ اپنی جمعیت لے جاؤ اور پل توڑ دو، کشتیاں کھینچ لو کہ فوج اترنے نہ پائے۔ دروازے شہر پناہ کے بند کرا دو۔۔۔۔۔۔ اور تمام ملازمانِ شاہی از کہ تا مہ کو حکم حضوریِ دربار پہنچ جائے۔ کوتوال شہر کو حکم پہنچے کہ دروازۂ شہر کو بند رکھے۔ کلکتہ دروازے پر بذاتِ خود حاضر رہے۔"[۲۲۹]

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک بادشاہ کو صحیح طور پر یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس ہنگامے کی نوعیت کیا ہے اور جب کچھ دیر بعد بادشاہ کے علم میں یہ بات آگئی کہ یہ جمِ غفیر ان ہندوستانی سپاہ کا ہے جنھوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی ہے تو یہ بات ان کے لیے اور بھی زیادہ پریشان کن تھی۔ چناں چہ شروع میں انھوں نے کوشش کی کہ باغی سپاہ اپنے ارادے سے باز آجائیں۔ انھوں نے انگریزوں کو بھی اپنی مدد کے لیے قلعے میں بلا بھیجا اور باغی سپاہیوں سے یہاں تک کہا کہ وہ انگریزوں سے ان کی صلح صفائی کرا دیں گے۔ گویا اس وقت تک بہادر شاہ ظفر کی حیثیت باغیوں اور انگریزوں کے درمیان ثالث یا ایک غیر جانب دار ادارے کی سی تھی۔ اس وقت بادشاہ باغیوں سے بہت برہم تھے ان کا خیال تھا کہ باغیوں نے دلی آکر ان کا سکون برباد کر دیا ہے۔ وہ خود کو اس لائق نہیں سمجھتے تھے کہ باغیوں کی قیادت کر سکیں لیکن ایک دو روز کے اندر جب دلی پر انقلابیوں کا پورا قبضہ ہو گیا تو بادشاہ کو اس بات پر زبردستی مجبور

کیا گیا کہ وہ اس تحریک کی قیادت اپنے ہاتھ میں لیں۔ بادشاہ نے شروع میں اس اعزاز کو بادلِ ناخواستہ قبول کیا لیکن جیسے جیسے تحریک زور پکڑتی گئی وہ اس میں مبتلا ہوتے چلے گئے اور پھر وہ آخر وقت تک تحریک کے ساتھ رہے۔ جس طرح اس بات کا دعوا نہیں کیا جا سکتا کہ بہادر شاہ ظفر ہی ۱۸۵۷ء کی تحریک انقلاب کے بانی تھے اسی طرح یہ ثابت کرنا بھی مشکل بلکہ ناممکن ہے کہ ۱۲ر مئی سے ۱۴ر ستمبر کے درمیانی عرصے میں انگریزوں کے ساتھ ان کی کوئی خفیہ سازباز تھی یا یہ کہ تحریک کے دوران انھوں نے کسی قسم کی غدّاری کا ثبوت دیا۔

اس تحریک میں بہت سی کوتاہیاں اور کمزوریاں تھیں۔ اس لیے تحریک نے جلد ہی دم توڑ دیا اور اسی کے ساتھ وہ مغل حکومت کے آخری چشم و چراغ اور نام نہاد بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو بھی لے ڈوبی۔ ۱۴ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو انگریزوں کی فوجیں شہر میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگئیں۔ ۱۴ر ستمبر سے ۱۹ر ستمبر تک لگاتار پانچ دن تک شہر میں قتل و غارت کی گرم بازاری رہی۔ ۱۹ر ستمبر کو ہفتے کے روز بادشاہ نے بھی قلعہ چھوڑ دیا اور بیگمات اور شہزادوں کے ساتھ نظام الدین چلے گئے۔ تین روز تک بہادر شاہ ظفر اور ان کا خاندان ہمایوں کے مقبرے میں بے سرو سامانی کے عالم میں پڑے رہے۔ بخت خاں بادشاہ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا تاکہ دہلی ہاتھ سے نکل جانے کے باوجود یہ جنگ بہادر شاہ ظفر کے جھنڈے تلے جاری رکھی جاسکے۔ دوسری طرف انگریز اسی خطرے کو محسوس کرتے ہوئے شہنشاہ کو گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ انھیں ڈر تھا کہ اگر بادشاہ فرار ہو گئے تو وہ ہندستان گیر تحریک کا مرکز بنے رہیں گے لیکن دہلی پر انگریزوں کی فتح کے بعد اب بہادر شاہ پہلے سے بھی زیادہ کمزور اور بزدل ہو گئے تھے۔ دوسری طرف انگریزوں کے وفادار اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ بادشاہ کو گرفتار کرا کے وہ انگریزوں کے حلقۂ مقربین میں داخل ہو جائیں۔ چناں چہ اس طرح مرزا الٰہی بخش کی کوششوں سے ۲۱ر ستمبر کو میجر ہڈسن نے بادشاہ اور ان کے خاندان کے دیگر افراد کو جاں بخشی کی ضمانت پر گرفتار کر لیا۔ جب ہڈسن بادشاہ کو گرفتار کر کے لایا تو لال قلعے کے دروازے پر اس نے انھیں سانڈرس کے حوالے کر دیا۔ بادشاہ کو ناظر حسین مرزا کے مکان میں قید کر دیا گیا[۲۴]۔ دہلی کو خیرباد کہنے تک وہ اسی مکان میں رہے۔

ظفر کی بے چارگی

گرفتاری کے بعد دہلی میں ظفر نے بقیہ دن بہت ہی بے چارگی کے عالم میں گزارے بعض معاصرین نے ان کی اس بے چارگی کا نقشا بڑے رقت آمیز انداز میں بیان کیا ہے۔ گرفتھس نام کے ایک یورپی باشندے نے بادشاہ کو ان کی گرفتاری کے اگلے روز یعنی ۲۲ ستمبر کو دیکھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"مکان کے صحن میں ایک معمولی سی کھاٹ پہ ایک گدا بچھا ہوا تھا اور اس پر سلطنتِ مغلیہ کا آخری تاج دار ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔ اس کی موجودہ ہیئت میں کوئی علامت جاہ وجلال کی نہ تھی۔ ایک سفید دراز ریش جو سینے تک لٹکی ہوئی تھی۔ میانہ قد، ستر برس[۲۳۱] سے زیادہ عمر۔ وہ سفید لباس پہنے ہوئے تھا۔ سفید ہی رنگ کی ایک مخروطی شکل کی پگڑی اس کے روبرو دھری تھی۔ دو ملازم اس کی پشت پر کھڑے مورچھلوں سے ہوا کر رہے تھے۔ مورچھل جو شہنشاہیت کی علامت تھے۔ یہ مورچھل ایک ایسے شخص کے لیے، جو اپنا تمام شاہانہ ٹھاٹھ باٹ کھو چکا تھا اور اس وقت اپنے دشمن کی قید میں تھا ایک قابلِ رحم دھوکا تھے۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلتا تھا۔ وہ دن رات خاموش بیٹھا رہتا۔ اس کی نگاہیں فرش پر گڑی رہتیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنی موجودہ حالت سے بالکل بے نیاز ہے۔ بادشاہ کی چارپائی سے تین فٹ کے فاصلے پر ایک اور چارپائی پڑی تھی، اس پر وہ افسر بیٹھا تھا جو یہاں تعینات تھا۔ دو یورپین گشتی سنتری بھری ہوئی بندوقیں لیے بادشاہ کے دونوں طرف کھڑے تھے۔ افسر کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ اگر بادشاہ فرار ہونے کی ذرا بھی کوشش کریں تو انھیں فوراً گولی مار دی جائے۔"[۲۳۲]

(انگریزی سے ترجمہ)

ایک اور شخص رکیس نے بادشاہ کو ان کی گرفتاری کے تین ماہ بعد یعنی ۱۸ دسمبر ۱۸۵۷ء کو دیکھا۔ ۱۹ دسمبر کو اس نے بادشاہ کی حالت اس طرح سپردِ قلم کی:

"کل ہم بہت سے مرد اور عورتیں مسٹر اور مسز سانڈرس کے ساتھ بادشاہ کو دیکھنے گئے۔ وہ نوّے[۲۳۳] برس کا ایک نحیف و لاغر انسان تھا۔ میں نے اسے ایک چھوٹے سے مکان میں جو اس کے کسی معتقد کا تھا ایک چارپائی پر گدّوں پر پڑا ہوا پایا۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ اپنے سنہری خوابوں کے بارے میں آپ ہی آپ کچھ بہکی بہکی سی باتیں کر رہا تھا اور ساتھ ہی اپنے شعر بھی پڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے بعد میں اس سے بات چیت کیے بنا چلا آیا۔"[۲۳۴] (انگریزی سے ترجمہ)

مسز گوپالن نام کی ایک محترمہ تھیں جن کے شوہر گوالیار میں مارے گئے تھے، ان لاچار قیدیوں کو دیکھنے کے لیے آئیں لیکن انھیں ان قیدیوں میں عظمتِ رفتہ کی کوئی علامت نظر نہیں آئی۔ وہ اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"ہم اونچی اونچی سی سیڑھیاں چڑھتے ایک چھت پر پہنچے جہاں کچھ گارڈ دروازے کے آگے گشت کر رہے تھے۔ ہم ایک گندے سے مکان میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد ہمیں شہنشاہوں کے شہنشاہ اور مغلیہ خاندان کے طویل سلسلے کے آخری وارث کا کمرہ نظر آیا۔ پردہ اٹھا کر ہم ایک نہایت ہی تنگ و تاریک اور چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوئے جس کی دیواروں پر سفیدی ہوئی ہوئی تھی۔ یہاں میلے کچیلے سفید سوتی کپڑے پہنے ہوئے ایک کم زور، دُبلا پتلا اور پست قامت بڈھا سردی کے سبب گندی رضائیوں میں لپٹا ایک نیچی سی چارپائی پر پڑا تھا۔ ہمارے داخل ہوتے ہی اس نے وہ حقّہ، جو وہ پی رہا تھا، ایک طرف رکھ دیا اور پھر وہ شخص جو کبھی کسی کو اپنے دربار میں بیٹھا ہوا دیکھنا اپنی توہین سمجھتا تھا، کھڑے ہو کر ہم کو ذلّت آمیز انداز میں سلام کرتا جا رہا تھا کہ اسے ہم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔"[۲۳۵] (انگریزی سے ترجمہ)

ظفر کا مقدمہ

بہادر شاہ ظفر ۲۲ ستمبر ۱۸۵۷ء کو ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار کیے گئے۔ چار ماہ اور چھے روز تک وہ ناظر حسین مرزا کے تنگ و تاریک مکان میں انتہائی مجبوری اور بے بسی کے عالم

میں قید رہے۔ اس دوران ہر لمحہ ان کے سر پر یہ خوف منڈلاتا رہا ہوگا کہ نہ جانے کب انگریز انھیں اوران کے متعلقین کو قتل کر ڈالیں۔ انگریزوں کو اب یہ طاقت حاصل ہو گئی تھی کہ دنیا کی کوئی قوت اور دنیا کا کوئی قانون انھیں اس بات پر مجبور نہیں کر سکتا تھا کہ وہ بادشاہ کے ساتھ کوئی منصفانہ یا ہمدردانہ سلوک کریں۔ لیکن ان کے نام نہاد لبرلزم کا تقاضا تھا کہ وہ بادشاہ کو من مانی سزا دینے سے پہلے ان پر مقدمہ چلائیں اور پھر انھیں مجرم ثابت کر کے سزا دیں۔

بہادر شاہ ظفر کے مقدمے کی کارروائی لال قلعے کے دیوانِ خاص میں عمل میں لائی گئی۔ کارروائی ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو بدھ کے روز یورپین فوجی کمیشن کے تحت کرنل ڈیوس کی صدارت میں شروع ہوئی۔ مقدمے کی کارروائی عدالت کی بائیس نشستوں میں مکمل ہوئی اور بالآخر ۹ مارچ ۱۸۵۸ء کو یہ مقدمہ کمپنی کے حق میں اور بادشاہ کے خلاف فیصل ہوا۔[۲۳۶]

انگریز، اس بغاوت میں، بادشاہ کو واقعی پوری طرح ملوث سمجھتے تھے یا نہیں، یہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اس مقدمے میں جس بات پر بار بار زور دیا گیا اور پھر اسے آخر میں ثابت بھی کر دیا گیا وہ یہی ہے کہ بادشاہ نہ صرف یہ کہ اس بغاوت میں پوری طرح ملوث تھے بلکہ بغاوت کے عمل میں آنے سے پہلے بھی باغیوں کے ساتھ ان کا ربط و ضبط تھا۔ چناں چہ مقدمے کے آخر میں جج نے اپنے بیان میں ایک جگہ لکھا ہے:

"ہم بادشاہ کو، جو تمھارے کٹہرے میں ہیں، اُن سے ساز باز کرتا پاتے ہیں وہ پہلا نصب العین جس کی طرف وہ (باغی) پلٹے، وہ پہلا شخص جس سے انھوں نے التجا کی، یہی دہلی کے فرضی بادشاہ ہیں۔ یہ دیکھ کر معمولی عقل والا بھی کہہ سکتا ہے کہ ان میں ضرور پچھلا ربط و ضبط تھا۔ کیا ہوا اگر بادشاہ کی شرکت بعد میں ہوئی۔"[۲۳۷]

یہی نہیں، معمولی معمولی باتوں میں بھی بادشاہ کی شرکت اور دخل ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ۱۱ مئی کی صبح کو جب باغی فوج دہلی پہنچی تو بادشاہ کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ میرٹھ کی فوج بغاوت کر کے دہلی پہنچ گئی ہے اور جب ان کو اصل حقیقت معلوم ہو گئی تو اس کے بعد بھی انھیں آخری فیصلہ کرنے میں ایک دو دن لگے۔ لیکن انگریزوں کی عدالت نے خود انگریز افسران کی گواہیوں کی مدد سے یہ ثابت کر دیا کہ ۱۱ مئی کو انگریزی میگزین پر جو حملہ ہوا تھا وہ بھی بادشاہ کے ایما پر ہوا تھا۔ چناں چہ

جج صاحبان بیان کرتے ہیں:

"بادشاہ نے میگزین پر قبضہ کرنے کی غرض سے ایک دستہ روانہ کیا اور حکم دیا کہ تمام انگریزوں کو قلعے میں لایا جائے اور اگر وہ منظور نہ کریں تو کوئی بھی میگزین سے باہر نہ نکلنے پائے۔ کپتان[238] فورسٹ نے کہا کہ انھوں نے کسی دستۂ فوج کو نہیں دیکھا البتہ جو شخص یہ پیام لایا تھا وہ کھڑا تھا اور وہ ایک خوش پوش مسلمان تھا۔ یہیں خاتمہ نہیں ہوگیا بلکہ تھوڑی دیر بعد بادشاہ کا ایک دیسی افسر زبردست گارد لے کر آیا جو بادشاہ کے ملازم سپاہیوں پر مشتمل تھا۔"[239]

اس مقدمے کی کارروائی میں انگریز افسران کے علاوہ حکیم احسن اللہ خاں، مکند لال، اور جاٹ مل وغیرہ کی شہادتوں نے کافی اہم رول ادا کیا جس سے انگریزوں کے پاس بادشاہ کو سزا دینے کا ہر ممکن جواز پیدا ہوگیا۔ بادشاہ پر چار جرم عائد کیے گئے تھے جن میں پہلا جرم یہ تھا:

"محمد بہادر شاہ سابق شاہ دہلی پر پہلا جرم یہ ہے کہ برٹش گورنمنٹ ہند کے پنشن خوار ہونے کے باوجود انھوں نے ۱۰ رمئی تا یکم اکتوبر ۱۸۵۷ء کے درمیان ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم سپاہیوں محمد بخت خاں، صوبے دار رجمنٹ توپ خانہ اور دیسی کمیشنڈ افسران کو حکومت کے خلاف بلوہ بغاوت کرنے کی ترغیب دی اور بھڑکایا، جو دہلی میں ہوئی تھی۔"[240]

اس جرم کی بنیاد دراصل اسی مفروضے پر تھی کہ بادشاہ اور باغیوں کے درمیان ضرور پچھلا ربط و ضبط تھا۔ یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ بادشاہ شروع میں اس بغاوت کے حالات سے بے خبر تھے اور اس کے بعد بھی انھوں نے بڑی حد تک بے تعلق رہنے کی کوشش کی۔ باغیوں کو بادشاہ نے اپنے کسی منصوبے کی تکمیل کے لیے دعوت نہیں دی تھی بلکہ خود باغیوں کے منصوبوں کی تکمیل کے لیے بادشاہ کو مجبوراً باغیوں کا ساتھ دینا پڑا۔ اس فرد جرم کے مطابق بادشاہ نے انگریزوں کے خلاف جن لوگوں کو 'بلوہ' اور 'بغاوت' کرنے کی ترغیب دی، ان میں بخت خاں کا بھی نام ہے۔ بخت خاں کے دہلی پہنچنے کی صحیح تاریخ کا پتا نہیں چلتا لیکن خود انگریز عدالت کے جج کے بیان کے

مطابق بخت خاں یکم جولائی کو دہلی پہنچے جب کہ بغاوت یکم مئی کو شروع ہو چکی تھی۔ اس جرم میں بادشاہ کو زبردستی ملوث کیا گیا۔ دوسرے جرم کا ذکر کرتے ہوئے جج فرماتے ہیں :

"دوسری قرار دادِ جرم کی طرف بڑھتا ہوں جو پہلی سے بھی زیادہ مستند اور صحیح ہے۔ وہ یہ کہ مؤرخہ ۱۰ مئی اور یکم اکتوبر کے درمیان انھوں نے اپنے فرزند مرزا مغل کو، جو گورنمنٹ برطانیہ کی رعایا تھے و دیگر باشندگانِ شمال مغربی صوبہ جات کو، جن کے نام معلوم نہیں اور سپاہیوں کو، جو سب کے سب گورنمنٹ برطانیہ کی رعایا تھے، حکومت کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کیا اور اشتعال دلایا۔"[۲۴۱]

پہلے اور دوسرے جرم میں بظاہر کوئی فرق نہیں سوائے اس کے کہ پہلے میں بخت خاں کا اور دوسرے میں مرزا مغل کا نام آیا ہے یا پھر بقول جج یہ پہلی (قرار دادِ جرم) سے بھی زیادہ مستند اور صحیح ہے۔

تیسرے جرم کا ذکر کرتے ہوئے جج نے کہا :

"تیسرا جرم یہ ہے کہ باوجود برٹش ہند کی رعایا ہونے کے اپنی فرماں برداری کا خیال نہ رکھا جو کہ ان کا فرض تھا۔ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء یا اس کے کچھ بعد سلطنت کے خائن ہوئے۔ اپنے آپ کو بادشاہِ دہلی مشہور کیا اور شہر دہلی پر خلافِ قانون قبضہ کر لیا۔ نیز مرزا مغل اپنے فرزند و محمد بخت خاں صوبے دار توپ خانہ و دیگر فتنہ پردازوں سے سازش کی اور ۱۰ مئی تا یکم اکتوبر باغی سلطنت ہوئے اور گورنمنٹ سے لڑنے کے لیے دہلی میں فوج جمع کی۔"[۲۴۲]

یہ جرم بادشاہ پر داخلی اور خارجی دونوں شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے۔ البتہ ایک الزام کا ذکر ہر قرار دادِ جرم میں ہے یعنی یہ کہ خود بہادر شاہ نے گورنمنٹ سے لڑنے کے لیے دہلی میں فوج جمع کی، یہ غلط تھا۔ ایسا ہوا ہی نہیں، کاش ایسا ہوتا اور بہادر شاہ صحیح معنوں میں اُس تحریک آزادی کے ہیرو ثابت ہوتے۔

چوتھی اور آخری قرار دادِ جرم جو بادشاہ پر لگائی گئی یہ تھی :

"۱۶ مئی ۱۸۵۷ء یا اس سے قبل یا بعد شہر دہلی میں ۴۹ انگریز جن میں عورتیں اور بچے بکثرت شامل تھے قتل کرائے یا ان کے قتل میں حصہ لیا۔"[۴۳]

بادشاہ پر جتنے الزام لگائے گئے تھے ان میں یہ الزام سب سے زیادہ سنگین تھا۔ دراصل مرزا مغل، مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر کا بے رحمانہ قتل بھی میجر ہڈسن کے ہاتھوں اسی جذبۂ انتقام کے سبب ہوا تھا۔ اس وقت دہلی میں بلا کی بدامنی تھی اور پورے شہر پر ایک بربریت کی فضا طاری تھی جس پر کسی کا قابو نہیں تھا اس اشتعال میں وہ ۴۹ انگریز عورتیں اور بچے بھی قتل کر دیے گئے جو لال قلعے میں پناہ گزیں تھے، اگر بہادر شاہ چاہتے بھی تو ان کے قتل کو نہیں روک سکتے تھے اس جرم کے ثبوت میں جن شواہد کو بنیاد بنایا گیا ان میں سب سے پہلے مکند لال اور عدالت کے مابین ہونے والے یہ سوال وجواب تھے :

"سوال : کس کے حکم سے یہ لیڈیاں اور بچے جو قلعے میں مقید تھے قتل کیے گئے؟

جواب : یہ لوگ تین روز تک جمع ہوتے رہے۔ چوتھے روز پیدل اور سوار سپاہی مرزا مغل کے ہمراہ بادشاہ کے کمرۂ خاص کے دروازے پر آئے اور ان کے قتل کرنے کی اجازت کے بادشاہ سے طلب گار ہوئے۔ بادشاہ اس وقت اپنے کمرۂ خاص میں تھے۔ مرزا مغل اور بسنت علی اندر چلے گئے اور سپاہ باہر کھڑی رہی۔ چند منٹ بعد وہ باہر آئے اور بسنت علی خاں نے بہ آواز بلند کہا 'بادشاہ نے قیدیوں کے قتل کرنے کی اجازت دے دی ہے، پس بادشاہ کے مسلح مصاحبین نے جن کے زیر حراست یہ قیدی تھے انھیں باہر نکالا اور چند باغی سپاہیوں کے ساتھ انھیں قتل کر ڈالا۔"[۴۴]

آگے چل کر جج نے حکیم احسن اللہ خاں اور عدالت کے مابین سوال وجواب کا حوالہ دیا ہے جو اس طرح تھے :

"سوال : اس کاغذ کے ورق کو دیکھو اور پہچانو تو یہ کس کا خط ہے؟

جواب : جی ہاں یہ اس شخص کا خط ہے جو ڈائری لکھا کرتا تھا یہ اس کا ایک ورق ہے :

"کورٹ ڈائری مورخہ ۱۶ مئی ۱۸۵۷ء بادشاہ نے دیوانِ خاص میں دربار منعقد فرمایا۔ ۴۹ انگریز قید تھے۔ فوج نے مطالبہ کیا کہ وہ اسے دیے جائیں۔ بادشاہ نے یہ کہہ کر حوالے کر دیے کہ فوج جو چاہے کر سکتی ہے۔"[۲۴۵]

حکیم صاحب نے کورٹ ڈائری کے ورق کی تصدیق تو کر دی لیکن ان انگریزوں کے قتل کے سلسلے میں خود حکیم صاحب کا کیا رول تھا وہ ظہیر دہلوی کی زبانی ملاحظہ ہو:

"جب مہتاب باغ کے دروازے کے آگے پہنچا تو دیکھا پوربیے ان قیدیوں کو باغ سے باہر لے کر آئے ہیں۔ میں نے کہا ان کو کہاں لے جاتے ہو تو وہ بولے کہ ہم ان کو قلعے کے باہر لے جا کر رکھیں گے .... مجھے اندیشہ ہوا کہ مبادا یہ کوئی اور حرکت کر بیٹھیں، میں جلدی سے قدم بڑھا کر احسن اللہ خاں کے پاس پہنچا ...... میں نے جا کر ان سے کہا۔ خاں صاحب آپ کو کچھ اور بھی خبر ہے وہ بولے کیا۔ میں نے کہا وہ بدمعاش ان قیدیوں کو لیے جاتے ہیں۔ مبادا وہ ان کو قتل کر ڈالیں آپ اس کا بندوبست کیجیے، تو مجھے جواب دیا کہ ہم کیا کر سکتے ہیں پھر میں نے کہا کہ خاں صاحب وقت نمک حلالی کا یہ ہے کہ اگر بادشاہ کو بچانا چاہتے ہو تو سمجھا بجھا کر ان قیدیوں کو بچا لو ورنہ یاد رکھو انگریز لوگ دلی کا چبوترہ بنا دیں گے۔ احسن اللہ خاں نے جواب دیا۔ میاں تم بچے ہو۔ تم کیا جانو کہ انسان زحمت بالفعل پر زحمت بالقوہ کو ترجیح دیتا ہے۔ ابھی جو ہم ان سے کہتے ہیں تو یہ ان سے پہلے ہم کو قتل کر دیں گے اور پیچھے ان پر ہاتھ ڈالیں گے۔"[۲۴۶]

ظہیر دہلوی کے بیان سے یہ ثابت ہے کہ ان ۴۹ انگریزوں کے قتل کی ذمے داری اس حد تک احسان اللہ خاں پر بھی عائد ہوتی ہے کہ انھوں نے اس معاملے میں چشم پوشی سے کام لیا۔ انھوں نے جس بے چارگی کا اظہار اپنے بارے میں کیا اس بے چارگی کا شکار تو ظفر بھی تھے۔ اس واقعے سے متعلق احسن اللہ خاں کے بارے میں معین الدین کا یہ بیان بھی قابلِ غور ہے:

"واقعات کے رنگ سے خوف زدہ ہو کر احسن اللہ خاں نے نہایت دغا بازی سے ان یورپین عورتوں اور بچوں کو حوالے کر دیا جنھیں انھوں نے اپنی

حفاظت میں لے رکھا تھا۔"[۲۴]

بہرحال عدالت کو تو یہ جرم ظفر پر ہی ثابت کرنا تھا۔ چناں چہ وہی اس کے قصور وار ٹھہرے۔ اس مقدمے میں بادشاہ نے اپنا بیان صفائی زبانی دیا تھا جو عدالت میں لکھ لیا گیا تھا اور جس پر بادشاہ نے اپنے ص[۲۴] سے تصدیق کر دی تھی۔ نیشنل آرکائیوز میں اس بیان کی ایک صاف نقل مطابق اصل، جو بادشاہ کے صـ سے تصدیق شدہ ہے، موجود ہے یہ بیان یہاں جوں کا توں نقل کیا جاتا ہے:

"جواب زبانی بہادر شاہ

حقیقت یہ ہے کہ پہلے روز اوّل مجھے کچھ خبر نہ تھی۔ قریب پہر دن چڑھے کے دفعتًا سوار باغی آئے اور انھوں نے آن کے زیر جھروکہ شور مچایا اور کہا کہ ہم میرٹھ سے انگریزوں کو قتل کر کے آئے ہیں اس واسطے کہ وہ ہمیں ایسے کارتوس دانت سے کاٹنے کو کہتے ہیں جن میں چربی گائے اور سور کی لگی ہوئی تھی اور ہندو اور مسلمان کا دین اس سے بگڑتا تھا۔ جب میں نے یہ سنا تو دروازہ زیر جھروکہ بند کروا کر قلعے دار بہادر کو اطلاع کروائی۔ وہ خود آئے اور چاہا کہ زیر جھروکہ جاویں اور دروازہ کھلوانے کو کہا، میں نے نہ جانے دیا اور دروازہ زیر جھروکہ نہ کھلوایا تب قلعے دار بہادر نے کٹہرے کے پاس جا کر اُن سے کچھ کہا اور وہ سوار چلے گئے بعد اس کے قلعے دار بہادر نے مجھ سے کہا کہ میں ابھی بندوبست اس کا کرتا ہوں اور مجھ سے رخصت ہو کر گئے۔ بعد تھوڑی دیر کے بڑے صاحب نے دو توپیں اور قلعے دار بہادر نے دو توپیں منگوا بھیجیں اور کہلا بھیجا کہ دو، بیبیاں، میرے مکان میں ہیں انھیں پالکیوں میں بلا بھیجیے۔ اور محل میں چھپا کر رکھیے۔ میں نے پالکیاں فورًا روانہ کر دیں اور توپوں کو بھی حکم دیا۔ بعد تھوڑی دیر کے سنا کہ ہنوز پالکیاں نہ پہنچیں تھیں کہ بڑے صاحب اور قلعے دار بہادر اور بیبیاں سب مارے گئے۔ بعد اس کے فوج باغی دیوانِ خاص میں گھس آئی اور سوار اور پیادوں سے صحنِ دیوانِ خاص اور اندر دیوانِ خاص اور تسبیح خانہ بھر گیا اور میرے گرد کھڑے ہو گئے اور گھیر لیا اور جا بجا

پہرہ بندی کردی۔ میں نے کہا تمھارا کیا مطلب ہے۔ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ انھوں نے کہا کہ آپ چپکے بیٹھے رہیے ورنہ ہم تو اپنی جانوں سے سیر ہیں جو کچھ ہم سے ہو سکے گا ہم کر گزریں گے۔ اُس وقت میں بخوف جان اپنی خاموش رہا اور محل میں چلا گیا بعد اس کے قریب شام وہ نمک حرام کئی بیبیوں کو اور انگریزوں کو میگزین میں سے پکڑ لائے اور چاہا کہ انھیں قتل کریں۔ میں نے بہت فہمائش کی تب اس وقت ان کی جانیں بچیں اور فوج نے انھیں قید کیا۔ بعد اس کے دوبارہ انھیں قتل کرنا چاہا میں نے بہ منت فہمائش کی اور ان کو بچایا۔ آخر مرتبہ سیوم ہر چند فہمائش کی لاکن ان باغیوں نے نہ مانا اور ان غریبوں کو قتل کیا۔ میں نے ان کے قتل کا حکم نہیں دیا تھا اور مرزا مغل اور مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر اور بسنت خواجہ سرانے جو اس فوج سے سازش کر لی۔ اگر انھوں نے میرا نام لیا تو مجھے اس کی خبر نہیں اور اگر میرے خاص بردار میرے حکم کے بغیر ان کے قتل میں شریک ہوئے ہوں۔ بسازش فوج باغی یا بادشاہ مرزا مغل تو اس کی بھی مجھے کچھ خبر نہیں ہے اور نہ بعد اس کے کسی نے اس حال سے مجھے اطلاع کی اور بڑے صاحب اور قلعے دار بہادر کے قتل ہونے میں جو گواہوں نے بیان کیا، اشتراک میرے ملازموں کا تو اس کا بھی یہی جواب ہے کہ میں نے انھیں حکم نہیں دیا تھا اگر وہ لوگ بخوشی مرتکب ایسے امر کے ہوئے ہوں تو مجھے اس کی خبر نہیں ہے اور نہ مجھے کسی نے اس حال کو بیان کیا۔ حاشا و کلاّ میں نے نہ بڑے صاحب کے قتل اور نہ کسی اور صاحب لوگوں کے قتل کا حکم دیا تھا۔ مکند لال وغیرہ گواہوں نے صرف جھوٹ میرا نام لیا ہے۔ مرزا مغل اور خضر سلطان نے اگر حکم دیا ہو تو تعجب نہیں ہے کہ انھوں نے فوج باغی سے سازش کر لی تھی اور بعد اس کے وہ فوج مرزا مغل اور مرزا خضر سلطان کو اور مرزا ابوبکر کو لائی تھی اور کہا کہ ہم ان کو اپنا افسر بنانا چاہتے ہیں۔ اوّل میں نے قبول نہ کیا۔ بعد جب اس فوج نے بہت اصرار کیا اور مرزا مغل مجھ سے خفا ہو کر اپنی والدہ کے گھر میں جا بیٹھے تب اس فوج کے خوف سے

میں خاموش رہا اور مرزا مغل بہ صلاح ہم دگر افسر فوج مقرر ہو گئے۔ اور حال میری مُہری شقوں کا اور دستخطی کا یہ ہے کہ جس دن سے وہ فوج آئی اور حکام کو قتل کیا اور مجھ کو قید کیا، میں ان کی قید میں تھا وہ جو چاہتے تھے لکھوا کر لاتے تھے اور مجھ سے زبردستی مُہر کروا لیتے تھے اور شقوں کے مسودے لکھوا لاتے تھے اور میرے منشی سے صاف کروا لیتے تھے اور اکثر آپ صاف کروا لاتے تھے اور نقل اس کی دفتر میں دے دیتے تھے۔ چناں چہ اکثر ایسے مسودے باختلاف خط مثل میں موجود ہیں اور اکثر سادے خالی لفافوں پر مُہر کروا لیتے تھے۔ معلوم نہیں کہ ان کے اندر کس مضمون کے شقے کس کو بھیجا کرتے تھے اور ایک عرضی مکندلال کی معلوم نہیں کہ اس نے کس کو لکھی ہے۔ تفصیل میں شقوں کی ایک تاریخ کی مثل میں موجود ہے اور اس میں تفصیل وار لکھا ہے کہ اتنے شقے فلاں شخص نے لکھوائے اور اتنے فلاں شخص نے لکھوائے اور میرا نام کسی شقے کی نسبت نہیں لکھا ہے۔ پس اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ میرے بدون حکم اور بدون اطلاع جو کوئی چاہتا تھا، وہ شقہ لکھواتا تھا اور مجھے اُن کے مضمون کی اطلاع بھی نہیں کرتے تھے اور میں بخوف جان یا میرا منشی کچھ اُن سے بول نہ سکتے تھے اور یہی حال دستخطی عرضیوں کا بھی ہے کہ جو عرضی وہ فوج کے لوگ یا مرزا مغل یا مرزا خضر سلطان یا ابوبکر لاتے تھے اور افسران فوج بھی ہمراہ ان کے ہوتے تھے۔ ہر ایک عرضی کے ساتھ ایک علیحدہ پرچے پر جو انھیں منظور ہوتا تھا لکھوا کر لاتے تھے اور پھر جب اُس پرچے کے دستخط عرضی کی پیشانی پر کروا لیتے تھے اور حال یہاں تک تھا کہ مجھے سنا کر کہتے تھے کہ جو کوئی ہمارا کہنا نہ مانے گا پشیمان ہوگا۔ اس وقت میں بہ خوف ان کے کچھ نہ بول سکتا تھا اور میرے اہل کاروں کو خصوصاً حکیم احسن اللہ خاں کو اور محبوب علی خاں کو اور بیگم زینت محل کو کہتے تھے کہ یہ انگریزوں کو چٹھیاں بھیجتے ہیں اور اُن سے ملے ہوئے ہیں ہم اُن کو مار ڈالیں گے۔ چناں چہ حکیم احسن اللہ کا ایک دن گھر لوٹ لیا اور اسے قید کیا بلکہ چاہا تھا کہ قتل کر دیں لاکن بعد فہمائش اور منت کے قتل سے در گذرے اور قید کیا اور بعد پھر اور اہل کاروں کو بھی قید کیا۔

چنانچہ صمصام الدولہ، زینت محل بیگم کے باپ کو بھی قید کیا تھا اور یہ بھی مشہور کیا تھا کہ ہم بادشاہ کو موقوف کریں گے اور مرزا مغل کو بادشاہ کریں گے۔ جائے غور وانصاف ہے کہ پھر کس چیز کا مجھ کو اختیار تھا اور میں ان سے کیا راضی ہوتا اور یہ بھی۔ اکثر افسران فوج مجھ سے کہتے تھے کہ زینت محل کو ہمارے حوالے کیجیے ہم قید کریں گے کہ وہ انگریزوں سے ملی ہوئی ہیں۔ پس اگر میرا اختیار ہوتا تو میں حکیم احسن اللہ خاں کو کیوں قید ہونے دیتا اور زینت محل بیگم کے باپ کو کیوں قید ہونے دیتا اور حکیم کے گھر کو کیوں لٹنے دیتا۔ اس فوج نے ایک کورٹ مقرر کیا تھا اور اس میں صلاح و مشورہ کرکے جو کچھ ان کے صلاح میں مقرر ہوتا تھا کرتے تھے اور میں اس مشورے میں اُن کے شریک نہیں ہوتا تھا۔ چناں چہ میرے بغیر حکم اور اطلاع اکثر لوگوں کو اور اکثر بازاروں کو لوٹ لیا اور جسے چاہتے تھے لوٹ لیتے تھے اور قتل کرتے تھے اور قید کرتے تھے۔ اور اکثر مہاجنوں سے اور اہل شہر ذی عزتوں سے زبردستی بدون اجازت میری جس قدر روپیا چاہا لیا اور اپنے خرچ میں لائے جو کچھ کیا اس فوج نے کیا میں ان کے بس میں تھا کیا کر سکتا تھا دفعتاً انھوں نے آن کر مجھے قید کر لیا تھا۔ بہ مجبوری جو کچھ وہ مجھے کہتے تھے بہ خوف ان کے میں وہی کرتا تھا ورنہ فوراً مجھے قتل کرتے۔ یہ بات سب صاحبوں کو معلوم ہے اور میں ان سے ایسا تنگ تھا کہ میری جان پر نوبت تھی اور میرے اہل کاروں کی جان بچنے کی توقع نہیں تھی۔ چناں چہ میں نے فقیری اختیار کی۔ گیروے کپڑے پہنے اور چاہا کہ قطب صاحب کو چلا جاؤں اور وہاں سے اجمیر شریف کو چلا جاؤں ----------

------ اور وہاں سے یعنی اجمیر شریف سے مکے کو لیکن اس فوج نے نہ جانے دیا اور اس فوج نے میگزین سرکاری اور خزانہ لوٹا اور جو چاہا سو کیا۔ میں نے اس میں سے کچھ نہیں لیا اور نہ میرے پاس وہ لائے اور ایک دن زینت محل بیگم کے گھر پر چڑھ گئے اور چاہا تھا کہ لوٹ لیویں مگر دروازہ نہ ٹوٹ سکا۔ پس خیال کرنا چاہیے کہ اگر وہ میرے تابع ہوتے یا میں ان سے ملا ہوا ہوتا تو یہ باتیں کاہے کو

ہوتیں اور سوائے جانے غور ہے کہ کوئی کسی غریب آدمی کی زوجہ کو بھی نہیں مانگتا اور نہیں کہتا کہ اسے ہمیں دے دو، ہم قید کریں گے اور شیدی قنبر مجھ سے رخصت حج کے واسطے لے کر گیا تھا۔ میں نے اسے ایران کو نہیں بھیجا تھا اور نہ کوئی نامہ والی ایران کو اس کے ہاتھ بھجوایا تھا۔ یہ خبر کسی نے جھوٹ سے مشہور کی ہوگی اور محمد درویش کی عرضی جو ہے وہ میری دستاویز نہیں ہے کہ قابل اعتبار ہو، اگر کسی شخص نے براہِ دشمنی میری یا میاں حسن عسکری کی اس مضمون کی عرضی لکھ دی ہو تو قابل اعتبار نہیں ہے اور اس فوج کا یہ حال تھا کہ کوئی مجھے سلام بھی نہیں کرتا تھا اور نہ میرا کچھ آداب کرتے تھے۔ جوتیاں پہنے ہوئے دیوانِ خاص اور تسبیح خانے کے اندر چلے آتے تھے اور جس فوج نے کہ اپنے خداوندوں کو قتل کیا، مجھے ان کا کیا اعتبار ہوتا۔ جس طرح انھوں نے اپنے خداوندوں کو قتل کیا اسی طرح مجھے بھی قید کیا تھا اور ظلم کرتے تھے۔ اور صرف برائے نام مجھے رکھا تھا۔ درصورتیکہ ایسے حکام جلیل القدر کو انھوں نے قتل کیا تو اس وقت مجھ سے کہ نہ میرے پاس فوج تھی نہ خزانہ تھا نہ میگزین تھا نہ توپ خانہ تھا میں کیوں کر ان کا مقابلہ کرتا اور کیوں کر ان کا بندوبست کر سکتا تھا اور میں نے اس فوج کو کسی طرح کی مدد نہیں دی۔ بروز اول جب سوار آئے تو دروازہ زیر جھروکہ کا میرے قبضے میں تھا بند کروا دیا اور قلعے دار بہادر کو بلایا اور اطلاع کی اور ان باغیوں کے پاس نہ جانے دیا اور جب قلعے دار بہادر نے پالکیاں بیبیوں کے واسطے منگوائیں تو فوراً روانہ کیں اور حسب الطلب بڑے صاحب کے توپیں واسطے محافظت کے روانہ کیں اور اسی شب کو وثیقہ عمدہ برائے نامدار لفٹیننٹ گورنر بہادر آگرہ کو متضمن حال اس حادثے کا ہاتھ شتر سوار کے بھیجا۔ جب تک میرا اختیار رہا تب تک جو مجھ سے ہو سکا وہ کیا اور میں بااختیار اپنے سوار نہیں ہوا تھا اور اس فوج کے بس میں تھا جب جو چاہا انھوں نے زبردستی وہ کیا اور تھوڑے سے تو ملازم جو میں نے رکھے تھے بہ خوف اس فوج باغی کے واسطے محافظت اپنی جان کے رکھے تھے اور جب وہ فوج بھاگنے کو مستعد ہوئی میں قابو پا کر ان سے خفیہ زیر جھروکہ

سے چلا گیا اور ہمایوں کے مقبرے میں جا بیٹھا۔ جب سرکار نے مجھے باقرار جاں بخشی بلا بھیجا۔ میں امان میں سرکار کی چلا آیا اور فوج باغی نے چاہا کہ مجھے ساتھ لے جاویں لیکن میں ان کے ساتھ نہ گیا اور یہ سب جو میں نے لکھوایا ہے اپنی زبانی اس میں مطلق ہر گز کذب و دریغ نہیں۔ واللہ باللہ راست جو حال تھا وہ میں نے لکھوایا ہے اور جو مجھے یاد تھا میں نے لکھوایا۔ اور میں نے پہلے ہی قسم کھا کر تم سے کہا تھا کہ جو حال ہے وہ میں سچ سچ لکھواؤں گا نہ اس میں کم ہو گا نہ بیش سو لکھوا دیا۔ (علامت دستخط)

تتمہ جواب

اور مرزا مغل کے نام کے شقے کی جو نقل مثل میں ہے یہ مضمون شکایت فوج باغی اور ارادہ جانے کا میرے خواجہ صاحب اور وہاں سے مکہ معظمہ کو مجھے اس شقے کا ہونا یاد نہیں ہے لیکن وہ نقل شقہ بزبان اردو ہے خلاف سررشتہ دفتر میرے کے ہے میرے منشی خانے سے بزبان فارسی شقے جاری ہوتے تھے۔ معلوم نہیں یہ کیوں کر لکھا گیا تھا۔ ظاہراً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں جو اس فوج باغی سے بہت تنگ ہوا تھا اور ارادہ جانے مکہ کا کیا تھا اور ترک دنیا کر کے فقیری اختیار کی تھی تب شاید مرزا مغل نے یہ شقہ اپنے دفتر سے لکھوا کر میری مہر کروالی ہو گی۔ بہر حال میری ناراضامندی اس فوج سے اور بے اختیاری اس نقل شقہ سے بھی ثابت تھی اور وہ مصدق میرے پہلے بیان کا ہے اور سوائے اس کے جو اور نقل شقہ موسومہ بہ راجا گلاب سنگھ مع نقل عرضی بخت خاں مع نقل دستخط میرے مع اور کئی نقلوں کے جو مثل میں ہیں اگرچہ مجھے یاد نہیں ہے لاکن میں ایسا جانتا ہوں کہ پہلے جو میں لکھوا چکا ہوں کہ جس مضمون کا جو اہل فوج چاہتا تھا شقہ بغیر میری اطلاع لکھوا کر میری مہر کروا لیتے تھے یقین ہے کہ یہ بھی اسی قبیل سے ہوں گے اور بخت خاں کی عرضی کی پیشانی پر بھی بطور اور سب عرضیوں کے جو چاہا ہو گا دستخط کروا لیا ہو گا۔"[۲۲۹]

ایک لمحے کے لیے بادشاہ کے حصے کے نشان اور اس بیان کی صداقت پر سوالیہ نشان لگایا جا سکتا ہے لیکن اگر اس بیان کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اس کی عبارت کے اندر سے بہادر شاہ ظفر کی

بزدل اور کم زور شخصیت صاف جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے ایک ایسی شخصیت جس نے ایک باغی کی موت مرنے کے بجائے قید و بند کی اس موت کو ترجیح دی جو اسے انتہائی ذلت کے ساتھ اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر نصیب ہوئی۔ اسی برس کی عمر میں زندہ رہنے کی خواہش اور نام نہاد بادشاہت کی ہوس نے بہادر شاہ کو بہادری کی موت نہ مرنے دیا۔

۹ مارچ ۱۸۵۸ء کو عدالت نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے بہادر شاہ ظفر کو ان تمام جرائم کا مرتکب قرار دیا جو ان پر عائد کیے گئے تھے۔[۲۵] دنیا کے کسی بھی ملک میں بغاوت کی سزا موت ہے۔ بہادر شاہ ظفر کو انگریز کی عدالت نے موت کی سزا نہیں دی۔ بہادر شاہ سے کسی ہمدردی کی بنا پر نہیں بلکہ سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے۔ انگریز دیکھ چکے تھے کہ بہادر شاہ ظفر ایک ایسی علامت بن گیا تھا جس کے نام پر پورا ہندوستان، کم از کم انگریزوں کے مقابلے میں متحد ہو سکتا تھا۔

بہادر شاہ ظفر کو پھانسی دے دینے کا مطلب انھیں انقلاب کا ہیرو بنا دینا تھا۔ یہ بہادر شاہ ظفر کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز ہوتا اور انگریزوں کے لیے ایک نیا خطرہ بھی ہو سکتا تھا۔ اس کے مقابلے میں بادشاہ کو جلاوطنی کی سزا دینے میں اس طرح کا خطرہ کم تھا اور پھر اس طرح انگریز، ہندوستان کی سرزمین سے مغلیہ خاندان کا نام و نشان تک مٹا دینے میں کامیاب ہو گئے۔ بہادر شاہ ظفر اور ان کے خاندان کو جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیا گیا اور اس جلاوطنی میں بھی وہ انگریز کی قید ہی میں رہے۔

سفرِ رنگون

مقدمے کے فیصلے کے لگ بھگ سات ماہ بعد رنگون کے سفر کی تیاریاں شروع ہوئیں۔

بہادر شاہ ظفر اور دوسرے سیاسی قیدیوں کی سواری کے لیے تین پالکی نما گاڑیاں اور چار گھوڑے خریدے گئے۔ لفٹیننٹ اومینی کو قیدیوں کا نگراں مقرر کیا گیا۔ گھوڑ سواروں کا ایک دستہ اور ایک فوجی بٹالین ان کے ہمراہ کی گئی۔ اس طرح، ۷ اکتوبر ۱۸۵۸ء کی شام چار بجے سابق شہنشاہِ دہلی اور مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ثانی نے دہلی کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا۔ سیاسی قیدیوں کا یہ قافلہ دہلی سے الہ آباد کے لیے روانہ ہوا۔ دہلی کے کمشنر نے اس امر کی اطلاع تار کے ذریعے گورنر جنرل کو پہنچا دی۔[۲۶] اومینی کو یہ ہدایات ملیں کہ وہ گورنر جنرل کی اطلاع کے لیے سفر کے دوران اپنی روزانہ کارروائی کی رپورٹ بھیجا کریں۔[۲۷] اس ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اومینی نے اس سفر کی ڈائری

لکھنی شروع کی۔ وہ جس جگہ بھی جاتے فوراً اپنی جائے قیام کے بارے میں گورنر جنرل کو اطلاع دیتے۔ اس ڈائری کا مضمون ایک ہی طرح کا ہوتا تھا بس مقام اور تاریخ بدلی ہوئی تھی۔ مثلاً ۲۹ر اکتوبر ۱۸۵۸ء کو وہ اطلاع دیتے ہیں:

"میں گورنر جنرل کی اطلاع کے لیے یہ عرض کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں کہ قیدیوں کی گاڑی آج صبح میری نگرانی میں یہاں تک پہنچ گئی ہے اور کل صبح چوبے پور کے لیے روانہ ہو جائے گی۔"[۲۵۳] (انگریزی سے ترجمہ)

سیاسی قیدیوں کا یہ قافلہ جس محافظ انگریزی فوجی دستے کی کڑی نگرانی میں اپنی آخری منزل کی طرف جا رہا تھا اس کا نام نائنتھ لانسر تھا۔ مختلف مقامات پر قیام کرتا ہوا ۱۳ر نومبر ۱۸۵۸ء کو یہ قافلہ الٰہ آباد پہنچ گیا۔ دہلی سے شاہی خاندان کے چار افراد یعنی محمد بہادر شاہ ظفر نواب زینت محل بیگم، شہزادہ جواں بخت اور شاہ عباس تو باقاعدہ جلاوطن ہو کر سیاسی قیدیوں کی حیثیت سے روانہ کیے گئے تھے لیکن ان کے ہمراہ شاہی خاندان کے کچھ اور لوگ بھی تھے۔ بحیثیتِ مجموعی سیاسی قیدیوں کی یہ جماعت تیرہ افراد پر مشتمل تھی جن کے نام اس طرح ہیں:

"۱۔ بہادر شاہ ظفر ۲۔ مرزا جواں بخت ۳۔ مرزا شاہ عباس
۴۔ زینت محل بیگم ۵۔ زمانی بیگم (زوجہ جواں بخت) ۶۔ رقیہ بیگم (ہمشیر زمانی بیگم) ۷۔ ممتاز بیگم (والدہ زمانی بیگم) ۸۔ تاج محل بیگم (زوجہ بہادر شاہ) ۹۔ رحیمہ ۱۰۔ سلطانہ ۱۱۔ عشرت ۱۲۔ طہارت ۱۳۔ مبارک النساء (والدۂ شاہ عباس)"[۲۵۴]

الٰہ آباد میں بادشاہ اور ان کے ساتھیوں کا قیام صرف تین روز رہا۔ یہاں حکومت کی جانب سے بادشاہ کے طبی معائنے کے لیے ڈاکٹروں کی ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ گورنمنٹ آف انڈیا کے سیکرٹری، ایڈمنسٹن نے گورنر جنرل کی طرف سے ایس۔ ایم۔ ہیڈوے کو اس سلسلے میں یہ مراسلہ روانہ کیا:

"گورنر جنرل چاہتے ہیں کہ آپ کی کمیٹی محمد بہادر شاہ کا غور و خوض سے طبی معائنہ کرے اور اس کی ایک رپورٹ گورنر جنرل موصوف کو بھیجی جائے۔

ساتھ ہی آپ مندرجۂ ذیل امور پر اپنی رائے بھی تحریر فرمائیں۔

کیا آپ کی کمیٹی بادشاہ کی موجودہ صحت، ضعیف العمری اور ان کی دہلی سے یہاں تک کی مسافت کے بعد طبّی نقطۂ نگاہ سے ان کا فوراً ہی رنگون بھیجا جانا یا رنگون کے مخصوص مکان میں ان کا ٹھہرایا جانا یا آب و ہوا کے لحاظ سے صوبہ پیگو میں ان کے قیام کو غیر مناسب تو نہیں سمجھتی؟" ۲۵۵

(انگریزی سے ترجمہ)

اس خط کے جواب میں ڈاکٹروں کی کمیٹی نے ہیڈوے کی معرفت گورنر جنرل کو یہ جواب بھجوایا:

"ان (بہادر شاہ) کی عام جسمانی حالت، ان کی صحت، ضعیف العمری اور طویل مسافت کے بعد بھی اس سے بدرجہا بہتر ہے جو آپ خیال فرماتے ہیں۔ لہٰذا کمیٹی بادشاہ کا رنگون بھیجا جانا، یا ان کا رنگون کے مخصوص مکان میں ٹھہرایا جانا یا صوبہ پیگو کی مخصوص آب و ہوا میں ان کا بھیجا جانا طبّی نقطۂ نگاہ سے قطعی غیر مناسب نہیں سمجھتی۔" ۲۵۶

(انگریزی سے ترجمہ)

۱۵ر نومبر ۱۸۵۸ء کو گورنر جنرل کی منظوری کے بعد ڈاکٹر جونسن، سابق بادشاہِ دہلی کے ذاتی ڈاکٹر مقرر ہوئے اور اس امر کی اطلاع ہیڈوے کو دے دی گئی۔ سیکرٹری ایڈمنسٹن نے سیاسی قیدیوں کی الٰہ آباد سے روانگی سے قبل گورنر جنرل کی ہدایت کے تحت لیفٹیننٹ اومینی کو ایک اور خط لکھا جس میں انھوں نے اومینی کو بتایا کہ گورنر جنرل کی یہ ہدایت ہے کہ ان لوگوں میں سے، جو بادشاہ کے ساتھ دہلی سے آئے ہیں، جو لوگ رنگون جانا پسند کریں انھیں جانے دیا جائے لیکن انھیں اس بات سے آگاہ کر دیا جائے کہ ان پر بھی وہی تمام پابندیاں ہوں گی جو دوسرے قیدیوں پر عائد ہوں گی۔ یہ بات ایک بار پھر واضح کر دی گئی کہ بہادر شاہ ظفر، زینت محل بیگم جواں بخت اور شاہ عباس کو بہرحال رنگون ہی جانا ہے۔ ۲۵۷ اسی روز ایڈمنسٹن نے ایک خط پیگو کے گورنر کو بھی روانہ کیا، جس میں دہلی کے سیاسی قیدیوں کے بارے میں بعض اہم ہدایات دی گئی تھیں۔ اس خط کا مضمون یہ تھا:

"گورنر جنرل کی ہدایت ہے کہ ان قیدیوں کے ساتھ مہذب طرزِ عمل روا رکھا جائے۔ ان کے ساتھ کسی قسم کی بے حرمتی نہ ہو۔ ان تمام باتوں کا بھی خیال رکھا جائے جو ان کے تحفظ کے لیے ضروری ہیں۔

چاروں سیاسی قیدیوں کے ساتھ گیارہ افراد ہیں جن کی فہرست اس خط کے ساتھ بھیجی جا رہی ہے۔ یہ تمام لوگ وہ ہیں جنھوں نے اپنی مرضی سے سیاسی قیدیوں کے ساتھ آنا پسند کیا ہے۔ ان تمام لوگوں کو بھی قیدیوں کے ساتھ اسی عمارت میں رکھا جائے گا اور ان کے اخراجات بھی گورنمنٹ ہی برداشت کرے گی۔ ان کا خرچ ہر اعتبار سے فیاضی کے ساتھ اٹھایا جائے لیکن ان کو نقد رقم کے طور پر کوئی وظیفہ نہیں دیا جائے گا۔ ان کے کل اخراجات کا علاحدہ سے ایک ماہانہ بل بنا کر دفتر امورِ خارجہ کو بھیجنا ہوگا۔"[۲۵۹]

(انگریزی سے ترجمہ)

ان تمام باتوں سے پتا چلتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کو سیاسی قیدی بنا کر تو رکھا گیا لیکن ان کے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی نہیں کی گئی۔ ضعیف العمری کی وجہ سے ان کی صحت کا بھی پورا خیال رکھا جاتا تھا چناں چہ طبی معائنے کی رپورٹ کے بغیر انھیں الٰہ آباد سے رنگون کے لیے نہیں روانہ کیا گیا۔ اسی طرح بادشاہ کے جو متوسلین آخر وقت بادشاہ کا ساتھ دینے کو تیار تھے انھیں بھی اس بات کی اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ بادشاہ کے ساتھ رنگون جا سکتے ہیں، جہاں ان کے رہن سہن کا خرچ گورنمنٹ برداشت کرے گی۔ ان حقائق کی روشنی میں بہادر شاہ ظفر کی اس داستانِ غم پر بھی نظرِ ثانی کی ضرورت ہے جو بعض صاحب طرز ادیبوں نے بڑی رقت کے ساتھ قلم بند کی ہے۔

۱۵ر نومبر ۱۸۵۸ء کو چار سیاسی قیدیوں اور ان کے گیارہ ہمراہیوں کا جو قافلہ الٰہ آباد سے رنگون کے لیے روانہ ہوا وہ ان افراد پر مشتمل تھا:

الف: بہادر شاہ ب: جواں بخت ج: شاہ عباس د: زینت محل

۱۔ احمد بیگ (خادم) ۲۔ سلطانہ ۳۔ عشرت ۴۔ مبارک النساء بیگم (والدہ شاہ عباس) ۵۔ نواب شاہ زمانی بیگم ۶۔ نیازو (باندی) ۷۔ حرمت بائی (باندی) ۸۔ لطفن (باندی) ۹۔ عبدالرحیم (خادم) ۱۰۔ حسینی (باندی)۔

۱۱۔ صندل (باندی)

اومینی نے بادشاہ کی ضعیف العمری کا خیال کرتے ہوئے دو مرد خادموں، احمد بیگ (بادشاہ کے لیے) اور عبدالرحیم (بیگم زینت محل کے لیے) کو خاص طور پر رنگون چلنے کے لیے مجبور کیا تھا[۲۶۰]۔ ان تمام افراد کی فہرست تیار کر کے اس خط کے ہمراہ بھیج دی گئی تھی جو پیگو کے کمشنر کو قیدیوں کی رنگون کے لیے روانگی کے سلسلے میں لکھا گیا تھا۔ وہ تمام لوگ جو الہٰ آباد تک بادشاہ کے ساتھ آئے لیکن جنھوں نے آگے جانے سے انکار کر دیا تھا ان کو الہٰ آباد کے قلعے میں محصور کر دیا گیا۔ جو افراد رنگون کے لیے بادشاہ کی روانگی کے بعد الہٰ آباد کے قلعے میں محصور کیے گئے۔ ان کے نام یہ ہیں:

"۱۔ مرزا قیصر ۲۔ مرزا خضر ۳۔ جواں بخش (خواجہ سرا) ۴۔ تاج محل بیگم (زوجہ ظفر)

۵۔ ممتاز دلہن بیگم (جواں بخت کی ساس) ۶۔ رقیہ سلطان بیگم (جواں بخت کی سالی) ۷۔ رحیمہ

۸۔ طہارت ۹۔ کیمیا ۱۰۔ وفادار ۱۱۔ راحت ۱۲۔ جمعیت

۱۳۔ مبارک"[۲۶۱]

۹ نومبر ۱۸۵۸ء کو طلوع آفتاب کے وقت سیاسی قیدیوں کا قافلہ الہٰ آباد سے مرزا پور پہنچ گیا۔ مرزا پور سے ہگلی کے راستے اگلے سفر کی تیاری کی گئی۔ ایک فوجی کشتی میں جس کا نام ' سوربنا فلیٹ ' تھا، قیدیوں کو سوار کر دیا گیا اور اس کشتی کو ایک فوجی اسٹیمر سے جوڑ دیا گیا۔ اس اسٹیمر کا نام تھا ٹیمز۔ یہ اسٹیمر اسی روز یعنی ۱۹ نومبر ۱۸۵۸ء کو دوپہر دو بجے دریائے ہگلی کے راستے کلکتے کے لیے روانہ ہو گیا اور اگلے روز یعنی ۲۰ نومبر کو کلکتے پہنچ گیا۔ کلکتے سے روانہ ہو کر یہ اسٹیمر ۲۲ نومبر کو بکسر، ۲۳ نومبر کو دیناپور، ۲۵ نومبر کو منگیر، ۲۷ نومبر کو راج محل، ۲۸ نومبر کو رام پور بلیا، ۲۹ نومبر کو دمودر کلی، یکم دسمبر کو کھلنا اور ۴ دسمبر کی صبح نو بجے ڈائمنڈ ہاربر پہنچ گیا۔ ڈائمنڈ ہاربر پر قیدیوں کو کشتی سے اتار کر انھیں انگریزی جنگی جہاز میگوٹرا میں سوار کر دیا گیا۔ ۴ دسمبر ہی کو ساڑھے گیارہ بجے دن کو یہ جہاز ڈائمنڈ ہاربر سے روانہ ہو کر اسی روز شام کو کیڈگری پہنچ گیا جہاں سے دوسرے روز یعنی ۵ دسمبر ۱۸۵۸ء کو جا کر یہ جہاز رنگون کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا اور سیاسی قیدیوں کو رنگون میں اتار دیا گیا۔[۲۶۲]

ظفر رنگون میں

بہادر شاہ ظفر اپنے قافلے کے ساتھ ۹ دسمبر ۱۸۵۸ء کو رنگون پہنچے۔ چار روز کے بعد یعنی ۱۳ دسمبر کو پیگو کے کمشنر میجر اے۔ پی۔ فائل نے حکومت ہند کے سیکرٹری جی۔ این۔ ایڈمنسٹن کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں سیکرٹری کے ۱۱ نومبر ۱۸۵۸ء کے خط کا حوالہ دیتے ہوئے جو الٰہ آباد سے قیدیوں کی روانگی سے دو روز قبل لکھا گیا تھا، قیدیوں کے رنگون پہنچنے کی اطلاع دی اور ساتھ ہی سیاسی قیدیوں کے حالات بھی بیان کیے۔ اس خط کا مضمون حسب ذیل ہے:

"میں جناب کو آپ کے خط نمبر ۴۲۶۵ مورخہ ۱۲ نومبر ۱۸۵۸ء کی وصول یابی کی اطلاع دیتے ہوئے جواباً عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ایم۔ ایچ۔ جے میگو ٹرا چار شاہی قیدیوں اور ان کے گیارہ مرد و زن ملازمین کو (جیسا کہ جناب کی منسلکہ فہرست میں درج ہے) لے کر ۹ دسمبر ۱۸۵۸ء کو رنگون پہنچ گیا۔

فی الحال قیدیوں کو رنگون کے مین گارڈ (MAIN GUARD) میں رکھا گیا ہے جہاں ان کے قیام کی مناسب گنجائش ہے۔ ان کے تحفظ کے لیے نمبر ۶۸ پیادہ رجمنٹ کا ایک دستہ تعینات کر دیا گیا ہے۔ آپ کے (زیر جواب) خط میں قیدیوں اور ان کے ملازمین سے متعلق جو ہدایات درج ہیں ان پر سختی سے عمل درآمد کیا جا رہا ہے۔

میں نے لیفٹیننٹ اومینی کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ احکام کے مطابق روزانہ ڈائری لکھیں .... رنگون سے میری غیر حاضری کے دوران ہو سکتا ہے کہ ڈائری کا خلاصہ بھیجنے میں کچھ دیر ہو جائے لیکن اس بات کی پوری کوشش کی جائے گی کہ زیادہ دیر نہ ہونے پائے۔"[۲۶۳]

سیاسی قیدی جب رنگون پہنچے تو اس وقت تک ان کے قیام کا کوئی معقول انتظام نہیں ہوا تھا اس لیے ان کو مین گارڈ کے احاطے میں ٹھہرایا گیا۔ ان میں کچھ لوگوں کے لیے خیمے نصب کیے گئے اور ان خیموں کے چاروں طرف پردے کے لیے قناتیں لگا دی گئیں۔ باقی لوگوں کو مین گارڈ کی بلڈنگ میں پارٹیشن کر کے ٹھہرا دیا گیا۔ اسی اثنا میں قیدیوں کے لیے مکان کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا

اور ۲۹ راپریل ۱۸۵۹ء کو وہ اپنی نئی قیام گاہ میں منتقل ہو گئے۔[264] سیاسی قیدیوں کے لیے تعمیر ہونے والا یہ مکان مین گارڈ سے بالکل قریب تھا۔ یہ برما کے عام لکڑی کے مکانوں کی طرح تھا جو سطح زمین سے کافی اونچائی پر بنایا گیا تھا۔ یہ مربع شکل کا احاطہ ۱۰۰ × ۱۰۰ فٹ تھا۔ اس کے چاروں طرف دس فٹ اونچی احاطے کی دیوار کھنچی ہوئی تھی اس میں سولہ فٹ مربع شکل کے چار کمرے تھے۔ ان میں سے ایک کمرے میں بہادر شاہ ظفر کو دوسرے میں نواب زینت محل بیگم کو، تیسرے میں جواں بخت اور اس کی بیوی کو اور چوتھے میں شاہ عباس اور اس کی والدہ مبارک النساء بیگم کو رکھا گیا تھا۔ ہر کمرے سے ملحق ایک غسل خانہ تھا۔ نوکروں کے قیام کا انتظام مکان کے برآمدوں میں تھا۔ ان کے لیے غسل خانے اور پاخانے کا انتظام علاحدہ تھا۔ ایک کمرہ باورچی خانے کے طور پر بھی فراہم کیا گیا تھا۔[265] میجر فائل لکھتا ہے کہ یہ مکان ایک کشادہ جگہ میں بنا ہوا تھا جس کے نواح میں ایک طرف بودھوں کا مشہور شویڈیگن پگوڈا تھا اور دوسری طرف دریا اور جہاز رانی کا خوش نما منظر۔ قیدیوں کے افسر انچارج نے ایگزیکیوٹو انجینئر کے سامنے اس جگہ کو بہتر بنانے کے لیے کچھ اور تجویزیں بھی رکھیں جن پر عمل درآمد ہوا۔[266]

یکم اپریل ۱۸۵۹ء کو کیپٹن نیلسن ڈیوس نے لیفٹیننٹ اومینی سے سیاسی قیدیوں کا چارج لے لیا۔ اس کے بعد سے آخر تک قیدی انھی کے چارج میں رہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا کو اپنی رپورٹ میں ڈیوس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ شاہی قیدیوں کے رنگون پہنچنے پر رنگون میں مقیم ہندوستانی مغل تاجروں نے شروع شروع میں معمولی تشویش ظاہر کی تھی لیکن رفتہ رفتہ وہ تشویش ختم ہو گئی۔ سیاسی قیدیوں کی خوراک کا ذکر کرتے ہوئے ڈیوس لکھتا ہے کہ ان کی خوراک کا خرچ ہندوستان کے مقابلے میں یہاں زیادہ ہے۔ سولہ قیدیوں کی خوراک پر لگ بھگ گیارہ روپے یومیہ خرچ ہوتے ہیں۔ اور چوں کہ چیزوں کی قیمتیں بڑھ رہی ہیں اس لیے ہو سکتا ہے کہ یہ خرچ اور بڑھ جائے۔ جب سے ڈیوس نے قیدیوں کا چارج لیا تھا تب سے قیدیوں کو ٹوائلٹ وغیرہ کے لیے ہر اتوار کو ایک روپیا اور ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو دو روپے مزید ملتے تھے۔ قیدیوں کو قلم دوات اور کاغذ رکھنے کی سختی کے ساتھ ممانعت تھی۔ ڈیوس روزانہ قیدیوں کی خوراک کے بارے میں معلومات کرتا تھا اور اس کی ہر ممکن کوشش یہی ہوتی تھی کہ قیدیوں کو بہتر کھانا ملے۔ قیدیوں کے لیے جو عملہ ملازم رکھا گیا تھا اسے کم سے کم تنخواہ پر حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ روزانہ کے

سوداسلف کے لیے ایک چپراسی رکھا گیا تھا۔ یہ شخص ویسے تو برما کا باشندہ تھا لیکن ہندوستانی خوب اچھی جانتا تھا اور اس اعتبار سے قیدیوں اور افسروں کے بیچ میں رابطے کا کام بھی دیتا تھا۔ یہ شخص اگرچہ ہندوستانی ملازم کے مقابلے میں کچھ زیادہ تنخواہ پر ہاتھ آیا تھا لیکن سیاسی مصلحت کی بنا پر ہندوستانی ملازم کے مقابلے میں اس کو ترجیح دی گئی تھی۔ ایسا اس لیے کیا گیا تھا تاکہ اُس کے اور سیاسی قیدیوں کے درمیان کوئی جذباتی تعلق نہ قائم ہو جائے۔ اس کے علاوہ تین ملازم اور تھے ایک سقّا ایک دھوبی اور ایک مہتر۔ یہ تینوں ملازم ہندوستانی تھے لیکن انھیں قیدیوں کے ساتھ رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ بادشاہِ دہلی کی صحت تسلّی بخش تھی حالاں کہ جس وقت دسمبر ۱۸۵۸ء میں وہ رنگون آئے تھے تو ڈاکٹر ولسن سول سرجن کو ان کی صحت کی طرف سے کافی تشویش تھی۔ لیکن جب سے بادشاہ کو ان کے نئے مکان میں منتقل کیا گیا تھا ان کی صحت بہتر نظر آرہی تھی۔ ان کا حافظہ اچھا تھا لیکن دانت گر جانے کی وجہ سے الفاظ کی ادائگی میں دقّت ہوتی تھی۔ بیگم زینت محل کی صحت اچھی تھی۔ ڈیوس کی بیوی نے اور پردے کے پیچھے سے خود ڈیوس نے بھی ان سے کئی بار ملاقات کی۔ زینت محل کو شکایت تھی کہ ان کا بیس لاکھ پونڈ کی مالیت کا اسباب گورنمنٹ نے ناجائز طور پر اپنے قبضے میں کر لیا۔ حالاں کہ اس مال و اسباب کا بادشاہ یا لال قلعے سے کوئی تعلق نہیں تھا اس لیے کہ یہ سامان قلعے سے الگ ان کے ذاتی مکان میں بند تھا۔ اس کے جواب میں ڈیوس نے یہ بات ان کے ذہن نشین کرادی کہ ان کا خزانہ قلعے میں ہو یا قلعے سے باہر، لیکن بادشاہ کی بیگم ہونے کے ناتے گورنمنٹ کو ان کا خزانہ ضبط کر لینے کا حق تھا جو اس نے کیا۔ زینت محل بیگم کے بارے میں ڈیوس کی رائے کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ ایک جگہ زینت محل کے بارے میں اس نے بہت ہی عجیب انکشاف کیا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ احمد بیگ کے مقابلے میں جو بادشاہ کا خدمت گار ہے، بیگم زینت محل کا خدمت گار انتہائی نیچ اور مکّار قسم کا انسان ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اصل میں زینت محل بیگم کے ساتھ اس کے کس طرح کے تعلقات ہیں۔ آیا وہ محض خدمت گار ہی ہے یا اس سے بھی کچھ زیادہ۔[۲۶]

دونوں شہزادوں مرزا جواں بخت اور شاہ عباس کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے ڈیوس لکھتا ہے کہ جواں بخت اپنے بھائی کے مقابلے میں کچھ برتر دکھائی دیتا ہے لیکن یہ برتری اس کی انفرادی صلاحیتوں کی وجہ سے نہیں بلکہ اس پوزیشن کی وجہ سے ہے جو خاندان میں اسے حاصل رہی۔

وہ ماں کے رشتے سے بھی بادشاہ زادہ ہے جب کہ شاہ عباس بادشاہ کی ایک حرم کا لڑکا ہے دونوں شہزادے کم علم ہیں۔ صرف جواں بخت کو تھوڑی بہت فارسی لکھنی پڑھنی آتی ہے۔ اگر شہزادوں سے عام موضوعات پر بھی گفتگو کی جائے تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انھیں تعلیم کی کتنی سخت ضرورت ہے۔ انھیں اپنے آبائی وطن کا حدود اربعہ تک معلوم نہیں ہے۔ ان دونوں لڑکوں کو انگریزی زبان سیکھنے کا بہت شوق ہے اور وہ اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ محض انگریزی تعلیم کے ذریعے ہی وہ اپنی موجودہ بدنصیبی کو دور کر سکتے ہیں۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ جلاوطنی کے وقت انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ انھیں کہیں اور بھیجنے کے بجائے انگلستان بھیج دیا جائے۔ ان کے والدین سے بھی میری بات چیت ہوئی اور وہ بھی اس بات کے خواہش مند ہیں۔ لڑکے خاصے ذہین ہیں اور انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اگر گورنمنٹ نے انگریزی پڑھانے کی اسکیم منظور کر لی تو وہ پوری محنت سے کام کریں گے۔ میں نے انھیں یقین دلایا ہے کہ میں ان کی خواہشات کو گورنمنٹ تک پہنچاؤں گا۔[۲۶۸]

ڈیوس نے اس سے ایک ماہ قبل بھی ایک طویل خط میں شہزادوں کی تعلیم کے بارے میں گورنمنٹ آف انڈیا کو لکھا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ دونوں شہزادے انگریزی سیکھنے کے خواہش مند ہیں لہٰذا برٹش گورنمنٹ کے لیے یہ نادر موقع ہے کہ انھیں انگریزی سکھائے جس کے ذریعے وہ اپنی تہذیب، اپنی روایات، اپنی زبان اور اپنے لوگوں سے لاشعوری طور پر رشتہ منقطع کر کے ذہنی طور پر انگریزی زبان اور تہذیب کا ایک حصہ بن جائیں گے۔[۲۶۹]

یکم جولائی ۱۸۶۱ء کو ڈیوس نے جو خط گورنر جنرل کے نام تحریر کیا اس میں وہ لکھتا ہے کہ پچھلے چھ ماہ سے سیاسی قیدیوں کی صحت اچھی ہے البتہ ابوظفر کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ سول سرجن کی رائے ہے کہ ابوظفر کی زندگی اب غیر یقینی سی ہو چلی ہے۔ بادشاہ کی بیگم زینت محل خوب تنومند ہیں۔ لیکن جواں بخت کی بیوی زمانی بیگم کو کبھی کبھی بخار کی شکایت ہو جاتی ہے۔ ویسے زمانی بیگم اور اُن کی خرد سال بچی اب ٹھیک ہیں اور جلد ہی زمانی بیگم ایک اور بچے کی ماں بننے والی ہیں۔ جواں بخت اور شاہ عباس بھی مزے میں ہیں اور میرے گھر پر پابندی سے آتے رہتے ہیں۔ وہ دونوں بریگیڈیر سارجنٹ فس نوکن سے انگریزی پڑھتے ہیں اور اس معاملے میں انھوں نے خاصی ترقی کر لی ہے۔ میری بیوی (مسز ڈیوس) کبھی کبھی زمانی بیگم کو اپنے ساتھ ہوا خوری کے لیے لے جاتی ہیں۔ زمانی بیگم اور زینت محل



رنگون میں ظفر کے آخری ایام

دونوں کبھی کبھی ایک آدھ گھنٹہ ہمارے بنگلے پر بھی گزارتی ہیں۔ قیدیوں کو اس کے سوا اب کسی بات کی شکایت نہیں ہے کہ ان کا مکان بہت گھٹا ہوا ہے۔ آج کل چوں کہ برسات کا موسم ہے اس لیے فی الحال ان کے مکان میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ اس غرض سے کہ یہ لوگ زیادہ سے زیادہ تازہ ہوا کھا سکیں میری رائے یہ ہے کہ انھیں تھوڑی سی آزادی اور دی جائے۔ دونوں بیگمات اور ان کی خدمت گاروں کو اس بات کی اجازت ہونی چاہیے کہ وہ روزانہ صبح ایک گھنٹے کے لیے گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر ہوا خوری کے لیے نکل جایا کریں اور دونوں مرد خدمت گاروں کو بھی دن میں ایک ایک گھنٹے کے لیے باری وار چھٹی مل جایا کرے۔ شہزادوں نے پچھلے کئی مہینوں سے صبح کی ہوا خوری شروع کر دی ہے۔ اگر گورنمنٹ کی اجازت ہو تو یہ دونوں شہزادے چھاؤنی کے اندر ہی ایک دو گھنٹے کے لیے بغیر سنتری کے گھوم آیا کریں۔ اس طرح کہ یہ اپنی روانگی اور آمد کی اطلاع گارڈ کے افسر کو دے دیا کریں؟[۲] اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزوں کا سلوک سیاسی قیدیوں کے ساتھ ایسا ظالمانہ نہیں تھا جیسا کہ ہمارے بعض جادو رقم ادیبوں نے بیان کیا ہے۔ رنگون کے اس مکان کا رقبہ جس میں سیاسی قیدی آباد تھے دس ہزار مربع فٹ تھا۔ ہر شخص کو ایک علاحدہ کمرہ دیا گیا اور ہر کمرے کا رقبہ دو سو چھتیس مربع فٹ تھا۔ بادشاہ کی دیکھ بھال کے لیے ایک سول سرجن تعینات تھا۔ شہزادوں کی تعلیم کا مناسب بندوبست تھا اور قیدیوں کو گھر سے باہر نکلنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع دیے جاتے تھے۔ یہ صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے جو کسی راوی کے حوالے سے اردو کے ایک ادیب نے اس طرح بیان کی ہے :

> "میں نے بہادر شاہ کو ایک کھرّی چارپائی پر پڑا ہوا دیکھا۔ ایک بوسیدہ اور پھٹا ہوا ٹاٹ انھوں نے اوڑھ رکھا تھا۔ اوپر کے ٹاٹ کو ہٹا کر بادشاہ نے اپنے بازو دکھائے جو بے بچھونے کی چارپائی پر پڑے رہنے کے باعث زخمی ہو گئے تھے اور زخموں میں کیڑے پڑے ہوئے تھے۔"[۲۶]

ڈیوس نے سیاسی قیدیوں کے سلسلے میں جو خط گورنر جنرل کو لکھا تھا اور جس میں یہ سفارش کی گئی تھی کہ قیدیوں پر سے کچھ پابندیاں اٹھالی جائیں، اس کے جواب میں گورنر جنرل نے ڈیوس کی تمام تجاویز کو منظور کر لیا۔[۲۷] فروری ۱۸۶۲ء میں نواب ممتاز دلہن بیگم نے جو جواں بخت کی ساس تھیں

اور سیاسی قیدیوں کے قافلے کے ساتھ صرف الہ آباد آکر رک گئی تھیں، اپنی بیٹی اور داماد سے ملنے کے لیے رنگون آنے کی خواہش ظاہر کی۔ چناں چہ نہ صرف یہ کہ ان کی درخواست ہی منظور کی گئی بلکہ ان کا سفر خرچ بھی حکومت نے برداشت کیا۔ نواب ممتاز دلہن کو اس بات کی بھی اجازت مل گئی تھی کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق جواں بخت کے چھوٹے بھائی شاہ عباس کی شادی کے لیے ایک لڑکی بھی اپنے ساتھ لا سکتی ہیں"۔[۲]

ظفر کی وفات

بہادر شاہ ظفر کب کے عمرِ طبیعی کو پہنچ چکے تھے۔ ضعیف العمری میں انھیں جن مصائب و آلام سے دوچار ہونا پڑا، وہ اچھے خاصے تندرست انسان کے لیے بھی جان لیوا ثابت ہو سکتے تھے۔ تخت و تاج چھن گیا۔ عزت و وقار ختم ہو گیا۔ جلا وطن کر کے ہزاروں میل دور پردیس میں ڈال دیے گئے۔ لیکن حوادث کے اس طوفان میں ان کی زندگی کی شمع کسی نہ کسی رنگ میں جلتی رہی یہاں تک کہ سحر آ پہنچی۔ رنگون میں وہ اکثر بیمار رہا کرتے تھے اور ان کے خاص معالج نے بہت پہلے یہ پیشین گوئی کر دی تھی کہ اب ان کی زندگی غیر یقینی ہے۔ اکتوبر ۱۸۶۲ء میں ان کی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ سیاسی قیدیوں کا نگراں نیلسن ڈیوس معاملے کی نزاکت کو سمجھ گیا لہٰذا اس نے اپنی کارگذاری کا روزنامچہ پابندی سے لکھنا شروع کر دیا۔ بہادر شاہ ظفر کی زندگی کے آخری چند روز کس طرح گزرے اور کیسے اس عبرت ناک زندگی سے بالآخر انھوں نے اپنا دامن چھڑایا، اس کا اندازہ ڈیوس کے روزنامچے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

"رنگون جمعرات ۲۳/ اکتوبر ۱۸۶۲ء

سیاسی قیدیوں کو دیکھا، سب ٹھیک تھا۔ ابوظفر کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔

رنگون اتوار ۲۶/ اکتوبر ۱۸۶۲ء

.....ابوظفر کا خادم احمد بیگ کہتا ہے وہ کمزور ہیں اور انھیں کھانا کھانے میں بھی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

رنگون پیر ۲۸/ اکتوبر ۱۸۶۲ء

سیاسی قیدیوں کو دیکھا۔ ابوظفر بدستور کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ اور ان

کی حالت غیر ہوتی جارہی ہے۔

رنگون بدھ ۲۹ر اکتوبر ۱۸۶۲ء

سیاسی قیدیوں کو دیکھا' ابوظفر کی حالت اچھی نہیں۔

رنگون ہفتہ یکم نومبر ۱۸۶۲ء

سیاسی قیدیوں کو دیکھا ابوظفر کی حالت تشویش ناک ہے۔

رنگون پیر ۳ر نومبر ۱۸۶۲ء

.... ابوظفر کے حلق پر فالج کا اثر ہے اس لیے کم مقدار میں بھی کھانا کھانا ان کے لیے مشکل ہے۔

رنگون بدھ ۵ر نومبر ۱۸۶۲ء

سول سرجن کو امید نہیں کہ ابوظفر اب زیادہ دن جئیں گے۔

رنگون جمعرات ۶ر نومبر ۱۸۶۲ء

ابوظفر کے حلق پر فالج کا اثر ہے اور بظاہر وہ (ڈاکٹر کے) ہاتھوں سے نکلتے جارہے ہیں۔ ان کی آخری آرام گاہ کے طور پر جو جگہ مقرر کی گئی ہے میں نے اس کے قریب اینٹیں اور گارا اکٹھا کرنے کا حکم دے دیا ہے۔

رنگون جمعہ ۷ر نومبر ۱۸۶۲ء

ابوظفر محمد بہادر شاہ آج صبح پانچ بجے انتقال کر گئے۔ چوں کہ تمام تیاریاں مکمل تھیں اس لیے آج ہی شام چار بجے مین گارڈ کے عقب میں اینٹوں کی قبر میں ان کی تدفین کر دی گئی' اور قبر کی اوپری سطح مٹی ڈال کر سطح زمین کے ساتھ ہموار کر دی گئی ہے۔ تھوڑے فاصلے پر بانسوں کا احاطہ کھینچ دیا گیا ہے تاکہ جب تک بانس گل سڑ کر گر پڑیں زمین پر گھاس اُگ چکی ہو اور کوئی علامت ایسی باقی نہ رہے جس سے آخری مغل شہنشاہ کی قبر کی نشان دہی کی جاسکے۔

مرحوم کی تجہیز و تکفین کے لیے ایک ملا کی خدمات حاصل کی گئی تھیں جنازے کو ایک صندوق میں رکھ کر اوپر سے سرخ رنگ کی ایک سوتی چادر سے ڈھانپ

دیا گیا تھا۔ مسلمانوں کا ایک ہجوم بازار سے آکر احاطے کے قریب جمع ہو گیا تھا لیکن اس ہجوم کو ایک خاص فاصلے پر رکھا گیا اس طرح کہ ان میں سے کوئی بھی میت کو نہ چھو سکے۔ کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش نہیں آیا .... بادشاہ کے دونوں بیٹے جواں بخت اور شاہ عباس اور بادشاہ کا خادم احمد بیگ جنازے کے ساتھ تھے۔ شاہی خاندان کے دیگر افراد (بچوں اور عورتوں) کو جنازے میں شرکت کی اجازت نہیں تھی۔

رنگون پیر ۱۰ر نومبر ۱۸۶۲ء

بوڑھے اور بیمار بادشاہ کے انتقال پر خاندان کا کوئی فرد بھی پریشان خاطر نظر نہیں آتا۔ بظاہر وہ اس واقعے سے کچھ مطمئن نظر آتے ہیں اور دونوں لڑکوں میں بڑا لڑکا (جواں بخت) تو شاید یہ محسوس کرتا ہے کہ اس واقعے سے اس کی پوزیشن پہلے کے مقابلے میں کچھ اونچی ہو گئی ہے۔"[۲۶۴]

(انگریزی سے ترجمہ)

جیسا کہ ڈیوس کی ڈائری سے معلوم ہوا بہادر شاہ ظفر کا انتقال ۷ر نومبر ۱۸۶۲ء بروز جمعہ فالج کے مرض میں صبح پانچ بجے ہوا اور اسی روز شام کو چار بجے ان کی تدفین عمل میں آگئی۔ ڈیوس نے بہادر شاہ ظفر کی وفات کی مفصل رپورٹ تیار کی اور ساتھ ہی بادشاہ کی وفات کے بارے میں سول سرجن کا سرٹیفکٹ بھی منسلک کیا۔ اس سرٹیفکٹ میں سول سرجن نے بادشاہ کی موت کی تصدیق اس طرح کی تھی:

رنگون ۷ر نومبر ۱۸۶۲ء

تصدیق کیا کہ سابق بادشاہِ دہلی محمد بہادر شاہ پر فالج کا زبردست حملہ ہوا اور اس کے سبب وہ آج صبح پانچ بجے فوت ہو گئے۔

دستخط جے۔ ای۔ ڈِکنسن

سول سرجن

سیاسی قیدیوں کا میڈیکل انچارج"[۲۶۵]

بہادر شاہ ظفر کی وفات پر عبد الغفور نسّاخ نے حسب ذیل تاریخ کہی :

وائے ویلا چوں بہادر شاہ مرد عالمے شد باغم و با رنج جفت
سالِ ترحیلش ملک از آسماں ناگہاں بخشائش اللہ گفت[۲۶]

۱۲۷۹ھ

صہبائی نے "چراغِ دہلی" (۱۲۵۳ھ) بہادر شاہ ظفر کے جلوس کی تاریخ نکالی تھی۔ اب ان کی وفات پر اسی رعایت سے وفات کی تاریخ "بجھا ہے چراغِ دہلی" نکال کر اس طرح نظم کی :

"چراغ دہلی" جلوس کا سال تھا سو اب بھی مطابق اس کے
سروشِ غیبی نے سالِ رحلت کہا "بجھا ہے چراغ دہلی"[۲۷]

۱۲۷۹ھ

جیسا کہ ڈیوس کے خط سے پتا چلتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کی تدفین اس طرح کی گئی کہ ان کی قبر کا نشان بھی نہ ملے اور ایسا ہی ہوا بھی۔ ظفر کی وفات کے کچھ عرصے بعد کچھ مسلمان ہندوستان سے رنگون گئے اور انھوں نے بہادر شاہ ظفر کی قبر پر فاتحہ پڑھنی چاہی تو اس جگہ جہاں ظفر کو دفن کیا گیا تھا انھیں سوائے ایک چٹیل میدان کے اور کچھ نہ ملا۔ ان لوگوں نے با اثر حلقوں میں جا کر اس بات کی کوشش کی کہ بہادر شاہ ظفر کے مزار کی باقاعدہ تعمیر ہو جائے۔ اسی سلسلے میں "بہادر شاہ درگاہ ٹرسٹ" کا قیام عمل میں آیا۔ اس ٹرسٹ نے عوام کے نام ایک اشتہار جاری کیا جس میں اپیل کی گئی تھی کہ وہ بہادر شاہ ظفر کے مزار کی تعمیر کے لیے چندہ دیں۔ ٹرسٹ نے ایک معقول رقم جمع کر لی اور اس سرمایے سے ظفر کا مزار تعمیر کرایا گیا۔ مزار کے سرھانے ایک کتبہ بھی نصب کیا گیا جس کی عبارت حسبِ ذیل تھی :

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خاندانِ مغلیہ کا آخری چراغ

حضرت ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر رحمۃ اللہ علیہ

۱۸۳۷ء جلوس تا ۱۸۵۸ء

آج بتاریخ ۷ نومبر ۱۸۶۲ء مطابق ۱۴ جمادی الاول ۱۲۷۹ھ جمع کردہ

روح جو نواسی سال بہادر شاہ کے جسم میں موجود رہی، زندگی کے تمام تماشے دکھاکر وداع کی تیاری کر رہی ہے۔ دن ڈھل چکا اور اس کے ساتھ ہی بادشاہ کا پیمانۂ عمر بھی لبریز ہو گیا۔ رنگون کی خاک اس کو آغوش میں لیتی ہے جو خاندانِ تیموریہ کا آخری چراغ تھا۔ جس نے جہان آباد میں جنم لیا وہ وطن سے ہزاروں کوس دور ایک معمولی پلنگ پر پڑا دم توڑ رہا ہے۔ سکرات طاری ہے سانس اکھڑ چکا ہے۔ جس کی زندگی سچ مچ کا میلا تھا جس نے زندگی کا ہر لمحہ جمگھٹوں میں گزارا آج صرف تین آدمی، ایک بیوی اور دو بچے اس کے دمِ واپسیں میں ساتھ ہیں۔ آفتاب بھی غروب نہ ہوا تھا کہ اس بادشاہ نے فانی دنیا کو اپنی عسرت کی تصویر دکھا کر دنیا سے کوچ کیا اور شاہ جہاں آباد کا یہ گوہرِ آب دار رنگون کی خاک میں ابدی نیند سو گیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

تاریخِ وفات

چودہ جمادی الاوّلیں جمعے کا روز وقتِ عصر
حالتِ قیدِ بےکسی تھی یہ گھڑی بہت کٹھن
وقت نے شاہِ ہند سے عرض کیا وطن سے دور
خلد ہے آپ کا وطن اے ظفرِ جلا وطن" ۲۷۸

۱۲۷۹ھ

چوں کہ یہ کتبہ ظفر کی وفات کے بہت دن بعد مزار پر نصب ہوا تھا اس لیے صحیح معلومات کی کمی کی وجہ سے اس کی عبارت میں کئی غلطیاں ہو گئی ہیں۔ بادشاہ کا انتقال، جیسا کہ ڈیوس کی رپورٹ سے ظاہر ہے، صبح پانچ بجے ہوا اور شام چار بجے ان کی تدفین عمل میں آئی، لیکن کتبے کی عبارت میں لکھا ہے "آفتاب غروب بھی نہ ہوا تھا کہ اس بادشاہ نے فانی دنیا کو اپنی عسرت کی تصویر دکھا کر دنیا سے کوچ کیا"۔ یہی غلطی کتبے کی عبارت میں آگے چل کر قطعۂ تاریخ کے اس مصرعے :
"چودہ جمادی الاوّلیں جمعے کا روز وقتِ عصر" میں بھی دہرائی گئی۔ اسی بنیاد پر مالک رام نے بھی بہادر شاہ ظفر کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے یہی لکھا کہ :

"۷ر نومبر ۱۸۶۲ء کو مغرب کے وقت بعارضۂ فالج جاں بحق ہوئے۔"[279]

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ظفر کا انتقال ۷ر نومبر ۱۸۶۲ء بروز جمعہ صبح پانچ بجے ہوا۔ اور ان کی تدفین اسی روز شام عصر اور مغرب کے بیچ غروب آفتاب سے پہلے عمل میں آئی۔

ظفر کا خاندان

بہادر شاہ ظفر کی داستانِ حیات تو یہاں ختم ہو جاتی ہے لیکن چوں کہ ان کی موت رنگون میں جلاوطنی میں ہوئی تھی جہاں ان کے ساتھ ان کے خاندان کے کچھ اور افراد بھی تھے اس لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ ظفر کے بعد ان کے ورثا کا کیا انجام ہوا۔ رنگون میں ظفر کے ساتھ ان کی بیگم نواب زینت محل، اور ان کے دو بیٹے مرزا جواں بخت اور شاہ عباس تو تھے ہی لیکن ظفر کے انتقال کے کچھ عرصے بعد ان کے ایک اور بیٹے مرزا کوچک سلطان کو بھی جو ایامِ 'غدر' سے لاپتا تھے اور جے پور میں روپوش تھے، گرفتار کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔ اس طرح ظفر کے بعد رنگون میں ان کے چار وارث موجود تھے۔

زینت محل بیگم

بہادر شاہ ظفر کی بیوہ زینت محل بیگم کو بادشاہ کے انتقال کے بعد حکومت کی طرف سے رہنے کو ایک مکان دیا گیا اور ایک سو بیس روپے ماہانہ پنشن مقرر کر دی گئی۔[280] بہادر شاہ ظفر کے انتقال کے بعد وہ لگ بھگ پونے چار سال اور نظر بند رہیں۔ ۱۵ر فروری ۱۸۶۶ء کو انھوں نے گورنر جنرل کے نام ایک درخواست دی جس میں اپنی رہائی کے مطالبے کے ساتھ ساتھ رہنے کے لیے ایک مکان اور اخراجات کے لیے پنشن میں اضافے کا مطالبہ کیا۔ ۱۶ر جون ۱۸۶۶ء کو زینت محل کی رہائی کا حکم صادر ہو گیا لیکن رہائی کی شرط یہ تھی کہ وہ رنگون میں ہی رہیں گی۔ اس کے ساتھ ہی سرکار کی طرف سے ان کا دو سو پچاس روپے ماہانہ مقرر ہو گیا۔[281] تقریباً ڈیڑھ سال بعد یعنی ۲۲ر جنوری ۱۸۶۸ء کو زینت محل نے ایک بار پھر ایک عرضی سرکار کو دی جس میں کہا گیا کہ برما جیسے مہنگائی والے ملک میں دو سو پچاس روپے گزارے کے لیے ناکافی ہیں۔ لہٰذا اس رقم میں مزید اضافہ کیا جائے لیکن اس وقت ان کی یہ درخواست مسترد کر دی گئی۔[282] اس کے کچھ ہی عرصے بعد ان کے چار سو روپے ماہانہ مقرر ہو گئے لیکن کچھ ہی دن بعد یہ رقم بھی قلیل اور ناکافی ثابت ہوئی۔ چناں چہ ۲۲ر دسمبر ۱۸۸۱ء کو پھر ایک عرضی گورنر جنرل کے نام پہنچی کہ پنشن میں

اضافہ کیا جائے۔ اس مرتبہ زینت محل کی عرضی کے ساتھ سیکرٹری جی۔ڈی۔ برگس کا سفارشی خط بھی تھا اس خط میں لکھا تھا کہ یہ خاتون بوڑھی ہو چکی ہیں اور ان کے زیادہ دن زندہ رہنے کی امید نہیں۔ اس کے علاوہ ان کا چال چلن بھی پچھلے دنوں تسلی بخش رہا ہے۔ یہ نہایت خاموش زندگی گزارتی ہیں لہٰذا اس بات کی مستحق ہیں کہ ان کے معاملے پر ہمدردی سے غور کیا جائے۔ اس عرضی کے جواب میں زینت محل کی پینشن پانچ سو روپے ماہانہ ہوگئی جو انھیں آخر دم تک ملتی رہی[۲۸۳]۔

زینت محل جب سے رنگون آئی تھیں انھیں افیون کھانے کی لت پڑ گئی تھی۔ وہ چوبیس گھنٹے میں تقریباً دس گرین افیون کھایا کرتی تھیں۔ آخری دنوں میں انھیں مستقل قبض کی شکایت رہنے لگی تھی جس کے سبب بعض اوقات ان پر درد قولنج کا شدید حملہ ہوتا تھا۔ ۱۸۸۴ء میں ان پر اس بیماری کا شدید حملہ ہوا۔ اس کے بعد نومبر ۱۸۸۵ء میں پھر وہ تقریباً ایک ماہ اس عارضے میں مبتلا رہیں۔ اس بیماری سے وہ آخر دم تک کبھی بھی پوری طرح شفایاب نہیں ہو پائیں۔ ۸ر جولائی ۱۸۸۶ء کو انھوں نے شدید درد کی شکایت کی۔ پانچ روز تک انھیں لگاتار بخار رہا۔ یہاں تک کہ تکلیف کی شدت کی وجہ سے وہ کئی رات سو بھی نہیں سکیں۔ آٹھویں روز ان کی نبض ڈوبنی شروع ہوگئی۔ اور بخار تیز ہو گیا اور آخر نویں دن یعنی ۱۷ر جولائی ۱۸۸۶ء کو صبح اس بیماری نے ان کی جان لے کر ہی پیچھا چھوڑا۔ زینت محل کی بہو شاہ زمانی بیگم اور ان کے پوتے جمشید بخش کی خواہش کے مطابق زینت محل کو بہادر شاہ ظفر کی قبر کے پاس دفن کیا گیا۔ چیف کمشنر نے ان کی تجہیز و تکفین کے لیے ورثا کو ایک ہزار روپیہ دیا[۲۸۴]۔

جواں بخت

اسیری کے دنوں میں جواں بخت کو دو سو روپے ماہانہ پینشن ملتی تھی جب کہ مکان اور ملازمین، سرکار کی طرف سے مفت تھے[۲۸۵]۔ جون ۱۸۶۶ء میں جواں بخت نے، جو ابھی نظر بند ہی تھے، گورنر جنرل کو ایک عرضی بھیجی جس میں انھوں نے زور دے کر یہ بات کہی تھی کہ ان کا بغاوت سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا اور یوں بھی وہ 'غدر' کے زمانے میں کم سن تھے لہٰذا وہ صرف اس لیے موردِ عتاب ہیں کہ ان کے والدین اس جرم میں ماخوذ تھے۔ جواں بخت نے اپنی درخواست میں کہا تھا کیوں کہ ان کے والد کے انتقال کو اب تین سال ہو چکے ہیں لہٰذا ان پر سے نظر بندی

کی پابندی ہٹالی جائے۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی مطالبہ کیا تھا کہ رہائی کے بعد ان کے رہنے کے لیے مکان کا بندوبست کیا جائے اور ان کی پنشن اتنی مقرر کی جائے کہ وہ برما جیسے ملک میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ باعزت زندگی بسر کر سکیں۔ ۱۶ر جون ۱۸۶۶ء کو جواں بخت کی رہائی کا حکم ہو گیا۔ تین سو روپے ماہانہ پنشن مقرر ہوئی اور پانچ سو روپے کی رقم بطور عطیہ مکان کی آراستگی کے لیے دی گئی۔[۲۸۶] ۱۱ر جنوری ۱۸۶۸ء کو جواں بخت نے گورنر جنرل کے نام پھر ایک درخواست روانہ کی جس میں لکھا تھا کہ اتنی قلیل پنشن میں ان کا گزارا مشکل ہے۔ اس لیے کہ برما جیسے ملک میں مکان کے کرایے سے لے کر نوکروں کی تنخواہ اور روزمرہ ضروریاتِ زندگی تک ہر شے مہنگی ہے۔ جواں بخت کی اس درخواست پر کوئی غور نہیں ہوا اور گورنر جنرل کی طرف سے صاف انکار ہو گیا۔ اس سے پہلے ایک موقعے پر جواں بخت یہ درخواست بھی دے چکے تھے کہ ان کی تنخواہ تین ہزار روپے ماہانہ کر دی جائے اس لیے کہ 'غدر' سے پہلے انھیں یہی تنخواہ ملتی تھی لیکن اس کے جواب میں ان کی وہی تین سو روپے کی پنشن برقرار رہی۔[۲۸۷]

جواں بخت کے دو بچے تھے، ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ لڑکی بڑی تھی۔ ۱۸۶۸ء اور ۱۸۷۹ء کے درمیان کسی سال جواں بخت نے اپنی لڑکی کی شادی کر دی تھی۔ اس شادی کی وجہ سے انھیں مالی مشکلات نے گھیر لیا اور ان پر بہت سا قرض ہو گیا۔ دسمبر ۱۸۷۹ء میں جواں بخت نے چیف کمشنر کے نام ایک درخواست دی جس میں اپنی مالی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے گورنمنٹ سے مالی امداد چاہی۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے قرض خواہوں کی فہرست اور اپنے ماہانہ اخراجات کا بل بھیجا تاکہ سرکار اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ یہ مطالبہ بے جا نہیں، ان کی درخواست منظور کرے۔ قرض کی کل رقم تین ہزار ایک سو ستتر روپے تھی۔ جس کی تفصیل اس طرح تھی؛

اشرف	۱۰۰۰ روپے
امام خاں	۹۰۰ "
میسرز بتھانزے اینڈ کو	۲۷۰ "
نتھی اینڈ فرینڈز	۲۵۰ "
مسٹر چل	۱۱۰ "

روا ینڈا کو	۲۳۰ روپے
منشی خواجہ امجد	۴۱۷ 〃
	۳۱۷۷ روپے

نوکروں کے عملے کے ماہانہ اخراجات کا حساب اس طرح تھا:

ایک بیرا	۱۴ روپے
دو خدمت گار	۲۸ 〃
دو مالی (رنگون)	۲۰ 〃
دو مالی (جنگل)	۲۲ 〃
دو سائیس	۲۴ 〃
ایک کوچوان	۱۶ 〃
ایک گھسیارہ	۱۲ 〃
ایک باورچی	۱۸ 〃
ایک باورچن	۱۰ 〃
ایک درزی	۱۶ 〃
ایک سقّا	۸ 〃
ایک دھوبی۔	۱۰ 〃
ایک جھاڑو والا	۸ 〃
ایک حجّام	۲ 〃
ایک نعل بند	۸ 〃
ایک منشی	۳۰ 〃
چار گھوڑوں کی خوراک بارہ روپے کے حساب سے	۴۸ 〃
گاڑیوں میں تیل وانشر وغیرہ ڈالنا	۳ 〃
	۲۹۷ روپے

جواں بخت کا مطالبہ تھا کہ گورنمنٹ انھیں چار ہزار روپے بطور قرض دے دے تاکہ اس رقم سے وہ اپنا قرض بھی اتار دیں اور بقیہ رقم سے اپنے لیے رنگون سے دس میل دور ایک باغ میں جو ان کی ملکیت ہے ایک بنگلہ بنوالیں۔ قرض کی ادائیگی کی شرط یہ پیش کی گئی کہ سو روپے ماہانہ اس وقت تک ان کی تنخواہ سے کٹتا رہے، جب تک کہ قرض کی تمام رقم ادا نہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ عید اور بقرعید کے تہواروں کے لیے بھی جواں بخت کے پاس کچھ نہیں تھا اس لیے جواں بخت نے گورنر جنرل کی توجہ اس طرف بھی مبذول کرائی۔ اس درخواست کے جواب میں گورنر جنرل کی طرف سے چیف کمشنر کے نام جو احکام صادر ہوئے وہ بڑے امید افزا تھے۔ گورنر جنرل نے لکھا تھا کہ جواں بخت کو ساڑھے تین ہزار روپیا قرض اتارنے کے لیے دیا جائے اور ایک ہزار روپیا بنگلہ بنانے کے لیے اور یہ رقم سو روپے ماہانہ کے حساب سے ہر ماہ جواں بخت کی تنخواہ سے وضع کرلی جایا کرے۔ اس کے علاوہ عید اور بقرعید کے تہواروں کے لیے تین تین سو روپے علاحدہ منظور ہو گئے۔ یہ واقعہ فروری ۱۸۸۱ء کا ہے۔ جولائی کے مہینے میں جواں بخت نے پھر درخواست دی کہ چوں کہ قرض کی رقم زیادہ نہیں ہے اس لیے ان کی تنخواہ میں سے سو روپے ماہانہ کے بجائے پچاس روپے ماہانہ وضع کیے جائیں۔ گورنر جنرل نے یہ درخواست بھی منظور کرلی۔"

ستمبر ۱۸۸۴ء میں جواں بخت کی طبیعت کچھ خراب ہوئی۔ تبدیلِ آب و ہوا کے لیے انھیں رنگون سے مولمین بھیج دیا گیا، جہاں پہنچ کر ان پر فالج کا حملہ ہوا اور اس کے ساتھ ان کی جگر کی تکلیف اور یرقان نے بھی، جس میں وہ پہلے سے مبتلا تھے، تشویش ناک صورت اختیار کرلی۔ ۱۹ ستمبر ۱۸۸۴ء کو رات کے دو بجے جواں بخت کو خون کی دو اُلٹیاں ہوئیں اور ان کا انتقال ہو گیا۔ اسی روز رات کو مولمین میں ہی جواں بخت کی تجہیز و تکفین ہو گئی۔ ایک تجویز یہ تھی کہ جواں بخت کے جنازے کو رنگون لاکر بہادر شاہ ظفر کے قریب ہی سپردِ خاک کیا جائے، لیکن حکومت نے یہ تجویز مسترد کردی۔[۲۸۹]

شاہ عباس

بہادر شاہ کے ورثا میں سب سے پہلے شاہ عباس ہی کی رہائی ہوئی تھی۔ اُن کی رہائی کا حکم بہادر شاہ کی موت کے لگ بھگ ڈیڑھ سال بعد ۱۸ مارچ ۱۸۶۴ء کو جاری ہوا تھا۔ شاہ عباس نے برما کے ایک مسلمان تاجر محمد طائر کی لڑکی سے شادی کرلی تھی اور انھیں اس بات کی اجازت

مل گئی تھی کہ وہ اپنے خسر کے ساتھ رہ سکتے ہیں، جن کے ساتھ وہ جلد ہی کاروبار میں بھی شریک ہونے والے تھے۔ تاہم انھیں یہ حکم تھا کہ وہ ہر ہفتے آفس انچارج کو رنگون میں اپنی موجودگی کی رپورٹ کیا کریں گے۔ ۶ر جولائی ۱۸۶۳ء کو شاہ عباس کی پچیس روپے ماہانہ پینشن بھی مقرر ہو گئی تھی۔ ۲۲ر جنوری ۱۸۶۸ء کو شاہ عباس نے گورنر جنرل سے درخواست کی کہ پینشن کی رقم ان کے اخراجات کے لیے ناکافی ہے اس میں اضافہ کیا جائے لیکن شاہ عباس کی یہ درخواست نامنظور ہو گئی۔[۲۹۰] شاہ عباس کے بارے میں اس سے آگے اور کچھ پتا نہیں چلتا۔

مرزا کوچک سلطان

مرزا کوچک سلطان ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد دلّی سے بھاگ کر جے پور میں روپوش ہو گئے تھے۔ ۱۸۶۲ء میں انھیں بغاوت کے جرم میں مجرم قرار دیا گیا اور انھیں عمر قید کی سزا دے دی گئی۔ ۲۶ر اپریل ۱۸۶۵ء کو انھیں رنگون کے لیے روانہ کر دیا گیا جہاں وہ اسی سال کے وسط میں پہنچے۔ رنگون پہنچنے کے بعد مرزا کوچک کو شروع ہی سے نظر بندی کی پابندیوں سے آزاد رکھا گیا لیکن شاہ عباس کی طرح انھیں بھی یہ حکم تھا کہ وہ ہفتے میں ایک بار ضرور رپورٹ کریں گے۔ شاہ عباس ہی کی طرح ان کی بھی پچیس روپے ماہانہ پینشن مقرر ہو گئی۔ ۱۱ر جنوری ۱۸۶۸ء کو مرزا کوچک نے بھی گورنر جنرل کو ایک درخواست بھیجی کہ پینشن کی رقم ان کے اخراجات کے لیے ناکافی ہے لہٰذا اس میں اضافہ کیا جائے۔ ان کی یہ درخواست نامنظور ہو گئی۔[۲۹۱] لیکن اس کے بعد ۱۸۷۳ء میں مرزا کوچک سلطان کی پینشن میں پچاس روپے ماہانہ کا اضافہ ہو گیا اور اب انھیں پچیس کے بجائے پچھتر روپے ملنے لگے۔ فروری ۱۸۸۳ء میں مکان بنانے کے لیے مرزا کوچک کو چھے سو روپے قرض ملے۔ یہ روپیا انھیں چوبیس قسطوں میں واپس کرنا تھا لیکن ابھی تین سو روپے ہی ادا ہوئے تھے کہ اچانک ۲۰ر فروری ۱۸۸۴ء کو مرزا کوچک کا انتقال ہو گیا۔ مرزا کوچک کی لڑکی اختر زمانی بیگم کو دس روپے ماہانہ پینشن شادی کے وقت تک کے لیے منظور ہو گئی۔ مرزا کوچک کی بیوی کی پچیس روپے ماہانہ پینشن اس شرط پر مقرر ہوئی کہ اگر ان کی وفات ہو گئی یا انھوں نے دوسری شادی کر لی تو یہ امداد بند ہو جائے گی۔ مرزا کوچک سلطان پر قرض کے جو تین سو روپے بقایا تھے وہ گورنمنٹ نے معاف کر دیے اور مکان ان کے ورثا کو دے دیا۔[۲۹۲]

حواشی سوانح

۱۔ نادرات شاہی، ص ۵

۲۔ نادرات شاہی، ص ۵

۳۔ (الف) مدّتِ فرماں روائی و حکمرانی حضرت عرش منزل عالمگیر ثانی، نور اللہ مرقدہٗ پنج سال و چند ماہ بود۔"
(شاہ عالم نامہ، ص ۹۳)

(ب) سیر المتاخرین، جلد سوم ص ۹۰۸

۴۔ شاہ عالم نامہ، ص ۹۵

۵۔ شاہ عالم نامہ، ص ۱۰۳

۶۔ نادرات شاہی، ص ۲۶

۷۔ آئینہ تاریخ نما، ص ۲۳

۸۔ آئینہ تاریخ نما، ص ۲۷

۹۔ نادرات شاہی، ص ۲۹

۱۰۔ آئینہ تاریخ نما، ص ۱۳۰

۱۱۔ (الف) نادرات شاہی، ص ۲۹

(ب) غدر کے صبح و شام ص ۲۰

۱۲۔ تاریخ عروج انگلشیہ، ص ۳۶۶ تا ۳۶۷

۱۳۔ نادرات شاہی، ص ۹۱

۱۴۔ TWILIGHT OF THE MUGHALS ص-41

۱۵۔ تاریخِ ہندوستان، ص ۴۴۴

۱۶۔ تاریخِ عروجِ انگلشیہ، ص ۳۴۹

۱۷۔ اسپیئر نے ۱۸۲۷ء میں اکبر شاہ ثانی کی عمر تیرہ سال بتائی ہے جس کا مطلب ہے کہ ان کے انتقال ۱۸۳۷ء کے وقت اکبر شاہ ثانی کی عمر تراسی سال تھی۔

(TWILIGHT OF THE MUGHALS p-41)

۱۸۔ تاریخِ عروجِ انگلشیہ، ص ۳۶۷

۱۹۔ غدر کے صبح و شام، ص ۲۳

۲۰۔ غدر کے صبح و شام، ص ۲۶

۲۱۔ غدر کے صبح و شام، ص ۲۶

۲۲۔ TWILIGHT OF THE MUGHALS p-43

۲۳۔ TWILIGHT OF THE MUGHALS p-41

۲۴۔ اکبر شاہ ثانی نے اپنے لڑکے مرزا جہانگیر کے لیے ولی عہدی کی کوشش اسی پیمانے پر کی تھی جس پیمانے پر آگے چل کر بہادر شاہ ظفر اور ان کی بیگم زینت محل نے اپنے بیٹے جوان بخت کے لیے کی تھی لیکن انگریزوں کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔ اس سلسلے میں تفصیلی بحث آگے چل کر ظفر کی تخت نشینی کے ضمن میں کی گئی ہے۔

۲۵۔ مغل اور اردو، ص ۱۴۰

۲۶۔ (الف) غدر کے صبح و شام، ص ۲۶

(ب) تاریخِ ہندوستان، ص ۳۴۴

۲۷۔ قلعۂ معلاّ کی جھلکیاں، ص ۴۴

۲۸۔ TWILIGHT OF THE MUGHALS p-41

۲۹۔ TWILIGHT OF THE MUGHALS p-67

۳۰۔ TWILIGHT OF THE MUGHALS p-67

۳۱۔ مجموعۂ نغز جلد اوّل، ص ۴۴

۳۲۔ (الف) "ولادت اس مرشدِ برحق اور قبلۂ اہلِ حق کی اٹھائیسویں شعبان ۱۱۸۹ھ بروز

شنبہ قربِ غروبِ آفتاب ہے۔" (رسالہ خیرخواہ ہند، مانگر وفلم، ص ۵۶)

(ب) طامس مٹکاف نے ظفر کی ولادت کا عیسوی سال ۱۷۷۳ء لکھا ہے جو اس کے مغالطے پر مبنی معلوم دیتا ہے۔ (ملاحظہ ہو دی گولڈن کام، ص ۳۵)

۳۳۔ قلعہ مُعلّیٰ کی جھلکیاں، ص ۳۳

۳۴۔ داستانِ غدر، ص ۲۹

۳۵۔ (الف) غدر کے صبح و شام، ص ۲۶

(ب) عرش تیموری نے اکبر شاہ ثانی کی اولاد کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے:

پسران: (۱) مرزا ابن یا ابوظفر (۲) مرزا بابر (۳) مرزا جہانگیر (۴) مرزا سلیم (۵) مرزا بلند بہادر (۶) مرزا جہاں خسرو (۷) مرزا قباد (۸) مرزا جہاں شاہ (۹) مرزا کاؤس شاہ (۱۰) مرزا شجاعت شاہ (۱۱) مرزا نظام شاہ

دُختران: (۱) نواب مسعود زمانی بیگم (۲) نواب قمر النسا بیگم (۳) نواب موتی بیگم (۴) نواب حسینی بیگم (۵) نواب سلطان بیگم (۶) نواب سکینہ بیگم

(قلعۂ مُعلّیٰ کی جھلکیاں، ص ۳۳)

(ج) طامس مٹکاف، رزیڈنٹ دہلی نے بھی 'دہلی بُک' ('دی گولڈن کام'، ص ۴۰) میں اکبر شاہ ثانی کے لڑکے اور لڑکیوں کی تعداد یہی بتائی جاتی ہے۔

۳۶۔ بحوالہ TWILIGHT OF THE MUGHALS

۳۷۔ تاریخ عروجِ عہدِ انگلشیہ، ص ۳۶۶

۳۸۔ TWILIGHT OF THE MUGHALS P-41

۳۹۔ TWILIGHT OF THE MUGHALS P-41

۴۰۔ TWILIGHT OF THE MUGHALS PP 42-43

۴۱۔ عرش تیموری نے مرزا جہانگیر کے بارے میں لکھا ہے:

"شہزادہ جہانگیر نہایت دلیر، قوی ہیکل نوجوان تھے۔ صبح و شام ہر وقت نشۂ شراب میں مخمور رہتے تھے، مزاج میں طنطنہ اور سپاہیانہ اکھڑ پن تھا

یہاں تک کہ ان کی بدمزاجی اور جرأت اور دلاوری سے انگریز کانپتے تھے۔ .... صاحبان انگریز شہزادے کے اس کروفر کر دیکھ کر دنگ رہ جاتے اور ہمیشہ اس کی نقل وحرکت سے خبردار رہتے۔ اس خبر سے کہ شہزادہ زور پکڑ کر کسی دن ملک کا مالک نہ بن جائے ..... مرزا جہانگیر نے اس وقت کے صاحبان انگریز کے مختلف نام بطورِ تفنن اور تضحیک رکھے تھے، چنانچہ رزیڈنٹ کو وہ لولو کہا کرتے تھے۔"

(قلعۂ معلاّ کی جھلکیاں، ص ۴۱ تا ۴۲)

۴۲۔ TWILIGHT OF THE MUGHALS PP. 73-75

۴۳۔ کتاب کی اصل عبارت میں مرزا سلیم کی جگہ مرزا نیلی چھپا ہوا ہے لیکن اغلاط نامے میں اس کی تصیح کر کے مرزا سلیم کر دیا گیا ہے اس لیے مندرجہ بالا اقتباس میں صحیح نام لکھ دیا گیا ہے۔

۴۴۔ تاریخ عروج انگلشیہ، ص ۳۶۹

۴۵۔ TWILIGHT OF THE MUGHALS P-71

۴۶۔ TWILIGHT OF THE MUGHALS PP-72-73

۴۷۔ TWILIGHT OF THE MUGHALS PP-72-73

۴۸۔ TWILIGHT OF THE MUGHALS P-73

۴۹۔ غدر کے صبح وشام، ص ۲۷

۵۰۔ تاریخ عروج انگلشیہ، ص ۳۶۹

۵۱۔ (الف) جام جہاں نما مملوکہ نیشنل آرکائوز

(ب) عرشؔ تیموری کا بیان ہے:

"سر جان طامس صاحب رزیڈنٹ نے تسبیح خانے کے تخت پر، جو سنگ مرمر کا تھا، تخت نشین کیا۔"

(قلعۂ معلاّ کی جھلکیاں، ص ۳۴)

۵۲۔ آئینہ سکندری مورخہ ۲۰ اکتوبر ۱۸۳۷ء مملوکہ نیشنل آرکائوز

۵۳۔ 'دہلی بک (دی گولڈن کام) میں اکبر شاہ ثانی کے قطب میں انتقال کا ذکر، ص ۳۵ اور ص ۴۰ پر کیا گیا ہے لیکن ظفر کی تخت نشینی کی تاریخ مٹکاف نے ص ۳۵ پر ۲۳ ستمبر اور ص ۴۷ پر ۲۴ ستمبر لکھی ہے۔ تاہم آئینۂ سکندری نے چوں کہ واضح طور پر ہجری اور عیسوی دونوں تاریخیں دی ہیں اس لیے اس کو صحیح سمجھنا چاہیئے۔

۵۴۔ ناصر نذیر فراق نے ظفر کی تخت نشینی سے متعلق ایک دل چسپ روایت اس طرح نقل کی ہے:

"اکبر شاہ ثانی کا انتقال رات کو دو بجے ہوا۔ خبر دار دم بدم کی خبر ولی عہد کو دے رہے تھے اور ولی عہد، تاج اور لباس اور جواہر اور زیور کا خوان لیے بیٹھے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ کب یہ سنوں کہ گھی کا کپا لنڈھ گیا اور تختِ شاہی پر بیٹھ جاؤں۔ چناں چہ ایک خبر دار نے خبر دی کہ حضور مبارک ہو مسافر گیا۔ بس فوراً مرزا ابن ولی عہد بہادر نے شاہانہ لباس پہنا اور چاہا کہ تخت پر قدم رکھیں جو نجومی اور جوتشیوں نے کہا وقت اچھا نہیں ہے سورج نکلے جلوس فرمایئے گا، اندھیرے میں تخت پر بیٹھنا نحس ہے۔ ولی عہد نے کہا میرے لیے نحس ہے یا رعایا کے لیے۔ نجومی کہنا چاہتے تھے دونوں کے لیے برابر ہے مگر ولی عہد کے ڈر سے کہہ دیا حضور، رعیت کے لیے اچھا نہیں ہے۔ ولی عہد نے کہہ دیا خیر دیکھا جائے گا۔ آفتاب نہ ہو گا تو کیا روشنی نہ ہو گی اور مشعل و مہتاب اور شمع و چراغ ایسی جگ مگ ہوئی کہ دن نے مات کھائی۔ ولی عہد تخت پر بیٹھے۔ ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ لقب اختیار کیا۔"

(لال قلعے کی ایک جھلک، ص ۲۱ تا ۲۲)

۵۵۔ داستانِ غدر، ص ۱۴ تا ۱۵

۵۶۔ بزمِ آخر، ص ۱۰

۵۷۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۳

۵۸۔ بزمِ آخر، ص ۱۱

۵۹۔ بزمِ آخر، ص ۱۲

۶۰۔ بزمِ آخر، ص ۱۳ تا ۱۵

۶۱۔ بزمِ آخر، ص ۱۵ تا ۱۶

۶۲۔ بزمِ آخر، ص ۱۶ تا ۱۷

۶۳۔ بزمِ آخر، ص ۱۷ تا ۱۸

۶۴۔ بزمِ آخر، ص ۲۰ تا ۲۱

۶۵۔(الف) داستانِ غدر ۱۶ تا ۱۷

(ب) طامس مٹکاف نے 'دہلی بک' (دی گولڈن کام) میں ص ۴۵، ۴۶ اور ۵۷ پر دیوانِ خاص کی جو تصاویر پیش کی ہیں وہ بڑی حد تک ظہیر دہلوی کی بیان کردہ تفاصیل کے مطابق ہیں۔

۶۶۔ قلعۂ معلّیٰ کی جھلکیاں، ص ۳۲

۶۷۔ داستانِ غدر، ص ۱۸

۶۸۔ داستانِ غدر، ص ۱۵

۶۹۔ داستانِ غدر، ص ۱۴

۷۰۔ تاریخِ عروجِ انگلشیہ، ص ۳۷۰

۷۱۔ (الف) تاریخِ عروجِ انگلشیہ، ص ۳۷۰

(ب) دہلی کا آخری سانس، ص ۹۷

۷۲۔ تاریخِ عروجِ انگلشیہ، ص ۳۷۰

۷۳۔ MUTINY PAPERS, COLLECTION NO. 199

۷۴۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۱

(اخبار کی عبارت میں ذرا سا اُلجھاؤ ہے۔ ہوسکتا ہے طباعت کی غلطی ہو۔ عبارت دراصل یوں ہونی چاہیے: 'تین لاکھ روپے سالانہ یعنی پچیس ہزار روپے کا اضافہ فرمایا' جب کہ عبارت یوں ہے: تین لاکھ روپے سالانہ پر پچیس ہزار روپے کا اضافہ فرمایا، لیکن جیسا کہ دوسرے ماخذوں سے بھی واضح ہے بادشاہ کی پنشن میں پچیس ہزار روپے ماہانہ کا اضافہ ہوا تھا۔

۷۵۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۳۸

۷۶۔ طامس مٹکاف کی ڈائری، ۱۲۹

۷۷۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۲۹

۷۸۔ طامس مٹکاف کی ڈائری، ص ۹۲ تا ۹۴

۷۹۔ طامس مٹکاف کی ڈائری، ۹۲ تا ۹۴

۸۰۔ طامس مٹکاف کی ڈائری، ص ۱۲۷ تا ۱۲۹

۸۱۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۸۸ تا ۱۸۹

۸۲۔ تاریخ عروجِ انگلشیہ، ص ۳۶۹

۸۳۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۳۶

۸۴۔ طامس مٹکاف کی ڈائری، ص ۶۸

۸۵۔ طامس مٹکاف کی ڈائری، ص ۱۱۳

۸۶۔ دہلی اردو اخبار، ۸ نومبر ۱۸۴۲ء، مملوکہ نیشنل آرکائوز

۸۷۔ دہلی اردو اخبار، ۱۴ جون ۱۸۴۲ء، مملوکہ نیشنل آرکائوز

۸۸۔ دہلی کا آخری سانس، ۱۰۵

۸۹۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۲۲

۹۰۔ تاریخ عروجِ انگلشیہ، ص ۳۷۰

۹۱۔ تقاریب کے سلسلے میں ملاحظہ ہو اس کتاب کا باب 'سیرت و شخصیت'

۹۲۔ طامس مٹکاف کی ڈائری، ص ۷۱

۹۳۔ طامس مٹکاف کی ڈائری، ص ۲۳۵

۹۴۔ لال قلعے کی ایک جھلک، ص ۲۹

۹۵۔ طامس مٹکاف کی ڈائری، ص ۹۲

۹۶۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۶۷

۹۷۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۴ تا ۱۵

۹۸۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۵۹

۹۹۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۷۸ تا ۷۹
۱۰۰۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۲۳
۱۰۱۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۰۰
۱۰۲۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۲۳
۱۰۳۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۳۱
۱۰۴۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۹۷
۱۰۵۔ "کلو سنگھ سپاہی کو چھے سو روپے نذرانہ وصول کر کے سپاہی مقرر کیا۔ توڑہ اور طرّہ بخشا اور توپ خانۂ احسام کے جمعدار حیدر علی کو ۱۵۰ روپے نذرانہ لے کر کمپنی تلنگانہ بحری کا عہد فرمایا۔"

(دہلی کا آخری سانس، ص ۲۳)

۱۰۶۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۳۴
۱۰۷۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۳۴
۱۰۸۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۳۵
۱۰۹۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۴۳
۱۱۰۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۶۰
۱۱۱۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۷۸
۱۱۲۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۸۷
۱۱۳۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۱۰
۱۱۴۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۱۵
۱۱۵۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۶۶
۱۱۶۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۷۷ تا ۷۸
۱۱۷۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۴۸
۱۱۸۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۲۱
۱۱۹۔ دہلی اردو اخبار، مئی ۱۸۴۰ء مملوکہ نیشنل آرکائیوز
۱۲۰۔ اخبارِ دہلی، یکم مارچ ۱۸۴۰ء، مملوکہ آرکائیوز (اس اخبار کا نام ۱۸۴۰ سے "دہلی اردو اخبار"

ہو گیا تھا)

۱۲۱۔ محبِ ہند، مارچ ۱۸۴۵ء، ص ۳۳، مائیکرو فلم، مملوکہ دہلی یونیورسٹی
۱۲۲۔ دہلی اردو اخبار، ۲۴ مئی ۱۸۴۱ء، مملوکہ نیشنل آرکائوز
۱۲۳۔ دہلی اردو اخبار، ۱۴ مئی ۱۸۴۱ء، مملوکہ نیشنل آرکائوز
۱۲۴۔ دہلی اردو اخبار، ۱۵ اگست ۱۸۴۱ء، مملوکہ نیشنل آرکائوز
۱۲۵۔ دہلی اردو اخبار، ۱۰ مئی ۱۸۴۱ء، مملوکہ نیشنل آرکائوز
۱۲۶۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۴۵
۱۲۷۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۲۶
۱۲۸۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۲۶
۱۲۹۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۹۵ تا ۹۶
۱۳۰۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۴۷ تا ۱۴۸
۱۳۱۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۷۵
۱۳۲۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۸۱ تا ۸۲
۱۳۳۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۸۷
۱۳۴۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۰۵
۱۳۵۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۸۲
۱۳۶۔ خلاصہ اخبار، ۲۰ اپریل ۱۸۴۹ء، مملوکہ نیشنل آرکائوز
۱۳۷۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۳
۱۳۸۔ TWILIGHT OF THE MUGHALS PP-74-75
۱۳۹۔ (الف) ذکاءاللہ دہلوی، ص ۵۹

(ب) عرش تیموری نے ایک جگہ بادشاہ کی پیٹ کی بیماری کا ذکر کیا ہے اور اس بیماری کو ایک سازش کا نتیجہ قرار دیا ہے جو ولی عہدی کے جھگڑے کے سلسلے میں قلعے میں چل رہی تھی، وہ لکھتے ہیں

"آپ کے فرزند شہزادہ کیومرث بہادر ولی عہد نے.... لالچ میں آکر شیر کی مونچھ کا بال پان میں رکھ کر کھلا دیا تھا۔ اس طمع میں کہ اگر بادشاہ کی موت واقع ہو جائے تو خود کو بادشاہت مل جائے گی۔ چنانچہ حضور بادشاہ کو

ایک پُر تکلف دعوت دی گئی اور جب کمرہ دل کش راگوں سے گونج رہا تھا اور سامعین محو تھے۔ اس وقت بادشاہ کو ایک نہایت نفیس پیڑے میں شیر کا بال دیا گیا۔

بہر حال جب آپ کی حالت غیر ہوئی تو حکمائے وقت کی قے آور ادویات کے استعمال کرانے سے ڈھلے کے ڈھلے خون کے نکلے اور لتنے کہ کئی چلچیاں بھر جاتی تھیں۔ آخر کار اس تون میں بال کی کرچ بھی نکل آئی جو کھلائی گئی تھی تحقیقات ہوئی اور کئی دن تک پکڑ دھکڑ رہی۔ آخر کار معلوم ہوا کہ یہ کام شہزادہ کیومرث بہادر کا ہے[۴] جب حضور بادشاہ کو اس مرض الموت سے افاقہ ہوا تو آپ نے عین صحت یابی کی تقریب میں شہزادہ کیومرث کو طلب فرمایا اور اپنے پاس ایک پیالہ مسموم شربت کا تیار رکھا۔ منجلا فرزند سہما ہوا سر جھکائے حاضر ہوا۔ آداب بجالایا اور بحالت منتظر کھڑا رہا کہ حکم پدری کی تعمیل کرے۔ بادشاہ نے شربت کا پیالہ ہاتھ میں لے کر بیٹے کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا بیٹا جس طرح تم نے مجھے شیر کا بال کھلایا اب اس کی مکافات بھرو اور لو یہ زہر کا پیالہ ابھی پیو۔

مرزا کیومرث نے ہاتھ باندھ کر کچھ عرض کرنا چاہا تھا کہ باپ نے للکار کر کہا۔ "او موذی کیا اب ناخلف بھی بننا چاہتا ہے۔"

مرزا کیومرث دست بستہ ادب گاہ پر آئے اور آداب بجالائے اور "بہت بہتر" کہہ کر غٹا غٹ زہر کا پیالہ چڑھا گئے اور تھوڑی دیر باپ کے قدموں میں گر کر سرد ہو گئے۔

(قلعۂ معلّٰی کی جھلکیاں، ص ۳۱ تا ۳۲)

[۴] عرش تیموری نے غیاث الدین مصنف باغ شاداب کے حوالے سے لکھا ہے کہ مرزا کیومرث ولی عہد دوم تھے۔ یعنی مرزا فخرو سے بڑے اور مرزا شاہ رخ سے چھوٹے۔

۱۴۰۔ دہلی اردو اخبار، ۲۲ جون ۱۸۴۰ء مملوکہ نیشنل آرکائوز

۱۴۱۔ F.D., POLITICAL SECRET NOS. 56-57, N.A.I.

۱۴۲- F.D., POLITICAL SECRET NOS. 254-261, N.A.I.

۱۴۳- داستانِ غدر، ص ۱۷ تا ۱۸

۱۴۴- قلعۂ معلاّ کی جھلکیاں، ص ۲۱

۱۴۵- (الف) ملاحظہ ہو اس باب کا حاشیہ ۲۸۳

(ب) دہلی اردو اخبار، ۲۲ نومبر ۱۸۴۰ء مملوکہ نیشنل آرکائوز

۱۴۶- دہلی کا آخری سانس، ص ۸۷

۱۴۷- دہلی کا آخری سانس، ص ۱۲۲

۱۴۸- دہلی کا آخری سانس، ص ۱۹۳

۱۴۹- دہلی کا آخری سانس، ص ۱۸۶

۱۵۰- لال قلعے کی ایک جھلک، ص ۹ تا ۱۰

۱۵۱- قلعۂ معلاّ کی جھلکیاں، ص ۱۸

۱۵۲- طامس مٹکاف کی ڈائری، ص ۱۲

۱۵۳- دہلی کا آخری سانس، ۱۵۲

۱۵۴- قلعۂ معلاّ کی جھلکیاں، ص ۳۱ تا ۳۲

۱۵۵- غدر کے صبح و شام

۱۵۶- F.D., POLITICAL A. NO.22U, PROCEDING VOLUME P.336, N.A.I.

۱۵۷- قلعۂ معلاّ کی جھلکیاں، ص ۱۸

۱۵۸- F.D., POLITICAL A, NO.220, PROCEEDING VOLUME P.336, N.A.I.

۱۵۹- تاریخ عروج انگلشیہ، ص ۳۸۰

۱۶۰- قلعۂ معلاّ کی جھلکیاں، ص ۱۸ تا ۱۹

۱۶۱- غدر کے صبح و شام، ص ۲۹

۱۶۲- قلعۂ معلاّ کی جھلکیاں، ص ۶۶

۱۶۳- طامس مٹکاف نے مرزا دارا بخت کے انتقال کا ذکر اپنی ڈائری میں اس طرح کیا ہے:

" مرشد زادہ مرزا دارا بخت چند روز سے نزلہ کھانسی اور بخار میں مبتلا تھے۔ بتاریخ ۱۱ر جنوری ۱۸۴۹ء کو بمقتضائے الٰہی اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ ولی عہد کی بیماری کی فکر میں حضور نے کئی روز سے دربار کیا نہ سواری کی تھی۔ آج اندر سے رونے پیٹنے کی آواز آئی تو بہت غم گین ہو گئیں۔"

(طامس مٹکاف کی ڈائری، ص ۱۲)

۱۶۴۔ طامس مٹکاف کی ڈائری، ص ۲۵

۱۶۵۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۵۲

۱۶۶۔ دہلی کا آخری سانس ص ۱۵۳

۱۶۷۔ طامس مٹکاف کی ڈائری، ص ۳۰

۱۶۸۔ طامس مٹکاف کی ڈائری، ص ۴۳

۱۶۹۔ طامس مٹکاف کی ڈائری، ص ۴۹

۱۷۰۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۹۷

۱۷۱۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۸۳

۱۷۲۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۳۸

۱۷۳۔ F.D., POLITICAL SECRET NO.56, N.A.I.

۱۷۴۔ F.D., POLITICAL SECRET NOS. 254-61, N.A.I.

۱۷۵۔ F.D., POLITICAL SECRET NO. 57, N.A.I.

۱۷۶۔ قلعۂ معلّٰی کی جھلکیاں، ص ۶۷ تا ۶۹

۱۷۷۔ M.P. COLLECTION NO.200, FILE NO. 49, N.A.I.

۱۷۸۔ M.P., COLLECTION NO.200, FILE NO.50, N.A.I.

۱۷۹۔ M.P., COLLECTION NO. 200, FILE NO. 51, N.A.I.

۱۸۰۔ F.D., POLITICAL NOS. 254-61, N.A.I.

۱۸۱۔ F.D., POLITICAL NOS. 55-66, N.A.I.

۱۸۲۔ F.D., POLITICAL NO. 160, N.A.I.

۱۸۳۔ F.D., POLITICAL NO. 162, N.A.I.

(ب) غدر کے صبح و شام، ص ۲۹

(ج) 'دہلی کی جاں کنی' میں حسن نظامی نے مرزا فخرو کی تاریخ وفات ۱۰ جولائی ۱۸۵۵ء لکھی ہے۔ ۱۰ جولائی تو صحیح ہے لیکن سنہ غلط ہے جو سہو کاتب معلوم دیتا ہے۔ (مٹکاف نے (غدر کے صبح و شام) مرزا فخرو کی ہلاکت کا سبب زہر بتایا ہے، جب کہ خواجہ حسن نظامی نے 'دہلی کی جاں کنی' میں ہیضہ لکھا ہے۔ نیشنل آرکائوز کے جس سرکاری ریکارڈ کا حوالہ یہاں دیا گیا ہے اس میں بھی موت کے اسباب پر روشنی نہیں ڈالی گئی۔

(د) مولوی ذکاء اللہ نے بھی مرزا فخرو کی ہلاکت کا سبب ہیضہ ہی بتایا ہے اور زہر دیے جانے کو گپ پر محمول کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء کو مرزا فخرو کا ہیضے سے انتقال ہو گیا۔ یہ شبہ بھی ہوا کہ ان کو زہر دیا گیا۔ بادشاہ کے روزنامچے میں لکھا ہے کہ مرزا کو اشتہا معلوم ہوئی۔ اس نے جانا کہ خالی معدہ ہے یصفرا کے زور سے اشتہا ہوئی ہے، کچھ روٹی کھائی، یخنی پی لی تو استفراغ کی زیادتی ہوئی، جس سے نقاہت زیادہ ہوئی۔ کسی دوا نے کچھ اثر نہ کیا۔ نزع کی حالت طاری ہوئی۔ مرزا الٰہی بخش (خسر ولی عہد) نے حکیم احسن اللہ خاں کو بلوایا۔ انھوں نے حقنہ دلوایا جس سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ چھے بجے شام کو ولی عہد کا انتقال ہوا۔ گھر میں کہرام ہوا۔ بادشاہ کو بیٹے کے مرنے کی خبر ہوئی۔ بہت رنج ہوا۔ زینت محل نے اس کی تسلّی، تسکین و تشفّی کی۔ ولی عہد کے معالج حکیم محمد نقی خاں تھے۔ ان کی نسبت یہ مشہور ہوا کہ زینت محل سے مل کر دوا میں زہر ملا کر دے دیا لیکن یہ سب بازاری گپیں ہیں۔ اس زمانے میں شہر میں ہیضہ پھیلا ہوا تھا۔ ولی عہد ہیضے ہی سے مرا تھا۔"

(تاریخ انگلشیہ، ص ۳۸۰)

(ہ) انگریزوں کی جانب سے مرزا فخرو کے ولی عہد نامزد کیے جانے میں دہلی کے رزیڈنٹ طامس مٹکاف نے اہم رول ادا کیا تھا۔ مرزا فخرو ستمبر ۱۸۵۲ء میں ولی عہد نامزد ہوئے اور اس کے لگ بھگ دس ماہ بعد یعنی نومبر ۱۸۵۳ء میں بعض نامعلوم حالات کی بنا پر اچانک طامس مٹکاف

کی موت واقع ہوگئی۔ انگریز حلقوں میں طامس مٹکاف کی پُراسرار موت کے سلسلے میں یہ شبہ کیا گیا کہ زینت محل بیگم نے انگریزوں سے بدلہ لینے کے لیے طامس مٹکاف کو زہر دلوایا (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو' دی گولڈن کام) یہ بات قابلِ غور ہے کہ ۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۶ء کے نو برس کے عرصے کے دوران قلعے میں جو اندرونی سازشیں کام کر رہی تھیں ان کے طفیل بہادر شاہ ظفر کو زہر دیا گیا۔ (قلعۂ معلّیٰ کی جھلکیاں) اور چار افراد کی موت غیر فطری حالات میں واقع ہوئی۔ ان مرنے والوں میں ایک انگریز طامس مٹکاف ریزیڈنٹ دہلی تھا جو مرزا فخرو کی ولی عہدی کے لیے ذمّے دار تھا اور تین برسرِ اقتدار شہزادے تھے جن کی تفصیل اس طرح ہے: مرزا شاہ رُخ بیگ، وفات ۱۸۴۷ء، مرزا دارا بخت، وفات ۱۸۴۹ء اور مرزا فخرو، وفات ۱۸۵۶ء۔ طامس مٹکاف کی بیٹی لیڈی کلائیو بیلی (دی گولڈن کام) کا خیال تھا کہ اس زمانے میں جتنی پُراسرار اموات واقع ہوئی ہیں ان کے پیچھے زینت محل بیگم کا ہاتھ تھا جو ہر قیمت پر اپنے بیٹے جواں بخت کو ولی عہد نامزد کرانا چاہتی تھیں۔ (اس حاشیے کی بقیہ عبارت حواشی کے آخر میں ملاحظہ ہو)

۱۸۵۔ F.D., POLITICAL NO. 185, N.A.I.

۱۸۶۔ F.D., POLITICAL NO. 189, N.A.I.

۱۸۷۔ غدر کے صبح و شام ص ۲۹

۱۸۸۔ F.D., PROCEEDING VOLUME 217-20 N.A.T.

۱۸۹۔ F.D., PROCEEDING VOLUME 217-20 N.A.I.

۱۹۰۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اس کتاب کا باب 'اٹھارہ سو ستّاون'۔

۱۹۱۔ سانڈرس نے ایڈیشن سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا، فورٹ ولیم کو ایک خط ۱۳ دسمبر ۱۸۵۸ء کو لکھا جس میں جواں بخت کی عمر سترہ سال بتائی ہے۔ اس اعتبار سے مئی ۱۸۵۷ء میں جب انقلاب برپا ہوا تو جواں بخت پندرہ سولہ سال کے بیچ میں تھا۔ سانڈرس لکھتا ہے:

"......MIRZA JUWAN BAKHT, SON OF THE KING BY ZEENAT MAHAL. HE IS NOT EIGHTEEN YEARS OF AGE BUT SEVENTEEN AND MORE OVER NOT THE YOUNGEST SON OF THE KING......"

(F.D., POLITICAL SECRET NOS. 56-57, NA.A.I)

۱۹۲۔ M.P., COLLECTION NO. 102 FILE NO. 67, N.A.I.

۱۹۳- M.P., COLLECTION NO. 102 FILE NO. 69, N.A.I.

۱۹۴- M.P., COLLECTION NO. 101 FILE NO. 8, N.A.I.

۱۹۵- M.P., COLLECTION NO. 100 FILE NO. 94, N.A.I.

۱۹۶- M.P., COLLECTION NO. 102 FILE NO.110, N.A.I.

۱۹۷- گوری شنکر جاسوس ۱۰ اگست ۱۸۵۷ء کو انگریزوں کو ایک خط میں لکھتا ہے:

"الغرض مرزا مغل چاہتا ہے کہ میں بادشاہ ہو جاؤں اور بادشاہ کا کام تمام کر دوں۔"

(MUTINY PAPERS)

۱۹۸- تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اس کتاب کا باب 'اٹھارہ سو ستاون'۔

۱۹۹- F.D., POLITICAL NOS. 51-78 (KW), N.A.I.

۲۰۰- F.D., POLITICAL SECRET NOS. 56-57, N.A.I.

۲۰۱- F.D., POLITICAL SECRET NOS. 56-57, N.A.I.

۲۰۲- بہادر شاہ کا مقدمہ، ص ۲۱۹

۲۰۳- F.D., POLITICAL NOS. 254-61, N.A.I.

۲۰۴- بہادر شاہ کا مقدمہ، ص ۹۵

۲۰۵- مرزا حیدر شکوہ کا یہ خط 'دستور العمل اودھ' نام کے ایک مخطوطے میں شامل ہے جو رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ اس مخطوطے میں بہت سے لوگوں کے خطوط اور دوسری تحریروں کی نقلیں شامل ہیں۔ مالک رام نے اس مخطوطے کے بارے میں شبہ ظاہر کیا ہے کہ یہ جعلی ہے۔ اس مخطوطے کی تمام عبارتیں اردو ترجمے کے ساتھ حافظ احمد علی نے اپریل اور مئی ۱۹۲۲ء میں شائع کر دی تھیں۔ یہاں یہ عبارت معارف ہی سے نقل کی گئی ہے۔

۲۰۶- بحوالہ نوائے ادب بمبئی، اپریل ۱۹۵۵ء، ص ۳۵ تا ۳۶

۲۰۷- بحوالہ نوائے ادب بمبئی، اپریل ۱۹۵۵ء، ص ۳۶

۲۰۸- بہادر شاہ کا مقدمہ، ص ۲۱۷

۲۰۹- F.D., POLITICAL, MISCELLENOUS, N.A.I.

۲۱۰- (الف) M.P., COLLECTION NO. 102, FILE NO. 103, N.A.I.

(ب) بادشاہ نے اپنے شیعہ مذہب قبول کرنے کے بارے میں محض تردیدی اعلان ہی نہیں کیا بلکہ

اسی مضمون کی ایک فارسی مثنوی بھی شائع کی۔ 'دستور العمل اودھ' میں، جس کا ذکر حاشیہ ۲۰۵ میں کیا جا چکا ہے، لکھا ہے کہ اگرچہ یہ مثنوی بہادر شاہ ظفر کے نام سے شائع ہوئی تھی لیکن اس کے اصل مصنف غالب ہی تھے۔ اس فارسی مثنوی کا پہلا شعر یہ ہے:

حلہ ہاں، اے دقیقاں اندیشاں
حق پرستاں و معدلت کیشاں

(ج) خلیق انجم نے 'غالب اور شاہانِ تیموریہ' میں اس معاملے پر تفصیل سے بحث کی ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے بہادر شاہ نے اس وقت شیعہ مذہب قبول کر لیا تھا۔

۲۱۱۔ نصرت نامہ گورنمنٹ، ص ۶۳

۲۱۲۔ (الف) بہادر شاہ کا مقدمہ، ص ۲۴۳ تا ۲۴۴

(ب) مولانا امتیاز علی خاں عرشی، بادشاہ کی شیعہ مذہب سے عقیدت کے بارے میں لکھتے ہیں:

بادشاہ کی اس عقیدت نے انھیں بہت بدنام کیا تا آنکہ رائے عامہ سے مجبور ہو کر مذہب تشیع سے اپنی بریت ظاہر کرنے کے لیے مرزا غالب سے ایک فارسی مثنوی لکھوائی اور اسے چھاپ کر تقسیم کیا۔"

(نوائے ادب اپریل ۱۹۵۶ء ص ۳۹)

۲۱۳۔ انگریزوں نے اس خطرے کو محسوس کرتے ہوئے کہ کہیں دہلی اور اودھ کی حکومتوں کے درمیان کسی قسم کی افہام و تفہیم نہ پیدا ہو جائے خود اس بات کی کوشش کی کہ اس بات کی تردید کی جائے کہ بادشاہ نے شیعہ مذہب قبول کر لیا ہے۔ چناں چہ 'دستور العمل اودھ' میں سمسن فریزر کا بھی ایک خط ہے۔ اس خط میں فریزر لکھتا ہے:

"مرزا سلیمان شکوہ کے پوتوں نے.... بندگانِ والا کو رافضی مذہب قبول کرنے سے بدنام کیا اور متہم کیا۔ یہ سب غلط و بے اصل و افترا و بہتان ہے۔"

(معارف اپریل ۱۹۲۲ء ص ۲۸۲ تا ۸۳)

۲۱۴۔ بہادر شاہ کا مقدمہ، ص ۹۵ تا ۹۶

۲۱۵۔ بہادر شاہ کا مقدمہ، ص ۲۱۸ تا ۲۱۹

۲۱۶۔ بہادر شاہ کا مقدمہ، ص ۵۵

۲۱۷۔ نصرت نامہ گورنمنٹ، ص ۶۳

۲۱۸۔ غدر کے اخبارات، ص ۱۰

۲۱۹۔ غدر کے اخبارات، ص ۱۱ تا ۱۲

۲۲۰۔ غدر کے اخبارات، ص ۱۱

۲۲۱۔ غدر کے اخبارات، ص ۱۳ تا ۱۴

۲۲۲۔ جیسا کہ بعد کی عبارت سے ظاہر ہے، اس میں لفظ 'اعلام' نہ کہ 'اعلان' استعمال کیا گیا تھا۔

۲۲۳۔ M.P., COLLECTION NO. 195, FILE NO. 10, N.A.I.

۲۲۴۔ اسبابِ بغاوتِ ہند، ص ۴

۲۲۵۔ اسبابِ بغاوتِ ہند، ص ۴ تا ۵

۲۲۶۔ تاریخِ عروجِ انگلشیہ، ص ۳۸۴

۲۲۷۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اس کتاب کا باب "اٹھارہ سو ستاون"

۲۲۸۔ یہ میجر ہڈسن وہ نہیں ہے جس نے ۲۲ ستمبر ۱۸۵۷ء کو تین مغل شہزادوں مرزا مغل، مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر (موخرالذکر ظفر کے پوتے تھے) کو ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار کر کے کوتوالی لاتے ہوئے راستے میں گولی مار دی تھی۔

۲۲۹۔ داستانِ غدر، ص ۴۳ تا ۴۴

۲۳۰۔ نصرت نامہ، گورنمنٹ، ص ۴۲

۲۳۱۔ گرفتھس نے بادشاہ کی یہ عمر اپنے اندازے سے بتائی ہے، وہ اس وقت اکیاسی برس کے تھے۔

۲۳۲۔ بحوالہ EIGHTEEN FIFTY SEVEN, P. 111-12

۲۳۳۔ گرفتاری کے اگلے دن جب گرفتھس نے اکیاسی برس کے بادشاہ کو دیکھا تھا تو ان کی عمر کا اندازہ اُس نے ستر سے زیادہ کیا تھا۔ لیکن گرفتاری کے تین ماہ بعد جب اسی اکیاسی برس کے بادشاہ کو ریکس نے دیکھا تو اس نے ان کی عمر کا اندازہ نوّے برس کیا جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی بے چارگی دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی۔ جس سے ان کے چہرے پر ضرورت سے زیادہ ضعیف العمری چھا گئی تھی۔

۲۳۴۔ EIGHTEEN FIFTY SEVEN P. 112.

۲۳۵۔ (الف) EIGHTEEN FIFTY SEVEN P. 112

(ب) بہادر شاہ ظفر کے سلسلے میں بعض انشا پردازوں نے رنگون کے جو رقت آمیز حالات بیان

کیے وہ شاید گرنفھس، رکیس اور مسز گو یالن ہی کے تاثرات کی مسخ شدہ شکل ہیں۔ یہ تاثرات اس وقت کے ہیں جب ظفر رنگون میں نہیں بلکہ دہلی میں ناظر حسین مرزا کے مکان میں قید تھے اور ان پر مقدمہ چلنے والا تھا۔

۲۳۶۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو بہادر شاہ کا مقدمہ

۲۳۷۔ بہادر شاہ کا مقدمہ، ص ۱۶۴

۲۳۸۔ فورسٹ نے تو یہاں تک کہا کہ :

"بادشاہ نے میگزین پر چڑھنے کے لیے باغیوں کو سیڑھیاں فراہم کیں جو اسی مقصد کے لیے قلعے میں تیار کی گئی تھیں۔" (انگریزی سے ترجمہ)

(HISTORY OF INDIAN MUTINY, VOL. II, P. 76)

۲۳۹۔ بہادر شاہ کا مقدمہ، ص ۱۶۸

۲۴۰۔ بہادر شاہ کا مقدمہ، ص ۱۷۲ تا ۱۷۳

۲۴۱۔ بہادر شاہ کا مقدمہ، ص ۱۷۵ تا ۱۷۶

۲۴۲۔ بہادر شاہ کا مقدمہ، ص ۱۷۸

۲۴۳۔ بہادر شاہ کا مقدمہ، ص ۱۸۲

۲۴۴۔ بہادر شاہ کا مقدمہ، ص ۱۸۸

۲۴۵۔ بہادر شاہ کا مقدمہ، ص ۱۸۸

۲۴۶ داستانِ غدر، ص ۸۴

۲۴۷ غدر کے صبح و شام ۴۷

۲۴۸ ۴ کو بہادر شاہ اپنے مختصر دستخط کے طور پر اکثر دستاویزوں پر ثبت کرتے تھے۔

۲۴۹ M.P., COLLECTION NO. 56, FILE NO. 7, N.A.I.
(FAIR COPY OF THE KING'S DEFENCE ATTESTED WITH HIS AUTOGRAPH SIGNATURES)

۲۵۰ بہادر شاہ کا مقدمہ، ص ۲۱۶

۲۵۱ F.D., POLITICAL NOS. 52-157, 10TH DEC. 1858, N.A.I.

۲۵۲ F.D., POLITICAL NO. 1407, 30TH DEC. 1858, N.A.I.

۲۵۳ F.D., POLITICAL NO. 1413, 30TH DEC., 1858, N.A.I.

F.D., POLITICAL NOS. 52-125, 10TH DEC. 1858, N.A.I. ۲۵۴۔

F.D., POLITICAL NOS. 52-125, 10TH, DEC. 1858, N.A.I. ۲۵۵۔

F.D., POLITICAL NOS. 52-125, 10TH, DEC. 1858, N.A.I. ۲۵۶۔

F.D., POLITICAL NOS. 52-125, 10TH, DEC. 1858, N.A.I. ۲۵۷۔

۲۵۸۔ پیگو، برما کے صوبے کا نام ہے۔

F.D., POLITICAL NOS. 52-125, 10TH, DEC. 1858, N.A.I. ۲۵۹۔

F.D., POLITICAL NOS. 52-125, 10TH, DEC. 1858, N.A.I. ۲۶۰۔

F.D., POLITICAL NOS. 52-125, 10TH, DEC. 1858, N.A.I. ۲۶۱۔

F.D., POLITICAL NOS. 52-125, 10TH, DEC. 1858, N.A.I. ۲۶۲۔

F.D., POLITICAL PROGRESS NOS.74-76, 5TH MARCH 1859, N.A.I. ۲۶۳۔

F.D., POLITICAL, C NO.325, N.A.I. ۲۶۴۔

F.D., POLITICAL, PROGRESS NO. 125, N.A.I. ۲۶۵۔

F.D., POLITICAL, C. NO. 325, N.A.I. ۲۶۶۔

F.D., POLITICAL NO. 125, N.A.I. ۲۶۷۔

F.D., POLITICAL NO. 125, N.A.I. ۲۶۸۔

F.D., POLITICAL NO. 124, N.A.I. ۲۶۹۔

F.D., POLITICAL A NOS. 24-35, AUG. 1861, N.A.I. ۲۷۰۔

۲۷۱۔ ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا، ص ۱۹۳

F.D., POLITICAL A NOS. 24-35, AUG. 1861, N.A.I. ۲۷۲۔

F.D., POLITICAL A NOS. 82-85, FEB 1862, N.A.I. ۲۷۳۔

F.D., POLITICAL A NOS. 163-64, N.A.I. ۲۷۴۔

F.D., POLITICAL A NOS. 163-64, N.A.I. ۲۷۵۔

۲۷۶۔ ذکرِ غالب، ص ۲۱۱

۲۷۷۔ بہادر شاہ ظفر، ص ۱۹۲

۲۷۸۔ بحوالہ ذکرِ غالب، ص ۲۱۲ تا ۲۱۳

۲۷۹۔ ذکرِ غالب، ص ۲۱۱

F.D., POLITICAL NOS. 15-17, APRIL 1868, N.A.I. ۲۸۰۔

F.D., POLITICAL NO. 104, N.A.I. -۲۸۱

F.D., POLITICAL NOS. 15-17 , APRIL 1868, N.A.I. -۲۸۲

F.D., FINANCE B NOS. 69-72, FEB. 1862 -۲۸۳

اس فائل میں ایک جگہ لکھا ہے کہ زینت محل کی عمر اس وقت تقریباً اکسٹھ سال ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۸۸۶ء میں جب ان کا انتقال ہوا تو زینت محل کی عمر پینسٹھ سال تھی۔ گویا ان کی پیدائش ۱۸۲۱ء کے آس پاس ہوئی اور وہ اُنیس برس کی عمر میں اس وقت بہادر شاہ کے نکاح میں آئیں جب ان کی عمر پینسٹھ سال تھی۔

F.D., INTERNATIONAL B NOS.140-42, AUG. 1886, N.A.I. ۲۸۴

F.D., POLITICAL B. NOS. 15-17,APRIL 1868, N.A.I. ۲۸۵

F.D., POLITICAL NO. 163, JUNE 1866 , N.A.I. ۲۸۶

F.D., POLITICAL B NOS. 15-17, APRIL 1868, N.A.I. ۲۸۷

F.D., B. NOS. 40-41, FEB..1880, N.A.I. ۲۸۸

F.D., INTERNATIONAL B. NOS. 8-13, NOV. 1884, N.A.I. ۲۸۹

F.D., POLITICAL B NOS 15-17, APRIL, 1868, N.A.I. ۲۹۰

F.D., POLITICAL B NOS. 15-17, APRIL, 1868, N.A.I. ۲۹۱

F.D., POLITICAL B NOS. 39-40, APRIL, 1884, N.A.I. ۲۹۲

حاشیہ ۱۸۴ کی بقیہ عبارت:

(و) عرش تیموری نے (قلعۂ معلّٰی کی جھلکیاں) مرزا قمقام الدین کے حوالے سے مرزا خورشید عالم خلف مرزا فخرو کی ایک روایت نقل کی ہے جس کی رو سے مرزا فخرو اور انگریزوں کے درمیان تخت نشینی سے متعلق معاہدہ سب سے پہلی بار ۱۸۴۲ء میں اس وقت عمل میں آیا جب لارڈ ہارڈنگ دہلی آئے۔ اگر یہ خبر صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ خفیہ معاہدہ مرزا شاہ رُخ بیگ (متوفی ۱۸۴۷ء) اور مرزا دارا بخت (متوفی ۱۸۴۹ء) کے انتقال سے قبل عمل میں آیا، گویا مرزا فخرو نے اپنی ولی عہدی کے منصوبے ان دونوں شہزادوں کی زندگی ہی میں، جن میں سے ایک پہلے ہی ولی عہد تھا، بنانے شروع کر دیے تھے! ایسی صورت میں ان دونوں شہزادوں کی اچانک موت کے بارے میں سوچا ہوگا کہ کہیں یہ مرزا فخرو کی کسی سازش کا نتیجہ تو نہیں تھا اور پھر جب قلعے میں ایک بار سازش کا یہ سلسلہ شروع ہو گیا تو مرزا فخرو بھی اس سے نہ بچ سکے۔

اٹھارہ سو ستّاون

۱۹۴۷ء تک بہادر شاہ ظفر اور انقلاب کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا گیا، وہ زیادہ تر برٹش حکومت کے نقطۂ نظر سے تھا۔ اس سلسلے میں بعض روزنامچے بھی شائع ہوئے، جن میں جیون لال کا روزنامچہ اور معین الدین حسن کی کتاب خدنگِ غدر اہم ہیں۔ مٹکاف نے ان کا انگریزی میں ترجمہ کرایا تھا۔ ہمارے بعض مؤرخین نے ان تحریروں کے سہارے اچھی خاصی غلط فہمی پھیلائی ہے، جن میں آر۔ سی مجمدار اس لیے قابلِ ذکر ہیں کہ ان کی تحقیق کے مطابق "بہادر شاہ غدار تھے اور آخر تک برٹش حکومت کے وفادار رہے۔"[۱] یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کے پیشِ نظر صرف انگریزوں کی لکھی ہوئی کچھ تاریخیں اور جیون لال کا روزنامچہ ہوگا۔ جیون لال کے روزنامچے سے پتا چلتا ہے کہ وہ جاسوس تھا اور انگریزوں کو قلعے سے متعلق خبریں پہنچاتا تھا۔

بہادر شاہ ظفر اگرچہ انگریزوں کے پنشن خوار تھے لیکن دہلی کے عوام کے لیے وہ اب تک ہندوستان کے شہنشاہ تھے اور لوگوں کے دلوں میں ان کی عزت و عظمت اُسی طرح برقرار تھی۔ عوام ہی نہیں، عالم فاضل لوگ بھی بادشاہ سے یکساں طور پر عقیدت رکھتے تھے۔ اینڈریوس نے ایک جگہ لکھا ہے:

> "جب انگریزی افواج شہر میں بغیر کسی مقابلے کے قابض ہو گئیں اور بادشاہ کو قلعے کے رقبے کے اندر پورے شاہانہ اختیارات

کے ساتھ آزاد چھوڑ دیا گیا تو اس وقت دہلی کے باشندوں کو عام ہمدردی ان کے ساتھ ہو گئی۔ تاہم قدرت کے اس تمام انقلاب میں جو خواہ مرہٹوں کے ماتحت ہوا ہو یا خواہ انگریزوں کے ماتحت، دہلی کے لوگ ہندو اور مسلمان یکساں طور پر .... عقیدت مندانہ وفاداری کے ساتھ مغل شہنشاہوں کے ساتھ چمٹے رہے اس بارے میں جو بھی شہادت مجھے ملی، وہ قطعی تھی۔ انھیں (ذکاء اللہ کو) بہادر شاہ کے ساتھ جو محبت تھی اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی، خواہ وہ ان کے نظم و نسق کی کم زوری اور خرابی پر کتنا ہی ماتم کناں کیوں نہ رہتے ہوں۔" ۲

۱۸۳۷ء میں جب بہادر شاہ تخت نشین ہوئے تو وہ بھی اپنے والد کی طرح شہنشاہ اور غازی کے خطابات سے سرفراز ہوئے، لیکن شہنشاہیت برائے نام تھی اور عوام بھی اُس برائے نام شہنشاہیت کے برسوں سے عادی ہو چکے تھے۔ آخری مغل شہنشاہ بھی دربار تو بڑے تزک و احتشام سے کرتے تھے لیکن عملی طور پر اُن میں اتنی صلاحیت اور قوت باقی نہیں رہ گئی تھی کہ وہ کسی بڑی تحریک کی قیادت کر سکتے۔ وہ ہمت اور شجاعت جو بابر سے لے کر اورنگ زیب تک مغل شہنشاہوں کا طرۂ امتیاز رہی تھی، اِن آخری مغل شہنشاہوں کے حصے میں نہیں آئی تھی جن کا سلسلہ محمد شاہ سے شروع ہو کر بہادر شاہ پر ختم ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے بہادر شاہ ظفر کی شخصیت انگریزوں کے لیے کسی خطرے کا سبب نہیں بن سکتی تھی۔

۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کی صبح کو اچانک یہ معلوم ہوا کہ میرٹھ کی ہندوستانی فوجوں نے بغاوت کر دی ہے اور یہ باغی فوجیں جمنا کی کشتیوں کے پُل کو پار کر کے دہلی پہنچ گئی ہیں۔ اہلِ دہلی اُس وقت تک میرٹھ کی بغاوت سے بے خبر تھے، چنانچہ ۱۱ر مئی کی صبح کو بھی سب لوگ اپنے اپنے معمولات میں مصروف تھے۔ پہاڑ گنج تھانے کے انچارج معین الدین حسن ایک فوجی مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں مسٹر ہچنسن کی عدالت میں مصروفِ کار

تھے۔[۳] منشی جیون لال صبح ہی کپتان ڈگلس سے قلعے میں ملاقات کر کے گھر واپس آ چکا تھا اور اب کچہری جانے کے لیے پالکی کا منتظر تھا۔[۴] سیمسن کمشنر دلی ابھی محو خواب تھا، اچانک یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ میرٹھ کی فوج بغاوت کر کے دلی پہنچ گئی ہے۔ باغی فوج نے چنگی کی چوکی کو آگ لگا کر اس کے داروغہ کو جان سے مار ڈالا تھا۔ ہچنسن عدالت سے رخصت ہو کر فوراً کمشنر کے بنگلے کی طرف لپکا۔ کمشنر کی طرح خود بہادر شاہ ظفر کے لیے بھی یہ خبر اتنی ہی غیر متوقع اور حیرت ناک تھی۔ قلعے کی پشت پر جھروکے کے نیچے جمنا کی ریتی میں باغی فوجیں اکٹھا ہو گئیں۔ یہ شور و غوغا سن کر بادشاہ پریشان ہو گئے۔ ان کے کمزور دل میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ اس جم غفیر کا سامنا کر سکتے، چنانچہ انھوں نے فوراً انگریز قلعے دار کپتان ڈگلس کو بلا بھیجا۔ اس اثنا میں حکیم احسن اللہ خاں نے تسبیح خانے میں آ کر باغی سواروں سے پوچھ گچھ کی، جس کا حال ظہیر دہلوی نے اس طرح بیان کیا ہے:

"حکیم احسن اللہ نے بموجب حکم تسبیح خانے میں آ کر سوارانِ باغیہ سے استفسارِ حال کرنا شروع کیا۔ چند افسران گھوڑوں پر سے اتر پٹری پر آ کر کھڑے ہو گئے اور زیرِ جھروکہ سے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا:

تقریر زبانی سوارانِ باغیہ

حضور بادشاہ سلامت! آپ دین دنیا کے بادشاہ ہیں، آپ کو حق تعالیٰ نے بائیس صوبوں کا مالک کیا ہے، تمام ہندوستان آپ کا محکوم اور فرمانبردار ہے، ہندوستان کی رعیت آپ کی رعیت میں شمار ہوتی ہے۔ آج تک ہندوستان میں منادی پھرتی ہے تو یہی بیان کیا جاتا ہے: خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی کا، انگریز لوگ آپ کی طرف سے مالک و مختار ہیں، ہم لوگ آپ کے پاس فریادی آئے ہیں، امیدوارِ انصاف ہیں، ہم ملازم انگریزی ہیں ...... سرکار کی نسبت میں فتور ہوا اور ہمارے دین و مذہب کے درپئے تخریب ہوئے اور چاہا کہ تمام

ہندوستان کو عیسائی کریں...... ہم لوگوں کو خیالِ دین و آئین دامن گیر ہوا، نزاع بڑھ گئی مقدمہ طول کھینچ گیا......" ۵

باغی سپاہ کی یہ تقریر بادشاہ کے لیے ناقابلِ یقین تھی۔ اُنھیں اپنی مجبوریوں اور کم زوریوں کا بہ خوبی احساس تھا، وہ انگریزوں کے خلاف ایسا قدم خواب و خیال میں بھی نہیں اٹھا سکتے تھے، اِس لیے اس صورتِ حال سے اُنھوں نے فوری طور پر جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہ تھا کہ فوج نے یہ جو کچھ کیا ہے، محض نادانی کی بنا پر کیا ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے فوج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا :

" سنو بھائی ! مجھے بادشاہ کون کہتا ہے، میں تو فقیر ہوں، ایک تکیہ بنائے ہوئے اپنی اولاد کو لیے بیٹھا ہوں۔ یہ بادشاہت تو بادشاہوں کے ہمراہ گئی۔ میرے باپ دادا بادشاہ تھے جن کے قبضے میں ہندستان تھا سلطنت تو برسوں پہلے میرے گھر سے جا چکی تھی۔ میرے جَدّ و آبا کے نوکر چاکر اپنے خداوندانِ نعمت کی اطاعت سے جدا گانہ رئیس بن بیٹھے۔ میرے باپ دادا کے قبضے سے ملک نکل گیا، قوتِ لایموت کو محتاج ہو گئے...... میں تو ایک گوشہ نشین آدمی ہوں، مجھے ستانے کیوں آئے ہو ! میرے پاس خزانہ نہیں کہ میں تم کو تنخواہ دوں گا۔ میرے پاس فوج نہیں کہ میں تمھاری امداد کروں گا۔ میرے پاس ملک نہیں کہ تحصیل کر کے تمھیں نوکر رکھوں گا۔ میں کچھ نہیں کر سکتا ہوں۔ مجھ سے کسی طرح توقع استطاعت کی نہ رکھو" ۶

اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء تک بہادر شاہ ظفر کو اس انقلاب کے بارے میں کچھ بھی پتا نہیں تھا۔ انھیں اس حادثے کی اطلاع ۱۱ مئی کی صبح کو آٹھ بجے ملی۔ اس کی تفصیل سراج الاخبار میں شائع ہوئی تھی، جس کا خلاصہ یہ ہے :

صبح آٹھ بجے بادشاہ کو بتایا گیا کہ انگریزی فوج کے سوار اور پیدل ملازموں نے ضلع میرٹھ کے حکّام کی حکم عدولی کی۔ افسران کو قتل کر دیا اور

دہلی پہنچ کر لال قلعے کے پاس جوق در جوق زیرِ جھروکہ جمع ہو گئے۔ بادشاہ نے فوراً سیف الدولہ کو حکم دیا کہ قلعے دار کپتان ڈگلس کو مطلع کرو۔ قلعے دار وہاں آیا اور اس نے زیرِ جھروکہ ہجوم کو مخاطب کر کے کہا کہ بادشاہ کو تکلیف مت دو، یہاں سے کہیں اور چلے جاؤ۔ باغی سپاہی راج گھاٹ کی طرف چلے گئے، قلعے دار زیرِ جھروکہ جانا چاہتا تھا مگر بادشاہ نے منع کر دیا اور اس کی حفاظت کے لیے احکام صادر کیے۔ تھوڑی دیر میں خبر آئی کہ قلعے دار اور دوسرے تمام مرد عورتوں کو قتل کر دیا گیا۔ ان کے مکانات لوٹ لیے گئے اور پھر پورے شہر میں قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا۔ جہاں کہیں بھی انگریز نظر آتا ہے، اسے قتل کر دیا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہندوستانیوں کو بھی لُوٹا جا رہا ہے۔ دوپہر تک لوگوں کے گروہ کے گروہ فریاد کرتے ہوئے آئے کہ بادشاہ اپنے فرزندوں کو شہر کے انتظام پر مقرر کریں۔ بادشاہ نے مرزا ظہیر الدین بخت بہادر عرف مرزا مغل اور مرزا عبداللہ کو تعینات کیا کہ فوج لے کر شہر جائیں اور امن و امان قائم کریں۔" ۷

سراج الاخبار کی اس خبر سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ انقلاب سے بے خبر تھے۔

ادھر سیمسن اور ہچنسن جو ڈگلس کے ہمراہ قلعے پہنچے تھے، واپسی پر ہندستانیوں کے ہاتھوں قتل کر دیے گئے۔ لوگوں میں بے پناہ جوش و خروش تھا۔ شہر پر قبضہ ہو چکا تھا، چھاؤنی خالی ہو چکی تھی، لیکن ابھی تک میگزین انگریزوں کے ہاتھ سے نہیں نکلا تھا۔ نو انگریز افسروں کا ایک حفاظتی دستہ میگزین پر تعینات تھا۔ جب باغی فوجوں نے میگزین کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور سیڑھیوں کی مدد سے چڑھ کر میگزین پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تو لاچار انگریزوں کو خود اپنے ہی ہاتھوں سے میگزین کو اڑا دینا پڑا۔ ایک ہیبت ناک دھماکا ہوا اور میگزین بھک سے اُڑ گیا۔ اس کے ساتھ ہی آس پاس کے مکانات بھی ملبے کا ڈھیر ہو گئے۔ سیکڑوں ہندستانیوں کے جسم چیتھڑوں کی طرح اُڑ گئے۔ نو انگریز افسران جو میگزین میں موجود تھے، اُن میں سے چھے زخمی حالت میں باقی بچے، جن میں سے پانچ کو

بعد میں وکٹوریہ کراس ملا۔[8]

حکیم احسن اللہ خاں نے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک بار پھر اُن کو تمام حالات سے آگاہ کیا۔ اب یہ بالکل واضح ہو چکا تھا کہ بغاوت کے اس سیلابِ عظیم کو روکنا مقامی انگریز افسران کے بس کی بات نہیں۔ اکثر انگریز افسران تو مارے ہی جا چکے تھے اور جو بچ رہے تھے، اُن کی حالت خستہ تھی۔ بادشاہ بہت سراسیمہ تھے۔ انھوں نے حکیم احسن اللہ خاں کے مشورے سے فوراً ایک چھٹی آگرے کے لفٹننٹ گورنر کے نام روانہ کی، جس میں تمام حالات تفصیل کے ساتھ درج کیے گئے تھے۔ مولوی ذکاء اللہ نے لکھا ہے کہ بادشاہ نے لفٹننٹ گورنر کے نام سانڈنی سوار کے ہاتھ جو چھٹی روانہ کی تھی، اُس میں یہ فارسی شعر بھی تھا:

بہ لبم رسیدہ جانم، تو بیا کہ زندہ مانم
پس از آں کہ من نہ مانم، بچہ کار خواہی آمد[9]

گویا اُس وقت تک بادشاہ انگریزوں ہی کو دوست اور ہمدرد سمجھتے تھے اور انقلاب سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ اُس وقت قلعے کی جو حالت تھی، اُس کا ذکر جیون لال نے اس طرح کیا ہے:

"حکیم احسن اللہ خاں نے پھر ان فوجوں کی فہرست طلب کی جنھوں نے بغاوت کر دی تھی۔ شاہی محل کے افسر منتظم کو بھی طلب کیا گیا۔ اس کے بعد چند مقتول افسروں کی خبر محل میں پہنچی اور مُثا سواروں کی ایک نئی پلٹن بھی دیوانِ خاص کے صحن میں خیمہ زن ہوئی۔ بہت سے آدمی زبردستی بادشاہ کے حضور میں پہنچ گئے جو اس وقت دیوانِ خاص میں جلوہ فرما تھے ...... محل کا صحن ابتری، گھبراہٹ اور باہمی تنازعات کا بدترین نمونہ پیش کر رہا تھا۔ فوج میں ڈسپلن پیدا کرنے کی غرض سے حکیم احسن اللہ خاں نے شہزادگان کو مختلف رجمنٹوں کی کمان لینے کا حکم صادر کیا۔"[10]

ظفر کی زندگی میں اس پیرانہ سالی میں یہ پہلا موقع تھا جب انھیں ایسے ہنگامی حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا، چناں چہ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، جب باغی سپاہ نے اُن کے آگے سرِ تسلیم خم کیا اور اُن سے تحریک کی قیادت کی درخواست کی تو وہ حیران و پریشان رہ گئے۔ اُدھر شہر میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی اور غلط قسم کے عناصر موقعے کا فائدہ اُٹھا کر لوٹ مار پر تُلے ہوئے تھے، جس سے شہر کا امن برباد تھا اور باشندگانِ شہر عاجز و پریشان تھے۔ بادشاہ کو دہلی اور اہلِ دہلی سے جو بے پناہ محبت تھی، اُس کی وجہ سے وہ دہلی کی بربادی دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے تھے، لہٰذا اُن کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ شہر میں امن و امان کس طرح قائم ہو۔ چناں چہ اگلے دن یعنی ۱۲ مئی کو اُنھوں نے شہر کے عمائدین کی ایک کونسل طلب کی جس میں اِن امور پر غور کیا گیا کہ فوج کے لیے غلّے اور قیام کا کیا بندوبست ہو اور اس کے لیے روپیا کہاں سے آئے اور یہ بھی کہ شہر میں نظم و نسق کس طرح برقرار رکھا جائے۔"

شہر میں امن و امان برقرار رکھنے کی غرض سے ضعیف العمر بادشاہ خود ہاتھی پر سوار ہو کر شہر کے معائنے کے لیے نکلے۔ بادشاہ نے دکان داروں کو تسلّی دے کر اُن کی دکانیں کھلوائیں، لوگوں کو سمجھایا اور بعض کے گھر جا کر انھیں صبر کی تلقین کی۔[۲] مرزا مغل اس اثنا میں تمام افواج کے کمانڈر انچیف مقرر ہو چکے تھے۔ دوسرے شہزادوں کو بھی بڑے بڑے عہدے دیے جا چکے تھے۔ فوج کے تجربہ کار افسران بادشاہ اور کمانڈر انچیف کے ساتھ مکمل طور پر تعاون کرنے کو تیار تھے۔ شہری اور فوجی بدامنی کو روکنے کے لیے ایک "کورٹ بنائی گئی"، جس کے دس ممبر تھے۔ اُن میں چھے فوجی نظم و نسق کے نمائندے تھے اور چار شہری امور کے۔ کثرتِ رائے کو فیصلہ کُن مانا گیا تھا۔ کمانڈر انچیف مرزا مغل فوج کے سربراہ تھے اور اُن کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ کورٹ کے کسی بھی فیصلے کو نظرِ ثانی کے لیے واپس بھیج سکتے تھے اور اگر نظرِ ثانی کے بعد بھی کورٹ اپنے سابقہ فیصلے پر قائم رہے، تو پھر آخری فیصلے کا اختیار بادشاہ کو تھا کہ وہ جو قدم مناسب سمجھیں، اُٹھائیں۔ بادشاہ اور کمانڈر انچیف کو کورٹ کے

اجلاس میں شرکت کرنے کا اختیار بھی حاصل تھا۔ اِن حالات میں کورٹ کی تشکیل کے بعد بہادر شاہ ظفر انگریزوں کی حمایت کا خیال چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور پھر پوری طرح انقلابیوں کے ساتھ ہو گئے۔ جہاں تک اِنقلابیوں کا تعلق ہے، وہ تو انھیں پہلے ہی اپنا بادشاہ تسلیم کر چکے تھے۔ ۱۶ر مئی کو بادشاہ نے دربار کیا اور حسبِ ذیل عہدے تقسیم کیے۔

" مرزا جواں بخت بہادر : عہدۂ وزارتِ کل سلطنت

مرزا مغل بہادر : عہدۂ سپہ سالاری کل افواجِ جنگی و انتظامِ جمیع تمام پلاٹن و سوارات

مرزا عبداللہ بہادر : افسری پلٹن

مرزا سہراب بہادر : افسری پلٹن

مرزا اخضر سلطان بہادر : افسری پلٹن الیکزنڈر

مرزا محمد کوچک سلطان بہادر و مرزا ابوبکر بہادر : افسرانِ جمیع ترک سواران "[۱۳]

اس سلسلے میں ایک اور خبر ۲۳ر مئی کے سراج الاخبار میں ملتی ہے، لیکن یہ خبر بھی ۱۵یا ۱۶ر مئی کے آس پاس ہی کسی دن سے متعلق معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ اس میں ان ترک سواروں کی آمد کا ذکر ہے جن کی افسری ۱۶ر مئی کی اطلاع کے مطابق مرزا کوچک سلطان بہادر اور مرزا ابوبکر بہادر کو سونپی جا چکی تھی، تاہم یہ خبر بھی قابلِ غور ہے، اس لیے درج کی جاتی ہے:

" جس دن ترک سواران اور مردمِ پلاٹن جنگی، خدمت میں حاضر ہوئے تھے، تو بادشاہ نے کہا تھا کہ ہمارے پاس مال و خزانہ نہیں ہے جس سے تمھاری مدد کریں۔ ایک جان ہے اُس سے دریغ نہیں۔ ترک سوار وغیرہ اس پر راضی ہو گئے۔ انھوں نے عرض کیا ہم آپ کی فرماں برداری کے لیے حاضر ہیں، ارشاد ہوا کہ میگزین اور خزانے کا

بندوبست کرنا چاہیے تاکہ ہمارے تمہارے کام آسکے ۔" ۱۴

اگرچہ کمانڈر انچیف کا عہدہ مرزا مغل کو مل گیا اور بعد میں بخت خاں کو بھی گورنر جنرل کے خطاب سے نوازا گیا لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بادشاہ آخر وقت تک بذاتِ خود فوجی انتظام میں دل چسپی لیتے رہے تھے۔ نیشنل آرکائوز میں ایسی دستاویزیں موجود ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ امن وامان قائم رکھنے کے لیے بادشاہ روزانہ خود احکام جاری کیا کرتے تھے ۔ ۱۵

اس میں شک نہیں کہ ۱۸۵۷ء کی اس بغاوت کے پیچھے ایک زبردست جوش اور جذبہ کارفرما تھا، اس لیے کہ اس بغاوت کا براہِ راست تعلق ہندستان کی تہذیبی، سماجی، اقتصادی اور مذہبی زندگی سے تھا۔ ہندستان پر انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے یہ زندگی بری طرح متاثر تھی۔ ہر شعبۂ زندگی میں ایک بے چینی کی سی کیفیت تھی جسے ذہنی اور جذباتی دونوں سطحوں پر محسوس کیا جا سکتا تھا۔ بدقسمتی سے بغاوت کی تحریک کوئی منظم شکل نہیں اختیار کر سکی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ سماج کے مختلف طبقوں میں برٹش راج کو اکھاڑ پھینکنے کے مقاصد جدا جدا تھے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں حصّہ لینے والوں میں موٹے طور پر تین طرح کے عناصر شامل تھے۔ ایک تو وہ سپاہی جن کے ہاں ایک ایسا والہانہ مذہبی جذبہ تھا جس نے ملک کے ایک سرے سے دوسرے تک ایک سیاسی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ دوسرے وہ سپاہی جو وقتی طور پر تو ایک جذبے کے ساتھ اس تحریک میں شامل ہو گئے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس روایتی لوٹ مار میں بھی حصّہ لیتے رہے جو ہندستان بلکہ پورے ایشیا میں فوجی مہموں کا ایک حصّہ رہی ہے۔ تیسرے اس تحریک میں شامل ہونے والے وہ لوگ تھے جن کے ہاں کوئی جذبہ نہیں تھا مگر وہ "مجاہدین" بن کر باغیوں کے ساتھ صرف اس لیے شریک ہو گئے کہ یا تو لوٹ مار میں ہاتھ رنگ سکیں یا انگریزوں کی جاسوسی کریں اور انعام پائیں۔ یہ تمام مثبت اور منفی کردار پوری تحریک میں اس طرح گھل مل گئے تھے کہ ان کی شناخت مشکل تھی۔ انگریزوں کی طاقت سے ٹکر لینا یوں بھی آسان نہیں تھا اور جب خود تحریک میں ہی غدار اور موقع پرست لوگ شامل ہوں تو اس کا انجام

معلوم۔ ان حالات میں جب بادشاہ نے تحریک کی قیادت سنبھالی تو ہر طرح کی دقتے داریوں اور پریشانیوں نے انھیں بری طرح آن گھیرا۔ ایک طرف تو انگریزوں کو شکست دینا تھا اور دوسری طرف مقامی فتنہ و فساد پر بھی قابو پانا تھا۔ خزانے میں روپے کا نام نشان نہ تھا۔ سپاہی تنخواہوں کے لیے واویلا مچا رہے تھے۔ ان حالات میں بادشاہ نے یہ حکم جاری کیا:

"تمام مہاجنوں اور مال دار اشخاص کو گرفتار کر لیا جائے بالخصوص اُن کو جو انگریزوں کے ہوا خواہ ہیں اور ان سے باغیوں کی تنخواہ کے لیے روپیا اینٹھا جائے۔" ۱۶

حکیم احسن اللہ خاں نے عرض کیا کہ سپاہی شہر میں لوٹ مار کر رہے ہیں اور درخواست کی کہ انھیں شہر بدر کیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں فوراً ہی افسرانِ پلاٹن کے نام یہ حکم صادر کیا گیا:

"چوں کہ جنگی پلٹن کے شہر میں وارد ہونے کی وجہ سے شہر کی بربادی کا خطرہ ہے اس لیے انھیں حکم دیا جاتا ہے کہ پلٹن کے افسران اپنے سالار کے ساتھ اپنے خیمے شہر کے باہر نصب کریں اور یہی احکام برخوردار کامگار مرزا ظہیر الدین کے لیے بھی ہے جو کل فوج کے سپہ سالار ہیں۔ برخوردار کامگار بھی یہ حکم ان تک پہنچا دیں اور تمام فرزندان بھی جو اپنی اپنی پلٹن کے سالار ہیں اپنے خیمے شہر کے باہر نصب کریں تاکہ بادشاہ سلامت کے حکم کی تعمیل ہو کیوں کہ اسی میں ان کی خوشنودی ہے۔ ۲۹ رمضان ۲۱ معلّا۔" ۱۷

(فارسی سے ترجمہ)

منشی اجودھیا پرشاد کے سپرد ٹکسال کا کام ہوا اور ان کی نگرانی میں تیزی سے سکّے بننے شروع ہو گئے۔ عبداللطیف نے ۲۵ مئی ۱۸۵۷ء کو اپنے روزنامچے میں لکھا ہے:

"اس کام میں نہایت اہتمام کیا گیا اور تیزی سے سکّہ بننا شروع ہوا۔ سکّے کا چہرہ اس طرح روشن ہوا:

سکّہ زد در جہاں بفضلِ الٰہ شاہِ ہندوستاں بہادر شاہ" ۱۸

۱۸۵۷ء کی جنگ میں انقلابیوں کی ناکامی کے جہاں اور بہت سے اسباب تھے، وہاں ایک سبب یہ بھی تھا کہ دہلی میں انگریزوں نے جاسوسوں کا جال پھیلا رکھا تھا۔ یہ جاسوس ہر جگہ موجود تھے، قلعے میں، فوج میں، شہر میں، حلقۂ امرا میں یہاں تک کہ بادشاہ کے مقربینِ خاص یعنی حکیم احسن اللہ خاں اور نواب محبوب علی خاں کو بھی اس اعتبار سے شبہے کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ جیون لال لکھتا ہے :

"آج یہ بات معلوم ہوئی کہ کسی نے اسلام گڑھ کی توپوں کو کنکروں اور پتھروں سے بھر دیا ہے۔ شبہ حکیم احسن اللہ خاں پر کیا گیا اور اس الزام میں کہ وہ انگریزوں سے ملی بھگت رکھتے ہیں، بادشاہ کے حضور میں پیش کیا گیا۔ باغیوں نے حکیم صاحب اور محبوب علی خاں کو قتل کر دینے کی دھمکی دی اور تلواریں بھی میان سے نکال لیں۔ ہر دو ملازموں نے حلف اٹھایا کہ ہم بے گناہ ہیں۔ بادشاہ نے ملازمین کی حمایت کی اور سپاہیوں کا غصّہ فرو کر دیا۔" ۱۹

حکیم احسن اللہ خاں کے کردار پر اس بارے میں بجا طور پر شبہے کی گنجائش ہے کہ وہ انگریزوں کے خیر خواہ ہی نہیں، ان کے معتبر جاسوس بھی تھے۔ ان کے رویّے پر گریٹ ہیڈ کے ایک خط سے بھی روشنی پڑتی ہے جو اس نے ۱۵ اگست ۱۸۵۷ء کو دہلی کے محاذِ جنگ سے جان برنس کے نام بھیجا تھا۔ اِس خط میں باغیوں کے اُس رویّے کا جواز بھی موجود ہے، جو اُنھوں نے حکیم صاحب کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ خط کا اقتباس یہ ہے :

"مولوی رجب علی (صاحب) نے مجھ سے خواہش کی ہے کہ میں آپ کو یہ اطلاع دوں کہ انھوں نے حکیم احسن اللہ (صاحب) کے نام ایک مراسلہ بھیجا تھا جو مجھے پڑھ کر سنایا گیا تھا اور میرا یہ خیال تھا کہ اس سے کچھ ضرر نہ پہنچے گا بلکہ ممکن ہے اس کی وجہ سے حکیم صاحب بادشاہ اور باغیوں کے منصوبوں کے اندرونی راز بتانے کے قابل ہو

جائیں۔ مولوی صاحب کہتے ہیں کہ اس کے باعث حکیم صاحب کی سخت بے عزتی ہوئی اس لیے کہ وہ مراسلہ سپاہیوں کے ہاتھ پڑ گیا جنھوں نے ان کے مکان کی تلاشی لے ڈالی۔" ۲۰

جیون لال نے بھی ایک جگہ ایسی ہی بات لکھی ہے:

"باغیوں نے حکیم احسن اللہ خاں پر انگریزوں سے سازش کرنے کا الزام لگایا اور ان پر پہرا بٹھا دیا گیا۔ ان سے کہ دیا گیا کہ آپ بادشاہ سے گارد کی موجودگی کے بغیر بات چیت نہیں کر سکیں گے۔ نواب محبوب علی خاں کے مکان پر بھی پہرا بٹھا دیا گیا۔" ۲۱

انقلابیوں نے بادشاہ سے شکایت کی کہ کوئی شخص شہر میں ایسا ہے جو انگریزوں سے خط و کتابت کرتا ہے، لہٰذا اس شخص کا کھوج لگایا جائے۔ اگلے روز محل کے اناج خانے میں گولہ بارود کی کچھ مقدار پائی گئی جس کی نسبت یہ گمان ہوا کہ یہ انگریزوں کو بھیجی جانے والی ہے۔ چناں چہ باغی فوج کے افسروں نے حکیم احسن اللہ خاں اور محبوب علی خاں پر حملہ کر دیا۔ خیال یہ تھا کہ بادشاہ کی بیگم، زینت محل بھی اس کارگزاری میں شریک ہیں۔ ۲۲

بادشاہ حکیم صاحب پر جتنا زیادہ بھروسا کرتے تھے، فوج کے افسران ان پر اسی قدر شبہہ کرتے تھے۔ حقیقتاً حکیم صاحب کو اس انقلاب سے قطعی دل چسپی نہیں تھی لیکن وہ کھُل کر اس کی مخالفت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو بادشاہ کی ضرورت سے زیادہ حمایت حاصل تھی اور اسی لیے وہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے۔ انقلاب کی تحریک میں شامل ہو جانے کے بعد بہادر شاہ ظفر نے اس میں حالات کے دباؤ کے مطابق حصہ لیا۔ شاید انھیں یہ بھی محسوس ہونے لگا ہو کہ ان کی کھوئی ہوئی سلطنت، دولت، جاہ و حشم سب واپس مل جائے گا۔ اس کا امکان ہے کہ وہ بیچ بیچ ہندستان کے بااختیار شہنشاہ بننے کا خواب دیکھنے لگے ہوں، خاص طور پر اس وقت سے جب سے باغی فوجوں نے ان کو پورے ہندستان کا شہنشاہ کہا تھا اور تمام اختیارات ان کو سونپ دیے تھے۔ وہ مقدور بھر پوری احتیاط اور حکمت عملی کے ساتھ تمام امور میں دل چسپی لیتے اور ایسے احکام صادر

کرتے رہتے جن سے لوگوں میں اتحاد اور اپنی ذمّے داریوں کا احساس پیدا ہو اور شہر میں نظم و نسق قائم رہے۔ انھوں نے تمام افواج کے نام ایک شقہ جاری کیا جس میں فوجیوں کو اس بات کی تلقین کی گئی تھی کہ وہ اپنے فرائض اور ذمّے داریوں کو پورا کریں۔ یہ شقہ نیشنل آرکائوز کے ریکارڈ میں محفوظ ہے اور سات دفعات پر مشتمل ہے۔ شقے کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے:

"۱۔ جو فوجیں انگریزوں پر فتح پانے کی غرض سے بادشاہ کے ساتھ شریک ہوئی ہیں، اُن پر یہ واجب اور لازم ہے کہ وہ بادشاہ کے احکام بجا لائیں اور پوری جاں فشانی کے ساتھ دشمن کا صفایا کرنے کی کوشش کریں۔ اس سے انھیں بادشاہ کی خوشنودی حاصل ہوگی، جو ان کے لیے وسیلۂ ترقی ثابت ہوگی۔

۲۔ ہر پیادے اور سوار پر لازم ہے کہ اپنے افسر کی فرماں برداری کرے۔ اسی طرح چھوٹا افسر بڑے افسر کی فرماں برداری کرے اور بڑا افسر فوج کے نظم و نسق کو اپنے لیے لازم سمجھے۔

۳۔ سب سپاہیوں اور سرداروں پر واجب ہے کہ وہ دشمنانِ دین اور مدعیانِ ملک کو مارنے، گرفتار کرنے یا سزا دینے میں کسی قسم کی پہلو تہی سے کام نہ لیں۔ اس لیے کہ اس کام میں پوری خلقِ خدا کی بہبود ہے۔

۴۔ جو سپاہی اور افسر، اِن احکام پر عمل کرے گا، اپنے عہدے کے مطابق انعام اور اضافہ پائے گا اور جو شخص اپنی جان نثار کرے گا اس کے اہل و عیال کی اچھی طرح پرورش کی جائے گی اور اس کے بیٹے، پوتے یا کسی قریبی عزیز کو اس کی جگہ ملازم رکھ لیا جائے گا۔

۵۔ جو دشمنانِ دین سے ساز باز کرے گا یا کسی طرح ان کی مدد کرے گا یا انھیں رسد پہنچائے گا، وہ خدا اور رسول کا گنہ گار ہوگا اور اپنے کیے کی سزا پائے گا۔

۶۔ جس پہاڑی میں کفار پناہ گزین ہیں، وہ باوجود کثرتِ فوج کے سر نہیں ہوئی ہے، جس کی وجہ سے ملک کے انتظام میں خلل پڑا ہوا ہے اس لیے بہادروں کو چاہیے کہ جان و دل سے اس معرکے میں مصروف ہو جائیں اور پوری کوشش کریں کہ دشمنانِ دین ہلاک اور تباہ ہو جائیں اور اس فتح کی خبر سب طرف پھیلے۔

۷۔ جو سوار اور تلنگے جس جس پلٹن میں ہیں، وہ اپنے اپنے افسر کے ماتحت رہیں، اِدھر اُدھر منتشر نہ ہوں۔ بعد میں امورِ سلطنت کے انتظام کے مطابق ہر کسی کو بھرتی کیا جائے گا۔

چھوٹے افسروں اور سپاہیوں کو چاہیے کہ بادشاہ کے اِن احکام کو بجان و دل قبول کریں اور ان کے مطابق عمل کریں۔ جو افسر یا سپاہی اپنی پلٹن سے الگ ہو جائے، اس کی رپورٹ متعلقہ افسر حسبِ ضابطہ سرکارِ شاہی میں کرے تاکہ وہ سزا پاکر نکالا جائے۔" ۲۳

ان حالات میں بادشاہ ذرا ذراسی بات پر مشتعل ہو جایا کرتے تھے۔ انھیں سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ انقلابی اگر ہار گئے تو انگریز انھیں زندہ نہیں چھوڑیں گے، اس لیے یہ قدرتی بات ہے کہ وہ اِس انقلاب کی کامیابی کے متمنی رہتے ہوں۔ وہ معمولی سی بدنظمی پر بھی جھلّا اُٹھتے تھے اور بہت زیادہ غصّے اور مایوسی کا اظہار کرتے تھے۔ چناں چہ ایک مرتبہ وہ بخت خاں پر بھی بہت ناراض ہوئے، اور اُنھوں نے انتہائی کبیدہ خاطر ہو کر بخت خاں سے کہا:

"شہسوار اور ہوتے ہیں اور گدھے دوڑانے والے دوسرے ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لومڑی کی لڑائی کیا لڑے گی۔ بخت بلند خاں رونے لگے اور بولے: بادشاہ کو صاحبِ خدا کہتے ہیں بارگاہِ الٰہی میں ان کی دعائیں مستجاب ہوتی ہیں اور جو دعائیں وہ کرتے ہیں مقبول ہوتی ہیں اور وہ جو کچھ کہتے ہیں ہو کر رہتا ہے۔ ہماری تمنّا ہے کہ بادشاہ کی دعا لشکر کے لیے

پسپا ہو۔ یہ سُن کر بادشاہ نے یہ آیت پڑھی: نصرٌ من اللہ و فتحٌ قریب و بشّر المومنین۔"[۲۴]

حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک میں فوجی تنظیم نام کو نہیں تھی۔ ایک بے پناہ جوش تھا جس کی بدولت انقلاب تو برپا ہوگیا تھا لیکن اس انقلاب کی کامیابی اور استحکام کے لیے کوئی باقاعدہ اور سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی تھی۔ ان حالات میں سب سے زیادہ مصیبت بادشاہ کو خود اپنی نظر آرہی تھی۔ ایسے ہنگامی حالات میں بھی شہزادے بدعنوانیوں سے باز نہیں آرہے تھے۔ فوج کے لیے شہزادے مہاجنوں اور ساہوکاروں سے روپیا جمع کرتے تھے لیکن اسے خزانے میں جمع نہیں کرتے تھے۔[۲۵] مجبور ہوکر بادشاہ نے کل اختیارات بخت خاں کو سونپ دیے اور انھیں لارڈ گورنر کا خطاب عطا کیا۔ اگرچہ مرزا مغل کمانڈر انچیف تھے لیکن بات زیادہ بخت خاں ہی کی چلتی تھی، اس بنیاد پر اکثر مرزا مغل اور بخت خاں کے درمیان اختلافِ رائے رہتا جو تحریک کی کمزوری کا ایک اور سبب تھا۔ جیون لال لکھتا ہے:

"محمد بخت خاں نے بادشاہ سے کہہ دیا کہ اگر کسی شہزادے نے شہر کو لوٹنے کی کوشش کی تو میں اس کی ناک اور کان کٹوا دوں گا۔ بادشاہ نے جواب دیا تمھیں پورے اختیارات حاصل ہیں، جو بہتر سمجھو کرو۔"[۲۶]

مرزا مغل کے نام بھی ایک شقہ اسی قسم کا جاری کیا گیا کہ جن لوگوں نے شہر میں قتل و غارت اور لوٹ مار مچا رکھی ہے انھیں گرفتار کیا جائے اور شہر کا امن و امان بحال رکھا جائے۔"[۲۷]

جولائی کے مہینے میں تحریک اپنے پورے شباب پر تھی۔ شہری امور میں امکان بھر سمجھ بوجھ اور دانش مندی سے کام لینے کی کوشش کی جارہی تھی۔ چناں چہ ہندو مسلم اتحاد کو قائم رکھنے کے لیے ۹ جولائی کو یہ منادی کرائی گئی کہ جو شخص گائے ذبح کرے گا، اسے توپ سے اُڑا دیا جائے گا لیکن اگر کوئی بکری ذبح کرنے پر اعتراض کرے گا تو اُسے بھی سزا دی جائے گی۔[۲۸] کچھ دن بعد جب بقرعید کا تہوار قریب آگیا تو ایک

بارِ پھر گائے کے ذبیحے کی بابت منادی کرا دی گئی اور اس سلسلے میں بادشاہ نے ایک شقّہ کوتوالِ شہر شاہ مبارک خاں کے نام جاری کیا جو اس طرح تھا:

"حضور والا کا خاص شقّہ حضور معلّا شجاعت نشان کے دستخطوں کے ساتھ۔ مبارک شاہ خاں کوتوالِ شہر کو معلوم ہو کہ کُل تمام شہر میں شقّۂ خاص کے مطابق یہ منادی کرا دی جائے کہ گائے کا ذبیحہ یا قربانی قطعی ممنوع قرار دے دی گئی ہے۔ شہر کے تمام دروازوں پر یہ بندوبست کر دیا جائے کہ کسی بھی جانب سے گائے یا بھینس فروخت کرنے والے آج سے لے کر عید کے تین روز بعد تک گائے یا بھینس شہر میں نہ لائیں۔ جن مسلمانوں نے گائیں پال رکھی ہیں، وہ اپنی گائیں کوتوالی میں بندھوا دیں۔ اگر کوئی شخص خفیہ طور پر یا اعلانیہ گائے کی قربانی کرے گا، تو اُسے موت کی سزا دی جائے گی۔ ۲۹ (فارسی سے ترجمہ)

شہر کوتوال نے اس شقّے کی روشنی میں جملہ تھانیدارانِ شہر کے نام احکام جاری کیے اور تھانیداروں کو تاکید کی کہ اس حکم کو نہ صرف اپنے اپنے علاقوں میں مشتہر کریں بلکہ اس کی وصولیابی کی رسید بھی کوتوالِ شہر کے پاس بھیجیں۔ ۳۰ اس حکم کے اجرا کے بعد عملی دشواریوں کے پیشِ نظر کوتوال نے کمانڈر انچیف کو لکھا کہ کوتوالی میں اتنی گنجائش نہیں کہ یہاں گائیں رکھی جا سکیں۔ جواباً کمانڈر انچیف نے ایک حکم جاری کیا جس میں ہدایت کی گئی کہ وہ تمام لوگ جن کے پاس پالتو گائیں ہیں، اُن سے یہ عہد نامہ بھروا لیا جائے کہ وہ گائیں ذبح نہیں کریں گے۔ ۳۱ اس قانون پر سختی سے عمل درآمد کیا گیا۔ چناں چہ ایک شخص کی گرفتاری عمل میں آئی جس نے انگریزوں کی سازش کے تحت محض تنازعے کی غرض سے گائے ذبح کر ڈالی تھی۔ شہر کوتوال نے مرزا مغل کے نام اپنے ایک خط میں اس معاملے پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

"حقیقت یہ ہے کہ مسمی عبدالرحمان ولد محمد پناہ، شیخ پیشہ ساکن چاہ سرخ، غلام محمد و ممتن ولد عظیم اللہ، ساکن قدم شریف کو....

"... حوالدار کمپنی اول نے کہ تعینات موری دروازے کے ہے بعلت گاؤکشی اس عبارت سے کہ انگریزوں سے سازش کر کے پانصد روپیہ لینا کر کے ہمارے گارد کے سامنے براد تنازعہ ہو جانے ہندو مسلمان میں کری۔ اس علت میں گرفتار کو توالی ہوئے۔" ۳۲

ایک طرف تو یہ احتیاط و انتظام تھا اور دوسری طرف جاسوس بیخ کنی پر لگے ہوئے تھے انگریزوں کو پل پل کی خبر ل رہی تھی اور اسی اعتبار سے وہ اپنے منصوبے بناتے تھے قلعۂ معلا کی سیاست، اندرونی نفاق، فوجی بدنظمی غرض انگریز انقلابیوں کی ہر کمزوری سے باخبر تھے اور اس لیے بد دل نہیں تھے۔ گوری شنکر جاسوس لکھتا ہے:

"آج کہ روز شنبہ ہے راقم فوج میں گیا تھا اور نیک (نایک ــــ) سدھاری سنگھ کے کمپو میں زیادہ دیر تک ٹھہرا رہا مگر سپاہ کو کمال بددل پایا۔ ایک ایک سپاہی افسر کا مقابلہ کرتا تھا اور حکم مطلق خیال میں نہیں لاتا تھا اور فوج مفلس ہو گئی اور روپے کی بہت قلت ہے۔ سپاہی پکار پکار کر کہتے ہیں کہ اگر ہم کو تنخواہ نہیں ملے گی تو ہم نہیں رہنے کے۔ چنانچہ آج ہی سو نفر سے زیادہ تلنگا چلا گیا۔ ہر روز قافلے کی روانگی جاری ہے مگر مرزا مغل زیادہ تر فوج کی تسلی کرتا رہتا ہے اور ہر روز تنخواہ تقسیم کا حکم جاری ہوتا ہے۔ اس بات سے اس قدر فوج مقیم ہے ورنہ اب تک بہت سی چلی جاتی۔" ۳۳

بخت خاں اور مرزا مغل کے اختلافات کے سلسلے میں بھی گوری شنکر لکھتا ہے:

"مرزا مغل بیگ اور بخت (بہادر میں) نزاع و عداوت ہو گئی چناں چہ مرزا مغل، بخت خاں کی شکایت برملا کرتے تھے اور باعثِ عداوت یہ ہے کہ سپہ سالار فوج بخت خاں کو مقرر کیا تھا۔ مرزا مغل بیگ کو ناگوار ہوا۔ اگر بخت خاں کا کمپو تمام مارا جائے تو مغل بیگ کا کمپو اس کی معاونت نہ کرے۔" ۳۴

ایک متوقع حملے کی خبر گوری شنکر کے ذریعے انگریزوں تک اس طرح پہنچتی ہے:

"آج تمام افسران کو بادشاہ نے پھر گلے ملا دیا اور سب کا اتفاق ہوگیا اور سدھارا سنگھ جرنیل جو بے دل تھے اس سے آشتی ہوگئی۔ شام کے وقت تمام کمپنیوں کی پریٹ ہے یقین ہے امروز فردا دھاوا ہوگا اور تین پلٹن سوار ہوں گے۔" ۴۵

ایک بار کسی طرح بارود خانے میں آگ لگ گئی۔ لوگوں نے شبہہ ظاہر کیا کہ یہ حرکت حکیم احسن اللہ خاں کی ہوسکتی ہے چناں چہ احسن اللہ خاں کا سامان لوٹ لیا گیا۔ گھر کو آگ لگا دی گئی۔ بادشاہ کی نظرِ کرم ان پر بے پناہ تھی اس لیے انھوں نے بادشاہ کے دامن میں پناہ لی اور اس طرح جان بچی۔ عبداللطیف لکھتا ہے:

"ناگاہ بارود خانے میں ایک پتھر آ گرا اور اس سے آگ لگ گئی اور اس (حادثے نے) پانسو بیس بارود بنانے والوں کو ایسا جلا ڈالا کہ ان کی روح دنیا سے پرواز کر گئی۔ بدکردار لشکریوں نے یہ حرکت عمدۃ الحکما حکیم احسن اللہ خاں کی طرف منسوب کی، انھیں ملامت کی اور ان کے گھر اور اسباب کو لوٹ لیا، بادشاہ کی حمایت سے ان کی جان بچی۔ بادشاہ نے فرمایا عمدۃ الحکما ہمارے دشمن کا دشمن ہے۔" ۴۶

اس واقعے کا ذکر بالکل اسی طرح جیون لال اور گوری شنکر نے بھی کیا ہے۔ گوری شنکر کے بیان سے یہ پتا چلتا ہے کہ اس موقعے پر نہ صرف یہ کہ زینت محل کے بارے میں بھی شبہہ ظاہر کیا گیا تھا بلکہ بادشاہ کی جان بھی خطرے میں پڑ گئی تھی:

"دیروز بعد تاخت و تاراج کرنے مکان حکیم احسن اللہ کے سپاہ تلنگہ سواروں نے مکان حکیم مذکور کو آتش دی کہ تمام مکان سوخت ہوا اور اب تک اس کا مکان جل رہا ہے اور اسباب بھی لوٹ کر چلے جاتے ہیں اور حکیم کو قلعے میں لے جا کر رات سے قید کر رکھا ہے حکیم، بادشاہ کے پاس تھا (سپاہ نے) بادشاہ سے کہا کہ حکیم کو ہم کو

دے دو ورنہ تمہارا خون اور تمہارے شہزادوں کا اور محل میں جاکر
قتل کریں گے ...... اور زینت محل کی طرف بھی اشتباہِ غالب ہے
..... زینت محل کا مکان کہ اس قرب وجوار میں تھا بادشاہ کے حکم
کے بموجب اس کی نگہداشت ہوئی ورنہ اس کی لوٹ کا بھی ارادہ تھا
...... اور باروت خانے میں جو آگ لگی تھی دریہ ورز ..... ایک اتفاق
سے ہی یہ امر ہوا ہے ورنہ کارسازی حکیم مذکور کو دخل نہیں ہے۔" ۳۷

نیشنل آرکائوز میں محفوظ MUTINY PAPERS سے، جن کی بنیاد پر اس باب میں زیادہ تر بحث کی جارہی ہے، یہ حقیقت بہت واضح ہوکر سامنے آتی ہے کہ حکیم احسن اللہ خاں، زینت محل اور الٰہی بخش انگریزوں سے ساز باز رکھتے تھے۔ چنانچہ تراب علی جاسوس ایک جگہ لکھتا ہے:

"اب التماس کمترین، کہ منجملہ سلاطین عظام، مرزا الٰہی بخش صاحب
قدیم خیر طلب سرکار ہیں اور منشاے زینت محل صاحبہ یہی ہے کہ کسی طرح
انتظام سرکار کا ہو جائے چناں چہ صرف اس ضرورت کو مرزا الٰہی بخش سے
صفائی کی ہے اور مشورہ اپنا ہے کہ کوئی صورت نکالنا چاہیے۔ اگر ان
مدارجات سے کہ جن کا انصرام ان سے ممکن ہو تحریر فرمادیں تو کوئی صورت
ملاقات اور محرمیتِ راز بیگم صاحبہ اور مرزا الٰہی بخش سے کری جائے اور
جو حکیم صاحب سے ممکن ہو ان کو بھی دریغ نہیں۔" ۳۸

بہادر شاہ ظفر کی طبیعت میں مروّت اور رواداری حد سے زیادہ تھی، اس لیے وہ معاملہ فہمی سے کام نہیں لے پاتے تھے اور اکثر جذبات کے تابع رہتے تھے۔ حکیم احسن اللہ خاں سے انھیں بے پناہ عقیدت بھی تھی اور محبت بھی اس لیے وہ کسی بھی قیمت پر ان کی وفاداری پر شک کرنے کو تیار نہیں تھے اور نہ ایسی کوئی بات وہ سننا چاہتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے خود اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر حکیم احسن اللہ خاں کی جان بچائی تھی۔ چناں چہ حکیم احسن اللہ خاں کی جانب باغی سپاہ کا جو رویہ تھا، جب وہ اس سے بہت دل برداشتہ ہوگئے، تو انھوں نے افسرانِ فوج کے نام یہ حکم نامہ جاری کیا:

" حکم نامہ بنام افسرانِ فوج

حکم حضورِ والا کا یہ ہے کہ ایک تو امر یہ ہے کہ جس طور سے سپاہ کی خوشی ہوئی اس طور پر خوشی میں نے کی اور اپنی جان کا دریغ نہ کیا اس واسطے کہ یہ جو فوج سے میں نے اقرار کیا کہ تم میرے بیٹا اور بیٹی کی جاے ہو...... خواہ بچہ ہوتا ہے اور ضد کرتا ہے تو اس کی ضد اٹھائی جاتی ہے اس واسطے میں نے تمہاری ضد اٹھائی اور جس طرح تمہاری خوشی تھی وہ کیا۔ مگر افسوس ہے تم نے میری جان کا دریغ نہ کیا اور اس ضعیفی کی طرف خیال نہ کیا۔ تو چاہیے اب یہ ہے کہ میری ضعیفی کی طرف خیال کرنا چاہیے کہ میرا حال کیا ہوا جاتا ہے ایک ایک لمحے میں کس واسطے (کہ) میرا مزاج حکیم احسن اللہ کے ہاتھ میں ہے اور تھا۔ وہ ہر وقت میرے مزاج کی خبر لیتا رہتا تھا تو اب میرے مزاج کی خبر لینے والا بجز خدا کے اور کوئی نہیں ہے۔ لمحہ لمحہ میرے مزاج کا عجیب حال ہوا جاتا ہے، اب سب صاحبوں کو، سرداران و سپاہیوں کو چاہیے کہ جس طرح میں نے تمہاری خوشی کی ہے اسی طرح پر تم میری خوشی کرو، حکیم احسن کے اوپر سے گارد ہٹا لینی چاہیے، رہائی دینی چاہیے اور نبض میری دیکھ جایا کرے ادھر تم لوگوں کو جو دشمن بہکاتے ہیں، ناحق، تو اسے خیال نہ کرنا چاہیے اور جو شخص یہ کہے کہ یہ ایسا ہے تو اس سے کہو کہ میری چھٹی پکڑ کر لاؤ ہمارے پاس، جس میں ہم کو یہ معلوم ہو کہ یہ دشمن ہمارا ہے، اس کے بموجب سزا ہم آپ دیں گے۔ اور یہ مال اسباب جو لٹا ہے سو بادشاہی لٹا۔ چاہیے کہ تحقیق کر کے سب اسباب حضور میں داخل ہو اور جن کی شرارت سے لٹا ہے ان کو مطابق گناہ کے کورٹ کی تجویز سے سزا ملے اگر یہ منظور نہیں ہے تو ہم کو خواجہ صاحب میں پہنچا دو، ساتھ حفاظت کے۔ میں وہاں پہنچ کر مجاوری کروں گا

اور بیٹھا رہوں گا۔ اور یہ بھی نہیں ہوگا تو میں یہاں سے اُٹھ کھڑا ہوں گا جس سے روکا جائے وہ مجھے روک لے کس واسطے کہ ان کے ہاتھ سے قتل نہ ہوا تمھارے ہاتھ ہوا۔ اور رعیت میں جو ظلم ہو رہا ہے رعیت پر نہیں ہے میرے اوپر ہے۔ چاہیے سب کو اس کا بندوبست کریں اور نہیں تو مجھ کو جواب دیں میں ہیرا کھا کے سو رہوں گا اور ایک صندوقچہ میرے حضور والا کا برد و غارت (کذا) اسباب حکیم احسن اللہ خاں جاتا رہا جو کوئی تاریخ ۱۶ ذالحجہ سے کاغذ لکھا ہوا اُس میں میرا ہوگا جائز نہ ہوگا۔" ۳۹

بغاوت کے آخری دنوں میں انگریزوں کی فتح سے قبل ہی تحریک تقریباً دم توڑ چکی تھی۔ خزانے میں روپیا ختم ہو چکا تھا اور سپاہی تحریک کے مقاصد کو چھوڑ کر اپنی تنخواہوں کی فکر میں لگ گئے تھے۔ ستمبر کے مہینے میں ابتدا ہی سے زوال کے آثار صاف نظر آنے شروع ہو گئے تھے، چناں چہ گوری شنکر ۲ ستمبر کو لکھتا ہے:

"دیروز تقسیم تنخواہ پر قلعے میں بڑا دنگا فساد ہوا یہاں تک کہ دو کمپنی نے خاص محل بھی گھیر لیا۔ بادشاہ فوراً بہ استماع خبر محل سے برآمد ہوئے۔ صوبے داروں نے تنخواہوں کے واسطے عرض کیا بادشاہ نے فرمایا کہ نہ ہم نے تم کو بلایا اور نہ ہم کو تمھاری ایسی غرض ہے اور نہ میرے پاس روپیا ہے کہ تم کو دوں غرض بدیر قیل و قال ہوتی رہی۔" ۴۰

تاہم اب بہادر شاہ ظفر کسی بھی قیمت پر اس صورتِ حال کے لیے تیار نہیں تھے کہ انگریز آکر دلی پر قبضہ کریں اور انھیں اور ان کے خاندان کو پھانسی دے دیں۔ اس لیے وہ ہر قیمت پر جنگ جاری رکھنے کے حق میں تھے اور فوج کی تنخواہ کی ادائگی کے لیے اپنا ساز و سامان بھی الگ کرنے کو تیار ہو گئے تھے۔ بقول جیون لال:

"افسروں نے بار بار تنخواہوں کی ادائگی کا انتظام کرنے کے لیے زور دیا اور دھمکی دی کہ اگر کچھ انتظام نہ ہوا تو ہم شہر کو لوٹ لیں گے

بادشاہ نے جواب دیا کہ لوٹنے کی ضرورت نہیں میں اپنے گھوڑے ہاتھیوں اور شاہی زیورات کو فروخت کر دوں گا اور فوج کی تنخواہ ادا کر دوں گا۔ اگر میں ایسا نہ کروں تو تم سب کے سب شہر چھوڑ کے چلے جاؤ اس لیے کہ میں نے تم کو بلایا نہیں تھا تم اپنی خوشی سے آئے تھے۔" [۴۱]

اگلے روز یہ خبر پہنچی کہ میرٹھ میں انگریزی راج دوبارہ قائم ہو گیا ہے اور علی گڑھ پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا ہے۔[۴۲] جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا، حالات نازک صورت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ ۴ ستمبر کی رپورٹ ہے کہ "نصیر آباد کی فوج نے رات کو بادشاہ کو تنخواہ کے متعلق سخت رنج پہنچایا جس پر بادشاہ نے اپنے تمام چاندی کے ظروف ان کے حوالے کر دیے اور کہا کہ انھیں بیچ کر جو کچھ ہاتھ آئے، اُسے آپس میں تقسیم کر لو۔"[۴۳]

اس کے ساتھ ہی قلعے کی سیاست نے ایک اور کروٹ لی۔ اب تک انگریزوں کو شکست دینے کے لیے بہادر شاہ ظفر اپنا مال و دولت ہی لٹا رہے تھے لیکن اب انھوں نے اس جنگ کو جیتنے کے لیے اقتدار کی بازی بھی لگا دی۔ چناں چہ جب باغی فوجوں سے کچھ کام بنتا نظر نہیں آیا تو رجواڑوں سے رجوع کیا گیا اور انھیں اس بات کی دعوت دی گئی کہ اگر وہ اس جنگ میں بادشاہ کا ساتھ دیں گے تو بادشاہ اپنے شاہی اختیارات بھی انھیں سونپ دیں گے۔ اس سلسلے میں جیون لال رقم طراز ہے:

"جے پور، بیکانیر اور الور کے راجگان کے نام بادشاہ کی دستخطی چٹھیاں بھیجی گئی ہیں جن میں لکھا گیا تھا کہ مجھے فوج کی ضرورت ہے اور میں انگریزوں کو تباہ و برباد کر دینا چاہتا ہوں لیکن چوں کہ اس وقت میرے پاس سلطنت کا انتظام کرنے کے لیے قابلِ اعتماد آدمی موجود نہیں ہیں اس لیے میں ریاستوں کی ایک مجلس بنا دینا چاہتا ہوں اگر وہ ریاستیں جن کے نام خط بھیجے جا رہے ہیں اس غرض کے لیے مجلس بنا لیں گی تو میں نہایت خوشی سے اپنے شاہی اختیارات ان کے ہاتھ

میں دے دوں گا۔" ۴۴

بادشاہی کیمپ میں ایک ہڑبونگ مچی ہوئی تھی اور ادھر انگریز اپنے منصوبے تیار کر رہے تھے۔ گوری شنکر کا آخری خط جو نیشنل آرکائوز میں ملتا ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ اس نے شہر دہلی کی ساری صورتِ حال انگریزوں پر واضح کر دی تھی اور انھی معلومات کی بنیاد پر انگریزوں نے شہر پر ایک بھرپور اور کام یاب حملہ کیا۔ گوری شنکر نے یہ خط بڑی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے جس کا مضمون حسبِ ذیل ہے:

"واضح ہوا ہے کہ آپ میرے سے تین سوال کا جواب طلب کرتے ہیں۔ اوّل یہ کہ اندرونِ شہر کس کس مقام پر سامانِ جنگ کیا ہے اندرونِ قلعہ کس جگہ جمعیت واسطے لڑائی کے ہے یا نہیں اور اضرابِ توپ کہاں لگائی گئی ہیں۔ دوم یہ کہ فوج سوار و سپاہ کہاں کہاں جمعیت رکھتی ہے۔ سوم یہ کہ کابلی دروازے سے تا اندرونِ شہر چار پُل ہیں، ان میں سے کوئی شکستہ ہوا یا نہیں۔ سو اب جواب ہر ایک کا مفصل لکھا جاتا ہے۔ اوّل سوال کا جواب یہ ہے کہ سامانِ جنگ جملہ تیرہ دروازہ ہائے شہر پر ہے اس میں سے خصوصیت سے کشمیری دروازہ و کابلی دروازہ و اجمیری دروازہ۔ چناں چہ کشمیری دروازہ و (کذا) دروازہ و بروج متعلقہ اس کے و کابلی دروازہ صدمات (کذا) سرکاری سے توپ ان کی مسدود ہو گئی بلکہ برج سیاہ منہدم ہو گیا اور شہر پناہ اس طرف سے تا گرجا شکست ہو گئی اور کابلی دروازے کا بالکل تیغہ ہے اور لال دروازہ بند اور کھڑکی فراش خانہ بالکل مسدود۔ باقی رہا اجمیری دروازہ اس پر زیادہ سامانِ جنگ ہے۔ اتواپ مقدار دروازہ ضرب مدرسہ غازی الدین لگائی ہوئی ہیں اور ماوری دروازہ ہائے مذکور اور کسی جگہ سامان جنگ نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر روز خبرِ حملۂ لشکرِ سرکار کی جو گرم پائی گئی دو توپ جستی بر سڑک

لاہوری دروازہ و برمکان کوتوال اور ایک توپ بر کوٹھی لالہ ہرنرائن بر نہر سعادت خاں واقع ہے اور سڑک سے داہنی طرف لگا دی ہے بگراب وہ اتواپ اٹھا کر لے گئے اور لاہوری دروازہ اور کشمیری دروازہ (رہا) ئے مابین جو راہ آمد و رفت ہے ان پر دو..... صلابت کوچہ بنی ہوئی ہیں ان کے اوپر دمامہ واسطے لگانے اتواپ کے بنایا ہے....... علیٰ ہذالقیاس دیوارِ شکستہ شہر پناہ کا ہے اور یہی حال ہے اور اندرون قلعہ جمیعت پلٹن دو کی ہے۔ منجملہ اس کے ایک سلیم گڑھ اور ایک قلعے میں اور ساری پلٹن دو سوار رجمنٹ بہم اردلی شہزادہ قلعے ہیں جمیعت رکھتے ہیں اور تین ضرب توپ جستی آہنی دیوانِ عام میں اور ایک ضرب دروازہ دلی اور ایک لاہوری قلعے کی (کذا) دروازہ رکھی ہے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ جمیعت سوار و پیادوں کی ایسا مقام یا کوئی کوچہ و بازار شہر میں باقی نہیں ہے جہاں فوج نہیں ہے۔ باقی رہا (کذا) قلت و کثرت سواروں کا حال لکھا جاتا ہے کشمیری دروازے پر کوٹھی کرنل جیمس اسکر صاحب موجودہ ایک پلٹن جلیسر، اور ایک پلٹن بریلی اور کابلی اور (بدرو) دروازے کے درمیان میں (حسن) پلٹن کی کمپنی میں...... اور نگم بودھ کی طرف ایک پلٹن اور لاہوری دروازے ہیں (کذا) و اجمیری دروازہ مدرسہ نواب غازی الدین خاں ایک پلٹن (کذا) بازار تین حوض قاضی اور بازار سیتارام و محلہ املی ترکمان دروازہ تین پلٹن سوتین اور..... فروکش ہیں اور دلی دروازے کے درمیان بازار....... اور دریا گنج میں پانچ پلٹن...... چاندنی چوک میں سوارانِ ہندوستان اور رسالہ سوم متعین ہیں۔ تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ جس قدر پل یا نہر متعلق کابلی دروازہ کشمیری دروازہ شہر واقع ہیں تا ایندم صحیح سلامت ہیں۔"

اسی خط کے آخر میں گوری شنکر لکھتا ہے:

"اور واضح ہووے کہ راقم کی کارکردگی منظور ہوئی ہووے ساٹھ قطعہ کھیت عنایت ہوں اگر ایک صرف فدوی کے واسطے عنایت کریں گے تو فدوی نہیں لے گا۔"۴۵

اہلِ شہر رعیت میں شمار ہوتے تھے۔ انھیں اپنے بادشاہ سے عقیدت اور محبت تھی اور وہ بادشاہ کو خدا کا سایہ تصور کرتے تھے۔ سیاسی اعتبار سے ان کے بادشاہ کی حیثیت کیا رہ گئی تھی، اس بات کی عام لوگوں کو نہ تو کچھ خبر تھی اور نہ اس سے انھیں کوئی سروکار رکھتا۔ انقلابی فوجوں میں نظم ونسق کی کمی اور روپے کی قلت کی وجہ سے کچھ لوگ ساتھ چھوڑ کر چلے گئے تھے اور کچھ لوگ اتنے دنوں میں جنگ میں مرے بھی تھے۔ اب آخری حل یہی رہ گیا تھا کہ شہر کی حفاظت کے لیے ہر فرد و بشر کمربستہ ہو جائے۔ جس طرح ملک کی تمام طاقتوں کو ایک مرکز پر لانے کے لیے دہلی اور لال قلعے کا رخ کیا گیا تھا اسی طرح اب پوری دہلی کو ایک مرکز پر لانے کے لیے اور اس بات کے لیے کہ فوجی اور شہری ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملا کر جدوجہد میں حصہ لیں بادشاہ خود اٹھے۔ چناں چہ ۱۲ ستمبر کے روز حسبِ ذیل منادی شہر میں کرائی گئی:

"بوقتِ شب شہر میں منادی ہوئی کہ بادشاہ سلامت سوار ہوں گے مناسب ہے کہ ہندو و مسلمان، ہمراہ حضرو اسطے جہاد کے ساتھ ہو دیں چناں چہ معاً دس بارہ ہزار آدمی شہر کا مسلح قلعے میں گیا۔"۴۶

جیون لال نے بھی اس واقعے کا ذکر اس انداز سے کیا ہے:

"منادی کرادی گئی کہ بادشاہ بہ نفسِ نفیس آج رات کو انگریزوں پر حملے کی کمان کریں گے اور انھیں تباہ کردیں گے اور تمام شہر کو دعوت دی گئی کہ وہ بھی انگریزی لشکر پر حملے میں شریک ہوں اور انگریزوں سے لڑیں۔ اعلان میں ہندو اور مسلمان دونوں سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اس کام کے لیے حلف اٹھاویں۔"۴۷

بالآخر ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو انگریزوں کی فوجیں کچھ ایسے مقامات سے جہاں فصیل شکستہ ہوگئی تھی، شہر میں داخل ہونے میں کام یاب ہوگئیں۔ ۱۴ ستمبر سے ۱۹ ستمبر تک پانچ دن لگاتار شہر میں جنگ ہوتی رہی۔ ۱۴ ستمبر کو انگریزی فوجیں کوتوالی اور جامع مسجد تک پہنچ گئیں باغیوں نے جامع مسجد میں پناہ لی اور وہیں سے مدافعت کرتے رہے۔ انگریزوں کی پیش قدمی کو عارضی طور پر روک دیا گیا اور وہ کشمیری دروازے کی طرف واپس چلے گئے۔ ۴۸

غلام حسین کے قول کے مطابق بادشاہ خود سوار ہو کر لال ڈگی پر تشریف لائے اور تمام افواج و رعایا جمع ہوئی لیکن انگریزوں کی گولیاں لال ڈگی تک پہنچتی تھیں اس لیے افسران نے عرض کیا کہ حضور کا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں ہے ایسا نہ ہو کہ حضور کو کچھ صدمہ پہنچے۔ بادشاہ ان لوگوں کے کہنے سے قلعے میں چلے آئے۔ ۴۹

اس دوران ۱۷ اور ۱۸ ستمبر کو شہر میں گھمسان کی لڑائی ہوئی، ہر طرف گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ باغی سپاہیوں میں اب لڑنے کا دم باقی نہیں رہا تھا، چنانچہ ۱۹ ستمبر کو جو ہفتے کا دن تھا، بادشاہ نے قلعہ چھوڑ دیا اور بیگمات اور شہزادوں کے ساتھ سلطان جی چلے گئے۔ غلام حسین خاں اس وقت کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "قلعہ اور شہر کے لوگ ننگے پانو ننگے سر شہر سے نکلے اور جس کا جدھر منہ اٹھا چل دیا۔ کوئی قدم شریف کی طرف بھاگا، کوئی پہاڑ گنج چل دیا، کوئی جے سنگھ پورہ۔ اکثر درگاہ سلطان جی صاحب اور روشن چراغ دہلی درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین ..... وغیرہ۔" ۵۰

غالب نے دستنبو میں اس المناک حادثے کی تصویر کشی بڑے عبرت ناک انداز میں کی ہے:

> "دو تین دن تک کشمیری دروازے تک تمام راستے میدانِ جنگ بنے رہے۔ دہلی دروازہ، ترکمان دروازہ، اجمیری دروازہ، یہ تینوں دروازے اس فوج کے قبضے میں رہ گئے.... مجھ مردہ دل کا خاک کدہ وسط شہر میں کشمیری دروازے اور دہلی دروازے کے درمیان ہے

اور میرے مکان سے ان دونوں کا فاصلہ برابر ہے اگرچہ گلی کا دروازہ بند کر دیا گیا لیکن ابھی اتنا حوصلہ باقی تھا کہ باہر چلے جاتے تھے اور کھانے پینے کا سامان لے آتے تھے۔

انگریزوں کی فتح اور مظالم

میں نے ابھی کہا کہ غضب ناک شیروں (انگریزوں) نے شہر میں داخل ہوتے ہی بے سروسامان لوگوں کو قتل کرنا اور مکانوں کو جلانا جائز سمجھا۔ ہاں جس مقام کو لڑ کر فتح کرتے ہیں لوگوں پر ایسی ہی سختیاں کی جاتی ہیں۔

اس غصے اور دشمنی کو دیکھ کر لوگوں کے منہ فق ہو گئے بے شمار مرد عورتوں کے گروہ جن میں معمولی لوگ بھی تھے اور صاحب حیثیت بھی ان تینوں دروازوں سے باہر نکل گئے۔ شہر کے باہر چھوٹی چھوٹی بستیاں اور مقبرے تھے ان میں پناہ گزین ہو گئے۔" ۵۱

کہا جاتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے قلعہ چھوڑنے سے قبل بخت خاں نے بادشاہ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ ان کے ساتھ لکھنؤ بھاگ چلیں:

"جنرل بخت خاں تھوڑی سی فوج لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے بہ منت درخواست کی کہ حضور میرے ساتھ لکھنؤ بھاگ چلیں۔ انھوں نے منتشر افواج کو جمع کرنے اور شہر کے باہر انگریزی افواج کا مقابلہ کرنے کی غرض سے اپنی خدمات پیش کیں مگر بوڑھے بادشاہ نے انکار کر دیا۔" ۵۲

لیکن بخت خاں کے معروضات کے مقابلے میں مرزا الٰہی بخش کا یہ استدلال بہادر شاہ کے لیے زیادہ قابلِ قبول ثابت ہوا:

"گرمی کا موسم ہے، برسات آ گئی ہے۔ حضور کی ضعیفی اور ناتوانی کا زمانہ ہے، گھر سے باہر نکل کر مسافرت میں امن ہو تب بھی گھر کا سا آرام میسر

آنا محال ہوتا ہے۔ اور لڑائی بھڑائی کی حالت میں تو لازمی طور سے بڑی تکلیفوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آپ چھوٹے چھوٹے شہزادوں، شہزادیوں اور پردہ نشین بیگمات کو لیے کہاں پھریں گے لہٰذا میری گزارش تو یہی ہے کہ آپ باغیوں کے ساتھ تشریف نہ لے جائیں۔ میں انگریزوں سے مل کر تمام معاملات کی صفائی کرا دوں گا اور آپ پر اور آپ کی اولاد پر ایک حرف نہ آنے دوں گا۔ سلطنت کا نظام جو کچھ ہو، آپ کی پلاؤ کی رکابی کہیں نہیں جائے گی۔

مرزا الٰہی بخش کی تقریر سن کر بادشاہ چپ ہو گئے کچھ جواب نہ دیا البتہ ایک خواجہ سرا نے عرض کیا کہ حضور صاحب عالم بہادر تو انگریزوں سے ملے ہوئے ہیں، آپ بخت خاں بہادر کی گزارش پر توجہ فرمائیے ان لوگوں کے کہنے میں نہ آئیے۔ مرنا اور تکلیف اٹھانا تو ہر زندگی کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ تو بادشاہ نے فرمایا میں دونوں باتوں پر غور کر کے کل جواب دوں گا۔" ۵۳

۲۱ ستمبر کو میجر ہڈسن نے ہمایوں کے مقبرے سے بادشاہ کو اس شرط پر حراست میں لے لیا کہ اگر بادشاہ بہ خوشی اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیں گے تو ان کی جان بخشی کر دی جائے گی۔ میجر ہڈسن کی جانب سے بادشاہ کی جان بخشی کی پیش کش خود انگریز افسران کے درمیان ایک متنازعہ معاملہ بن گیا۔ چناں چہ ۳۰ اکتوبر کو سانڈرس (کمشنر و ایجنٹ شمال مغربی صوبہ جات) نے میجر ہڈسن سے اس اقدام کی وضاحت چاہی کہ انھوں نے کس کی ہدایت کے تحت بادشاہ کی جان بخشی کا وعدہ کیا۔ سانڈرس لکھتا ہے:

"میری آپ سے یہ گزارش ہے کہ اس معاملے کی وضاحت کریں کہ جب آپ نے بادشاہ کی جان بخشی کی ضمانت دی تو آپ کس کی ہدایت کے تحت کام کر رہے تھے اور ساتھ میں یہ بھی تفصیل



بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری

سے بیان کیجیے کہ وہ کیا حالات تھے جنھوں نے بادشاہ کو اس بات کی طرف راغب کیا کہ وہ خود کو حکومتِ برطانیہ کے قیدی کی حیثیت سے آپ کے حوالے کر دیں"۔ ۵۴ (انگریزی سے ترجمہ)

سانڈرس کے اس خط کا جواب ہڈسن نے انتہائی تفصیل سے دیا۔ ہڈسن کے اسی خط سے جو اس نے سانڈرس کے خط کے جواب میں لکھا تھا بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کے صحیح حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ ہڈسن کا خط اگرچہ طویل ہے لیکن اس کی جزئیات اس اعتبار سے اہم ہیں کہ یہ بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کے تاریخی المیے سے متعلق بھرپور معلومات بہم پہنچاتی ہیں۔ ہڈسن کا پورا خط اس طرح ہے:

"از طرف لفٹنٹ ڈبلیو ایس آر ہڈسن

به ملاحظہ جی، بی، سانڈرس صاحب

کمشنر و ایجنٹ شمال مغربی صوبہ جات دہلی

کیمپ دہلی۔ ۲۸ نومبر ۱۸۵۷ء

جنابِ عالی

۱۔ آپ کے خط نمبر ۲ مورخہ ۳۰ اکتوبر کا جواب حاضر ہے۔ میں آپ کو اس امر کی اطلاع دینے کی سعادت حاصل کرتا ہوں کہ بادشاہِ دہلی نے اس (مخصوص) شرط پر خود کو میرے حوالے کیا کہ ایک تو ان کی جان بخشی کر دی جائے اور دوسرے یہ کہ ان کی شان میں کوئی گستاخانہ سلوک نہ کیا جائے۔ میرے نام سے یہ وعدہ مرزا الٰہی بخش کے ذریعے ایک روز قبل بیگم زینت محل اور ان کے والد سے بھی کیا جا چکا تھا اور دوبارہ گرفتاری والے دن مولوی رجب علی نے بھی یہی وعدہ (میری طرف سے) بادشاہ سے کیا۔ بعد ازاں بادشاہ کے اصرار پر مجھے بھی بہ زبانِ خود ان الفاظ کو دہرانا پڑا۔

۲۔ میں نے یہ اقدام میجر جنرل ولسن کی ہدایت کے مطابق کیا تھا

جو اس وقت فوج کی کمان کر رہے تھے۔

۳۔ جن حالات کے تحت بادشاہ نے خود کو میرے سپرد کیا وہ درج ذیل ہیں:

جب مجھے اندازہ ہوا کہ بادشاہ واقعی باغیوں کے ساتھ فرار ہونے کی غرض سے قلعہ خالی کر چکے ہیں اور فوری طور پر ہماری کوئی فوج ان کا پیچھا کرنے کے لیے نہیں بھیجی جا سکتی، تو میں نے میجر جنرل سے اس بات کی اجازت چاہی کہ بادشاہ کو یا تو کسی نہ کسی طرح فرار ہونے سے روکوں یا انھیں اس بات پر راغب کر دوں کہ وہ خود کو میرے حوالے کر دیں۔

۴۔ اس غرض سے میں نے مرزا الٰہی بخش کو طلب کیا اور ان کی معرفت زینت محل اور ان کے والد سے سلسلۂ گفت و شنید جاری کیا۔ ان لوگوں کے مطالبات شروع میں بہت غیر ضروری قسم کے تھے۔ بیگم (زینت محل) کہتی تھیں کہ ان کے لڑکے جواں بخت کو ولی عہد تسلیم کیا جائے اور اس (جواں بخت) کے لیے تخت شاہی کی وراثت کی ضمانت دی جائے۔ بادشاہ کا مطالبہ یہ تھا کہ ان کی پنشن بغیر کسی تخفیف کے جاری کی جائے اور پچھلے پانچ ماہ کی ہنگامۂ مئی سے تا حال فوراً ادا کی جائے۔ میں نے انتہائی مشکل کے ساتھ بادشاہ کو ان کے صحیح حالات کا اندازہ کرایا جن میں وہ اس وقت گھرے ہوئے تھے اور جن کی رو سے یہ قطعی ناممکن تھا کہ بادشاہ یا ان کے خاندان کا کوئی فرد اس تخت کو دوبارہ حاصل کر سکے جس کو وہ کھو چکے تھے۔

۵۔ بہت قیل و قال کے بعد جب ان پر یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ بادشاہ اور شہزادوں کی نہ صرف آزادی بلکہ زندگی بھی خطرے میں ہے تو میں نے ان (زینت محل) کے لڑکے (جواں بخت) اور

ان کے والد (احمد قلی خاں) کی جان کی حفاظت کی ذمّہ داری لیتے ہوئے بیگم (زینت محل) کو اپنے مقصد کے لیے ہموار کر لیا اور ان سے یہ شرط لے لی کہ وہ بادشاہ کو اپنے ذاتی اثر سے اس بات پر مجبور کریں گی کہ وہ خود کو میرے حوالے کر دیں۔ مرزا الٰہی بخش نے اس کے بعد بادشاہ کی سواری کا تعاقب کیا اور قطب کے راستے میں اُن کو جا لیا اور اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ درگاہ نظام الدّین نزد مقبرہ ہمایوں کو لوٹ چلیں (بادشاہ) وہاں آکر زینت محل سے ملے اور تمام لوگ مقبرہ ہمایوں میں آ گئے جس روز دہلی دشمنوں سے خالی ہوئی اس دن شام کو مرزا الٰہی بخش یہ مژدہ لے کر میرے پاس آئے۔ اگلے روز صبح میں نے ان کو دوبارہ بھیجا۔ مولوی رجب علی اور گھوڑ سواروں کا ایک مختصر سا دستہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ کچھ توقف کے بعد میں نے اپنے پچاس سپاہی اور بھیجے۔

۶۔ مقبرے کے قریب مولوی رجب علی کی پارٹی پر حملہ ہوا اور چار گھوڑ سوار زخمی ہو گئے لیکن یہ ظاہر تھا کہ یہ حملہ بادشاہ کی پارٹی کا نہیں بلکہ کچھ جذباتی قسم کے لوگوں کا تھا، اس لیے میں نے یہ ضروری نہیں سمجھا کہ بادشاہ کی گرفتاری میں کسی قسم کے پس و پیش سے کام لیا جائے۔ لہٰذا میں نے رسالدار مان سنگھ کو اٹھارہ جوانوں کے ساتھ مولوی رجب علی کے پاس بھیجا اور یہ حکم دیا کہ اگر بادشاہ کو اغوا کرنے کی کوشش کی جائے تو مجھے فوراً اطلاع دو۔ اور جو شخص بھی مقبرے سے باہر جانے کی کوشش کرے اسے (گولی) سے اڑا دو۔ میں (خود بھی) موقعے پر موجود رہا لیکن عمارتوں کی آڑ میں ہو گیا تاکہ نظر نہ آسکوں مولوی رجب علی کو ہدایت دے دی گئی تھی کہ وہ بادشاہ کو بتا دیں کہ اگر وہ خاموشی سے باہر آکر خود کو حوالے کر دیں تو میں (ہڈسن) ان کی حفاظت کا ضامن ہوں لیکن اب اگر انھوں نے مقبرے سے

فرار ہونے کا ارادہ کیا تو (یہ سمجھ لیں) کہ (مقبرے کے) دروازے کی کمان میرے ہاتھ میں ہے میں بغیر کسی رحم کے ان کو اور ان کے لواحقین کو گولی مار دوں گا۔

۷۔ دو تین گھنٹے کے طویل انتظار کے بعد رسالدار نے آکر اطلاع دی کہ بادشاہ آرہے ہیں۔ مرزا الٰہی بخش اور مولوی رجب علی بذاتِ خود بادشاہ کی پالکی کے ہمراہ چل رہے تھے۔ بادشاہ کی پالکی کے بالکل پیچھے بیگم (زینت محل) کی پالکی تھی پھر بادشاہ کے ملازمین اور ان کے پیچھے قلعے اور شہر سے بھاگے ہوئے پناہ گزینوں کا ایک جم غفیر تھا۔ پالکیاں رک گئیں اور بادشاہ نے یہ پیغام میرے نام بھیجا کہ وہ (بادشاہ) خود میری زبان سے اپنی جان بخشی کے الفاظ سننے کے خواہش مند ہیں۔ میں اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر ادھر کی طرف بڑھا لیکن حفظ ماتقدم کے طور پر میں نے اپنے سپاہیوں کو بادشاہ کی پارٹی اور اس مجمعے کے درمیان کھڑا کر دیا جو پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا۔ بظاہر ان سب کے ارادے خطرناک معلوم دے رہے تھے میں نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا اور پھر فوراً بادشاہ اور بیگم کے قریب پہنچ گیا۔ جو عہد میں نے ان سے کیا تھا اس کی بابت دونوں (بادشاہ اور بیگم) احتجاج اور خوف کا مظاہرہ کر رہے تھے کیوں کہ میں نے ان سے یہ شرط لے لی تھی کہ وہ فرار ہونے کی کوشش نہیں کریں گے جس کا کہ اس وقت پورا امکان تھا۔ پھر میں نے خاصی بلند آواز میں ایسے کہ سب سن سکیں اپنے سپاہیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا جو شخص اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش کرے گولی مار دینا۔ جیسے ہی وہ مجمعے سے کچھ اور دور آگئے میں نے مرزا الٰہی بخش اور مولوی رجب علی سے بادشاہ کی پالکیوں کے ساتھ ساتھ چلنے کو کہا اور اپنے سپاہیوں کو ہدایت کی کہ وہ بادشاہ کی پالکی کے پیچھے پیچھے

چلیں۔ اس کے ایک گھنٹے بعد مجھے اس وقت اطمینان کا سانس لینے
کا موقع ملا جب میں نے بادشاہ اور بیگم کو میجر جنرل کے احکام کے مطابق
قلعے کے دروازے پر آپ کے حوالے کر دیا۔" ہڈسن ۵۵
(انگریزی سے ترجمہ)

اس سلسلے میں میجر ہڈسن کا یہ خط ہی سب سے مستند دستاویز ہو سکتی ہے۔ ہڈسن کے بیان کے مطابق جب اس نے جواں بخت اور بیگم زینت محل کے والد احمد قلی خاں کی زندگی کی ضمانت دے دی تو زینت محل اس پر تیار ہو گئیں کہ وہ بادشاہ کو اپنے ذاتی اثر سے اس پر آمادہ کر لیں گی کہ بادشاہ خود کو ہڈسن کے حوالے کر دیں۔ ہڈسن کے خط سے اس بات کا بھی بہ خوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس گرفتاری میں دو تین روز لگے اور اس گرفتاری کو عمل میں لانے کے لیے ہڈسن کو پہلے زینت محل کو شیشے میں اتارنا پڑا۔ گویا ہڈسن اور زینت محل کے درمیان گفت و شنید کا آغاز اس روز سے ہو گیا تھا جس روز بادشاہ نے قلعے کو خیرباد کہا تھا۔ نیشنل آرکائوز میں محفوظ خارجی محکمے کے سیاسی راز" نام کی اس فائل میں جس کے حوالے سے یہاں ہڈسن کا خط نقل کیا گیا ہے، ایک خط ہڈسن کی طرف سے فارسی زبان میں زینت محل کے نام بھی ہے۔ یہ خط ہڈسن نے بیگم زینت محل کو ۱۸ ستمبر کو لکھا تھا جس میں زینت محل کو یہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ ہڈسن کو بیگم زینت محل، جواں بخت اور احمد قلی خاں کی جان بخشی اور ان کے مال و متاع کی حفاظت کا پورا خیال ہے۔ واضح ہو کہ یہ وہ تاریخ ہے جب شہر دہلی میں انگریزوں اور باغیوں کے درمیان گھمسان کی جنگ جاری ہے اور شکست کے آثار ظاہر ہو چکے ہیں لیکن بہادر شاہ ظفر جنھوں نے ۱۹ ستمبر کو قلعے کو خیرباد کہا، ابھی شہر اور لال قلعے میں موجود ہیں۔ گویا زینت محل بیگم نے جو لال قلعے میں نہیں بلکہ غالباً حویلی زینت محل واقع لال کنواں میں مقیم تھیں، انگریزوں کے ساتھ معاملات طے کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ خط کی عبارت حسب ذیل ہے:

• جنابہ بیگم صاحبہ کرمہ و معظمہ زینت محل بیگم صاحبہ! جو لوگ

فساد میں شریک رہے ہیں، انھیں سزا دینا منظور ہے۔ بظاہر بیگم صاحبہ، اور مرزا جواں بخت اور بیگم صاحبہ کے والد کی جان بخشی ہے، آپ لوگ اطمینان کے ساتھ اپنے مکان میں رہیں بعض دریافت طلب امور کے لیے اپنے معتمد کو روانہ کریں تاکہ بیگم صاحبہ کے مکان کی حفاظت کے لیے گارد تعینات کی جا سکے۔" ۵۶ (فارسی سے ترجمہ)

غالباً یہی وہ خط ہے جس کا تذکرہ ہڈسن نے سانڈرس کے نام اپنے مندرجۂ بالا خط کی دفعہ ۵ میں کیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بعد میں زینت محل بھی بہادر شاہ ظفر کے ساتھ مورد عتاب ہوئیں لیکن اس کا نام سیاست ہے اور یہ اعلا پیمانے کی وہ سیاست تھی جسے نہ معصوم بہادر شاہ ظفر ہی سمجھ سکتے تھے اور نہ ان کی خوش فہم اور نادان بیگم زینت محل انگریز افسران یہ بات بہ خوبی جانتے تھے کہ مرزا الٰہی بخش وغیرہ کی طرح بیگم زینت محل بھی برٹش حکومت کی خیر خواہ تھیں لیکن گرفتاریاں عمل میں آجانے کے بعد انگریزوں کی بساطِ سیاست پر شاید اب اِس مہرے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ انگریز معاملے کی اس نزاکت سے بہ خوبی آگاہ نظر آتے تھے کہ معزول بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی بیگم ہونے کی حیثیت سے بیگم زینت محل کو کبھی بھی عوام کی ہمدردیاں حاصل ہو سکتی ہیں، اِس لیے انھیں آزاد چھوڑ دینا کوئی سیاسی دانش مندی نہ ہوگی۔

اگلے روز ہڈسن دوبارہ ہمایوں کے مقبرے گیا اور بغیر کسی شرط کے مرزا مغل، مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر سے مطالبہ کیا کہ وہ سب خود کو اس کے حوالے کر دیں۔ انھوں نے بھی جان بخشی کا وعدہ لینا چاہا لیکن ان کی یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ مرزا مغل، مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر کو ایک بیل گاڑی میں سوار کرا دیا گیا۔ ہڈسن کا کہنا ہے کہ اس موقعے پر ایک مسلح گروہ نے انھیں گھیر لیا تھا لیکن اس پر قابو پانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ ہڈسن جب شہزادوں کو گرفتار کر کے دہلی کی طرف بڑھا تو مجمع بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ جب یہ لوگ دہلی دروازے کے قریب پہنچے تو ہڈسن نے تینوں شہزادوں کو حکم دیا کہ وہ

اپنے کپڑے اتار لیں۔ اس کے بعد ہڈسن نے خود اپنے ہاتھوں سے ان تینوں کو گولی مار دی۔ ہڈسن اس بہیمانہ رویے کا جواز یہ پیش کرتا ہے کہ وہ اس مجمعے سے خوف زدہ ہوگیا تھا جو اس کے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا اور جس کے متعلق اسے یہ خوف تھا کہ کہیں شہزادوں کو رہا کرا کے نہ لے جائے لہٰذا اسے اپنے اور اپنے سپاہیوں کے تحفظ کے لیے یہ وحشت ناک قدم اٹھانا پڑا۔ لیکن یہ بات اپنے آپ میں بہت مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے کہ ہڈسن کو ہمایوں کے مقبرے سے لے کر دہلی دروازے تک تو کوئی خطرہ محسوس نہ ہوا اور جب وہ بالکل شہر کے پاس پہنچ گیا تو اسے اچانک خطرہ لاحق ہوگیا اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ جب اس سے ایک روز قبل وہ بادشاہ اور بیگم زینت محل کو قید کرکے لایا تو اسے اس قسم کا کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوا۔ ۵۷

ذکاء اللہ کا خیال ہے کہ ہڈسن پہلے ہی سے شہزادوں کے قتل کا ارادہ کرکے گیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"بادشاہ کی گرفتاری کے دوسرے دن منشی رجب علی اور مرزا الٰہی بخش نے خبر دی کہ مرزا مغل، مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر بادشاہ کے دو بیٹے اور ایک پوتے بھی مقبرہ ہمایوں میں موجود ہیں جنھوں نے قلعے میں انگریز عورتوں اور بچوں کے قتل میں حصہ لیا تھا۔ میجر ہڈسن کا خون اس خبر سے جوش میں آگیا اور وہ جنرل ولسن سے اجازت لے کر شہزادوں کے قتل کے لیے روانہ ہوا۔" ۵۸

غلام حسن خاں نے لکھا ہے کہ ہڈسن نے "تینوں شہزادوں کو کوتوالی کے سامنے کھڑا کرکے گولی سے اڑا دیا۔" ۵۹ لیکن ذکاء اللہ کا بیان یہ ہے کہ "جب وہ مر گئے تو ان کی لاشوں کو لے کر کوتوالی پر آیا اور لاشوں کو ایک رات دن سر بازار لٹکائے رکھا۔" ۶۰ اس کے بعد بیس شہزادوں کو اور پھانسی پر چڑھایا گیا جس کا ذکر سبین نے کامن ولیتھ لائبریری کے ایک مخطوطے کی عبارت نقل کرتے ہوئے اس طرح کیا ہے:

"میں نے ایک روز دیکھا کہ بیس آدمی قطار میں بیٹھے ہیں۔ مجھے بتایا

گیا کہ یہ سب شہزادے ہیں، ان پر بوائنڈ کی عدالت میں مٹکاف نے
مقدمہ چلایا تھا۔ بوائنڈ نے شہزادوں کو مشتبہ قرار دیتے ہوئے
اظہارِ خیال کیا کہ کیوں کہ وہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، اس
لیے سازشیوں اور باغیوں سے ان کا تعلق قطعی ممکن ہے۔ سب
سزایاب ہوئے، سب کو پھانسی دے دی گئی اور ان کی لاشوں کو
چھکڑے میں لدوا کر بھیج دیا گیا۔" ۶۱

گرفتاری کے بعد بادشاہ کے ساتھ ایسا سلوک ہوتا تھا، جیسا کسی بہت ہی برے اخلاقی مجرم کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگرچہ ان کو آہنی سلاخوں میں تو نہیں رکھا گیا لیکن پھر بھی ان کی حالت انتہائی قابلِ رحم اور عبرت ناک تھی۔ جب ہڈسن ہمایوں کے مقبرے سے بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر کے لایا تو لال قلعے کے دروازے پر انھیں سانڈرس کے حوالے تو کر دیا لیکن انھیں زندگی میں دوبارہ لال قلعے میں قدم رکھنا نصیب نہ ہوا۔

حواشی اٹھارہ سو ستاون

۱- THE SEPOY MUTINY AND REVOLT OF 1857, PP.126-27

۲- ذکاءاللہ دہلوی، ص ۵۶

۳- غدر کے صبح و شام، ص ۵۴

۴- غدر کے صبح و شام، ص ۹۱

۵- (الف) داستانِ غدر، ص ۴۶ تا ۴۷۔

۶- (الف) غالبؔ نے دستنبو میں اس سال (۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۷ء) کا مادّہ تاریخ 'رستخیز بے جا' نکالا ہے۔ (اردوئے معلّٰی، غالب نمبر، حصہ دوم، ص ۱۸۳)

(ب) داستانِ غدر، ص ۴۹ تا ۵۰

(ج) مزید تفصیل کے لیے 'غدر کے صبح و شام'، ص ۱۰۰

۷- سراج الاخبار، نمبر ۱، جلد سیز دہم، مملوکہ نیشنل آرکائیوز

۸- (الف) EIGHTEEN FIFTY SEVEN, PP.76-77

(ب) مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

- داستانِ غدر، ص ۷۶ تا ۷۷
- ۱۸۵۷ کا تاریخی روزنامچہ، ص ۱۲۱
- غدر کے صبح و شام، ص ۶۶

۹- (الف) تاریخ عروجِ انگلشیہ، ص ۴۶

(ب) مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

M.P., COLLECTION NO.57, FILE NOS.539/41, N.A.1

۱۰- غدر کے صبح و شام، ص ۱۰۰

۱۱- (الف) غدر کے صبح و شام، ص ۱۰۲

(ب) ۱۸۵۷ کا تاریخی روزنامچہ، ص ۱۲۳

۱۲۔ غدر کے صبح و شام، ص ۱۰۲

۱۳۔ سراج الاخبار، نمبر ۹، جلد سیزدہم، ۱۹ر مئی ۱۸۵۷ء مملوکہ نیشنل آرکائوز۔

۱۴۔ سراج الاخبار، نمبر ۱۰، ۲۳ر مئی ۱۸۵۷ء مملوکہ نیشنل آرکائوز

۱۵۔ M.P., COLLECTION NO.30, N.A.1.

۱۶۔ غدر کے صبح و شام، ص ۱۸

۱۷۔ M.P., COLLECTION NO.85, FILE NO.2, N.A.1.

۱۸۔ (الف) ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، ص ۱۲۹

(ب) عبداللطیف نے سکے کا جو شعر اپنے روزنامچے میں دیا ہے اس کے مصنف کا نام نہیں بتایا لیکن ایامِ غدر، کے اس طرح کے کئی سکے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جن میں سے دو سکوں کے متعلق انگریزوں کو یہ شبہ تھا کہ یہ غالب کے کہے ہوئے ہیں اور اسی بنیاد پر غالب انگریزوں کے ہاتھوں بہت دن معتوب رہے۔ غالب کے خطوط میں ان سکوں کا ذکر کئی جگہ ملتا ہے۔ گوری شنکر نے، جو غدر، کے زمانے میں انگریزوں کی جاسوسی کر رہا تھا، یہ خبر دی کہ ۱۸ر جولائی ۱۸۵۷ء کو غالب نے ایک پرچے پر یہ سکہ لکھا:

بر زر و سکۂ کشورستانی   سراج الدین بہادر شاہ ثانی

لیکن مالک رام کی تحقیق کے مطابق یہ سکہ ذوق کے شاگرد حافظ ویران کا کہا ہوا ہے جو حافظ ویران کے نام سے صادق الاخبار (دہلی) ۱۳ ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ مطابق ۶ر جولائی ۱۸۵۷ء کے شمارے میں چھپا ہوا موجود ہے جس کا مطلب ہے کہ گوری شنکر کو اس سکے کی خبر اڑتی ہوئی دس بارہ دن بعد ملی اور اس نے یہ خبر غالب کے سر تھوپ دی۔ خلیق انجم نے بھی 'غالب اور شاہانِ تیموریہ' میں سکے سے متعلق تفصیلی بحث کی ہے اور یہ قیاس ظاہر کیا ہے کہ یہ سکہ جو عبداللطیف نے اپنے روزنامچے میں کسی شاعر کا ذکر کیے بغیر نقل کیا ہے۔ شاید غالب کا کہا ہوا ہے۔ اسی طرح معین الدین حسن نے بھی ایک سکے کا ذکر کیا ہے جو گوری شنکر کے بیان کردہ سکے کی قدرے ترمیم شدہ شکل معلوم دیتی ہے۔ سکے کے پہلے مصرعے کے آخر میں 'کشورستانی' کو 'نصرت طرازی' اور دوسرے مصرعے کے آخر میں 'ثانی' کو 'غازی' سے بدل کر شعر یوں کر دیا گیا ہے:

بر زر سکۂ نصرت طرازی   سراج الدین بہادر شاہ غازی

جب لکھنؤ میں باغی فوج نے جمع ہو کر واجد علی شاہ کے گیارہ سالہ فرزند برجیس قدر کو ادھ

کے تخت پر بٹھایا تو ٹکسال جاری ہوئی اور سکے پر بہادر شاہ کی ضرب پڑی۔ بعد میں برجیس قدر کی جانب سے بہادر شاہ ظفر کو جو نذر بھیجی گئی اس میں تاج جواہر نگار، ایک سو اشرفی اور پانچ ہزار روپیہ زرِ نقد اور ضربِ سکّہ شامل تھی۔ سکّے میں جو ترمیم نظر آتی ہے اس سے ایک خیال یہ بھی گزرتا ہے کہ حافظ ویران کا جو سکّہ ۱۸۵۷ء کے صادق الاخبار میں چھپا تھا اس سکّے میں ہنگامی حالات کے مطابق ترمیم کرکے شاید "نصرت طرازی" اور "غازی" کے الفاظ شامل کر دیے گئے ہوں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

(الف) "سکّے کا الزام اور اس کی حقیقت" اور "غالب سے منسوب دوسرا سکّہ" مشمولہ فسانۂ غالب (مالک رام)

(ب) غالب کا سکّہ شعر، مشمولہ ذوق و جستجو (خواجہ احمد فاروقی)

(ج) "سکّے کا الزام" مشمولہ غالب اور شاہانِ تیموریہ (خلیق انجم)

(د) خدنگِ غدر (معین الدین حسن)

۱۹۔ غدر کے صبح و شام، ص ۱۱۹ تا ۱۲۰

۲۰۔ محاصرۂ دہلی کے خطوط، ص ۲۴۴

۲۱۔ غدر کے صبح و شام، ص ۱۲۴

۲۲۔ غدر کے صبح و شام، ص ۱۲۴

۲۳۔ M.P., COLLECTION NO. 94, FILE NO. 1, N.A.I.

۲۴۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، ص ۱۳۲

۲۵۔ (الف) "شہزادوں نے یہ وضع اختیار کر لی کہ مہاجن عزت دارِ شہر کو بہ مددِ سپاہیانِ پلٹن، تو جس کے افسر بنے ہوئے ہیں، طلب کرکے قید کر دیا۔ بطور ڈنڈ جس قدر روپیہ ہاتھ آیا لے لیا۔ وہ روتا ہوا گھر چلا گیا۔ یہاں تیاریِ لباسِ عیش و عشرت میں وہ روپیہ صرف ہوا۔"

(خدنگِ غدر، معین الدین حسن، ص ۶۱ تا ۶۲)

(ب) انگریزوں کا خیال تھا کہ لال قلعہ جرائم پیشہ لوگوں کی ایک مستقل قیام گاہ ہے۔ چنانچہ رزیڈنٹ طامس مٹکاف کی بیٹی، لیڈی کلاؤ بیل اپنی ڈائری میں ایک جگہ لکھتی ہے:

"غدر کے زمانے تک لال قلعے کی چہار دیواری میں بادشاہ کا مکمل اختیار تھا۔ کوئی بھی جرائم پیشہ یا بدمعاش وہاں جاکر پناہ لے سکتا تھا اور پھر وہ کبھی پکڑا نہیں جا سکتا تھا۔

چنانچہ لال قلعہ چوروں، قاتلوں اور ہر طرح کے مجرموں کی آماجگاہ تھا جو برطانوی حکومت کے لیے مستقل پریشانی اور دردسر کا باعث تھا چنانچہ اس طرح کے انتظامات مکمل کر لیے گئے تھے کہ بادشاہ کی موت کے بعد اس صورتِ حال کو بدل کر رکھ دیا جائے لیکن یہ کام ہمارے لیے غدر نے کر دیا جب ہمارے سپاہی قلعے میں داخل ہوئے تو ہر شخص بھاگ کھڑا ہوا۔ ہزاروں مارے گئے۔" (THE GOLDEN CALM, P.208)

۲۶۔ غدر کے صبح و شام، ص ۱۵۲

۲۷۔ M.P.,COLLECTION NO.43, FILE NO.24, N.A.1.

۲۸۔ غدر کے صبح و شام، ص ۱۶۳

۲۹۔ M.P.,COLLECTION NO.142, FILE NO.144, N.A.1.

۳۰۔ M.P.,COLLECTION NO.142,FILE NO.144, N.A.1.

۳۱۔ M.P.,COLLECTION NO.120 FILE NO. 103,144 N.A.1.

۳۲۔ M.P.COLLECTION NO. 103, FILE NO.134, N.A.1.

۳۳۔ M.P.COLLECTION NO. 15,FILE NO. 5, N.A.1.

۳۴۔ M.P.COLLECTION NO. 21,FILE NO. 9, N.A.1.

۳۵ M.P. COLLECTION NO. 21, FILE NO. 19, N.A.1.

۳۶۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، ص ۱۶۲

۳۷ M.P.COLLECTION NO. 21,FILE NO. 78, N.A.1.

۳۸ M.P.COLLECTION NO. 23-24, N.A.1.

۳۹۔(الف) M.P.COLLECTION NO.135, FILE NO.170, N.A.1.

(ب) نیشنل آرکائوز میں اس خط کی دو کاپیاں ہیں اور دونوں کرم خوردہ ہیں مگر اس طرح کہ دونوں کو ملا کر خط کا پورا متن سامنے آجاتا ہے۔ پہلے خط پر ۱۸ ذی الحجہ اور دوسرے پر ۲۰ ذی الحجہ تاریخ پڑی ہوئی ہے۔

۴۰۔ M.P.COLLECTION NO.135, FILE NO.170, N.A.1.

۴۱۔ غدر کے صبح و شام، ص ۲۳۹

۴۲۔ غدر کے صبح و شام، ص ۲۴۴

۴۳۔ غدر کے صبح و شام، ص ۲۴۲

۴۴۔ غدر کے صبح و شام، ص ۲۴۲

M.P. COLLECTION NO. 22, PAGE 1-3 N.A.I. ۔۴۵

M.P. COLLECTION NO.15 FILE NO.20, N.A.I. ۔۴۶

۴۷۔ غدر کے صبح و شام، ص ۲۴۲

۴۸۔ تاریخ عروج انگلشیہ، ص ۵۷۷

۴۹۔ (الف) نصرت نامہ گورنمنٹ، ص ۴۲

(ب) گوری شنکر اور جیون لال کا اشارہ بھی غالباً اس واقعے کی طرف تھا۔

(ج) معین الدین حسن نے اس واقعے کو ذرا دوسرے ڈھنگ سے بیان کیا ہے جس میں بادشاہ کی اہانت کا پہلو بھی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"سب افسرانِ فوج بادشاہ کے پاس جمع ہو کے آئے۔ عرض کی کہ شہر والے و مجاہدین مفت بیٹھے روٹیاں کھاتے ہیں لڑنے کو نہیں جاتے ہیں آپ حکم دیجیے اور خود تشریف لے چلیے۔ بادشاہ نے منادی کرائی کہ آج ہم خود پہاڑی پر حملہ کریں گے جس کو ہمارا ساتھ دینا ہو مغرب کے وقت سے قلعے کے میدان میں حاضر ہو۔ تمام مجاہدین اور شہر کے آدمی شام کے وقت زیرِ قلعہ میدان میں جمع ہو گئے۔ بادشاہ تختِ ہوادار پر سوار ہو کر دلی دروازۂ قلعہ سے برآمد ہوئے۔ سب تخت کے ہمراہ ہو لیے۔ رجمنٹوں سے بھی بہت سپاہی آ گئے تھے سواری بادشاہ کی لال ڈگی ہو کے زیرِ دیوارِ قلعہ چلی جب لاہوری دروازۂ قلعہ کے روبرو پہنچے بادشاہ تختِ ہوادار کو چھوڑ کر دوسرے ہوادار میں سوار ہو بہ بہانۂ استنجا، اندر قلعے کے تشریف لے گئے۔ محلوں میں داخل ہوئے تھوڑی دیر بعد یہ مجمع بھی متفرق ہو کے اپنے اپنے مقاموں پر چلے گئے کچھ اور نہیں ہوا۔"

(خدنگ غدر ص ۷۹)

۵۰۔ نصرت نامہ گورنمنٹ، ص ۴۳

۵۱۔ اردوئے معلّا، غالب نمبر، حصہ دوم، ص ۱۹۴

۵۲۔ (الف) غدر کے صبح و شام، ص ۸۶

(ب) خدنگِ غدر، ص ۸۱

۵۳۔ دہلی کی جاں کنی، ص ۴۱

(ب) معین الدین حسن نے بھی ریلاؤ کی رکابی کا ذکر خاص طور پر کیا ہے۔

(خدنگ غدر، ص ۸۱ تا ۸۲)

(ج) لیڈی کلا یو بیلی کی ڈائری سے پتا چلتا ہے کہ اس کے والد اور دہلی کے رزیڈنٹ ٹامس مٹکاف نے قطب میں اپنے لیے 'دل کشا' نام کی ایک کوٹھی تعمیر کرائی تھی جہاں وہ کبھی کبھی اپنے معمولات سے تھک کر آرام کرنے جاتے تھے، اس کوٹھی میں مٹکاف نے ایک عمدہ لائبریری بھی قائم کی تھی۔ یہ کوٹھی بڑی آراستہ و پیراستہ تھی۔ اپنی خوبصورتی کے لیے اتنی مشہور تھی کہ جب ۱۸۵۷ء میں بغاوت شروع ہوئی تو بادشاہ دہلی نے ایک گارد بھیج کر اس کوٹھی پر قبضہ کر لیا اور سخت احکام جاری کر دیے کہ اس کوٹھی کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے اور اس کی مکمل حفاظت کی جائے۔ بادشاہ کا خیال تھا کہ (قلعے سے فرار ہونے کی صورت میں) وہ اس کوٹھی میں آ کر رہیں گے (THE GOLDEN CALM P.148)

۵۴۔ F.D., POLITICAL SECRET, NOS. 56-57 N.A.I.

۵۵۔ F.D., POLITICAL SECRET, NOS.56-57, N.A.I,

۵۶۔ F.D., POLITICAL SECRET NOS.56-57 N.A.I.

۵۷۔ EIGHTEEN FIFTY SEVEN PP.100-111

۵۸۔ تاریخِ عروجِ انگلشیہ، ص ۱۲۷

۵۹۔ نصرت نامۂ گورنمنٹ، ص ۴۳ تا ۴۴

۶۰۔ تاریخِ عروجِ انگلشیہ، ص ۱۲۷

۶۱۔ EIGHTEEN FIFTY SEVEN P.111.

شخصیت

خط وخال

مرزا فرحت اللہ بیگ نے 'دلّی کی آخری شمع' میں بہادر شاہ ظفر کا جو حلیہ بیان کیا ہے وہ اُن کی اُس تصویر سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے جو عام طور پر دستیاب ہے اور جو ۱۸۵۷ء سے پہلے کی ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے خط وخال یا وضع قطع کے بارے میں ہمارے سامنے کوئی اور ماخذ نہیں۔ خود فرحت اللہ بیگ نے بھی اپنے ماخذ کی نشان دہی نہیں کی۔ اُنھوں نے ظفر کا حُلیہ اس طرح بیان کیا ہے:

"درمیانہ قد، بہت نحیف جسم، کسی قدر لمبا چہرہ، بڑی بڑی روشن آنکھیں آنکھوں کے نیچے کی ہڈیاں ابھری ہوئی۔ لمبی گردن، چوکا ذرا اونچا، پتلی ستواں ناک، بڑا دہانہ، گہری سانولی رنگت، سر منڈا ہوا، چھدری ڈاڑھی، کلّوں پر بہت کم، ٹھوڑی پر زیادہ۔ لبیں کتری ہوئی، ستر برس سے اونچی عمر، بال سفید بھک ہو گئے تھے لیکن پھر بھی ڈاڑھی میں اِکا دُکا سیاہ بال تھا۔ چہرے پر جھرّیاں تھیں لیکن باوجود اس پیرانہ سالی اور نقاہت کے آواز میں وہی کرارا پن تھا۔ سبز کمخواب کا ایک برکا پاجامہ اور ڈھاکے کی ململ کا کرتا زیبِ بدن تھا[1]۔"

اخلاق وعادات

مُروّت، شرافت اور دریا دلی ظفر کی نمایاں خصوصیات تھیں یہ اُن کی خاندانی

صفات بھی تھیں۔ اپنی طبیعت سے وہ بہت رحم دل تھے اور سادگی اُن کے مزاج کا جُز تھی۔ رعایا اُن کو عزّت اور احترام کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ سی۔ ایف۔ اینڈریوس نے اُن کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے:

"بہادر شاہ کا نہایت احترام کیا جاتا تھا۔ ایک شخص نے جس نے انھیں اپنی آنکھوں سے دربار کرتے دیکھا تھا، مجھ سے بیان کیا کہ ان سے ہندو مسلمان دونوں ہی ان کے اخلاقِ حسنہ کی وجہ سے بے حد محبّت کرتے تھے۔ شہنشاہ کی حیثیت سے ان کی کمزوریاں اور خامیاں بھی عوام کے لیے مزید گرویدگی کا سبب بن گئی تھیں۔ وہ بہت پُرامن تھے اور جنگجوئی بھی ان میں نام کو نہیں تھی۔ ان کی رعایا ان کی سادگی پر ہنستی تھی، وہ اچھی طرح سے جانتی تھی کہ وہ کس قدر بے بس ہیں لیکن پھر بھی وہ ان سے محبت کرتی تھی۔"۲

ظہیرؔ دہلوی کا بچپن قلعۂ معلّیٰ ہی میں گزرا تھا اور وہ وہیں چھوٹے سے بڑے ہوئے تھے۔ بہادر شاہ ظفرؔ سے انھیں بہت قربت حاصل تھی۔ بادشاہ کی تعریف کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"حضرت بادشاہ کیواں بارگاہ باوجود عظمت و شوکت و جلال و جبروتِ خداداد، علم و فضل و انکسار و کسرِ نفسی و حلم و ترحم و حسنِ خلق سے آراستہ و پیراستہ تھے۔ عجز و انکسار مزاجِ اقدس امتزاج میں اس درجہ تھا کہ خود کو ادنا بندگانِ بارگاہِ احدیت کے برابر تصور فرماتے تھے۔ کبھی کوئی کلمۂ تمکنت و سطوتِ شاہانہ زبان پر نہ لاتے تھے۔ بوئے نخوت و رعونت پاس ہو کر نہ نکلی تھی۔ ہر بندۂ خدا سے خُلقِ محمدی سے پیش آتے تھے۔"۳

مولوی ذکاءاللہ نے بہادر شاہ کی غریب پروری کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"غریب پروری کی صفت اس کی قابل یاد رکھنے کے ہے۔ لنگڑے لولے، اندھے، بہرے، اپاہج جتنے اس کے ملازم تھے، سب کی تنخواہ گھر

بیٹھے پہنچتی تھی۔ فقط اُن کی مہر قلعے میں جاتی تھی، وہی تنخواہ لے آتی تھی۔ ساری عمر میں شاید کسی نوکر کو موقوف کیا ہو۔ ہمیشہ نوکروں سے محبت کی باتیں کرنا، کبھی سخت کلامی نہ کرنا۔" ۴

اسپیر نے بھی بہادر شاہ ظفر کی شرافت اور ان کے اخلاق کی تعریف کی ہے، وہ لکھتا ہے:

"تمام ماخذوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ بادشاہ ایک مہذب اور نیک کردار انسان تھے۔ ۱۸۰۸ء میں جب ان کی عمر تینتیس سال تھی تو ان کے والد نے مرزا جہانگیر کی محبت میں ان کے ساتھ حق تلفی کرنی چاہی لیکن اس کے باوجود ان کا ردِ عمل اتنا شریفانہ تھا کہ اسٹین نے ہمیشہ ان کو قابلِ عزت الفاظ میں یاد کیا" (انگریزی سے ترجمہ) ۵

بہادر شاہ ظفر کے بارے میں جس سادگی اور معصومیت کا ذکر کیا جا چکا ہے، وہ دراصل اُن کے نیک سیرت ہونے کی دلیل ہے۔ وہ جس طرح خود ریاکاری اور فریب سے دور تھے، ویسا ہی دوسروں کو سمجھتے تھے۔ وہ ہر انسان پر بہت جلد اعتبار کر لیا کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں اُنھوں نے انگریزوں کا ساتھ چھوڑ کر انقلابیوں کی سرپرستی قبول کی لیکن اس کے باوجود حکیم احسن اللہ خاں کو وہ آخر تک اپنا ہمدرد اور ہم راز ہی سمجھتے رہے، چنانچہ بغاوت کے دوران اُنھوں نے کئی بار اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر حکیم احسن اللہ خاں کی حفاظت کی۔ اس بات کو ان کی وضعداری پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے لیکن اس میں بڑا دخل ان کے مزاج کی اُس صفت کو تھا جسے سادگی اور خوئے ترحم سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ مرزا الٰہی بخش جو انگریزوں کے خاص خبر تھے اور بادشاہ کو گرفتار کرانے کے ذمہ دار تھے، اُنھیں بھی ظفر نے آخر وقت تک شبہے کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ بلکہ بعض باتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے دل میں مرزا الٰہی بخش کی طرف سے کوئی غبار تھا ہی نہیں۔ ۶

ظفر ایک دریا دل انسان تھے۔ وہ دلی والوں پر اپنی جان چھڑکتے تھے

اور بات بات پر روپیہ لٹانے کو تیار رہتے تھے۔ احسن الاخبار کی ایک خبر ہے:

"کنور سالگ رام کے لڑکے کنور پال سنگھ کی شادی میں بادشاہ سلامت نے خلعت فرخ سیری، جامہ، کمر بند، سہرۂ مقیش روانہ فرمایا اور کنور کا لقب دیا اور حکم دیا کہ شاہی خرچ سے کنور پال سنگھ کی شادی کا جلوس تزک و احتشام کے ساتھ نکالا جائے۔ بادشاہ کے اخلاق کا یہ حال ہے کہ رعایا کے ساتھ ہر موقعے پر انعام و اکرام کا سلوک فرماتے ہیں۔" (۱۲ر مارچ ۱۸۴۷ء)

مختلف ثانوی اور بنیادی ماخذوں کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر رعایا پرور تھے۔ ایک مرتبہ شہر کے تمام گھوسیوں کو انگریزوں کی طرف سے حکم ہوا کہ وہ اپنی گائیں بھینسیں لے کر شہر سے باہر جاکر آباد ہوں۔ گھوسی اپنے بال بچوں کو لے کر جمنا کی ریتی میں آپڑے۔ بادشاہ کو جب خبر ہوئی تو انھوں نے بھی اپنا ڈیرا خیمہ ریتی میں لگوا دیا۔ بالآخر رزیڈنٹ کو اپنا حکم واپس لینا پڑا۔ بادشاہ نے رزیڈنٹ سے کہہ دیا کہ "میری موجودگی میں تم رعیت کو گھر سے بے گھر نہ کرو اور بعد میں میرے تم کو اختیار ہے کہ دلّی کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا۔"[9]

ظفر کی بہت سی خوبیوں میں ایک نمایاں خوبی اُن کی انسان دوستی ہے۔ وسیع المشرب انسان تھے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے جذبات کا یکساں خیال رکھتے تھے۔ وہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے خاص خاص تہواروں کو یکساں دلچسپی اور شان و شوکت کے ساتھ مناتے تھے۔ بادشاہ کا یہ رویّہ دہلی کی سماجی زندگی پر پوری طرح اثر انداز نظر آتا ہے۔ اینڈریوس نے ظفر کے زمانے کے ہندو مسلم تعلقات کا ذکر بڑی وضاحت سے کیا ہے:

"اُن دنوں میں یہ بات عام تھی کہ دونوں فرقوں کے لوگ ایک دوسرے کے مذہبی تہواروں میں شرکت کرتے تھے ہندو، مسلمانوں کے تہواروں میں شامل ہوتے تھے اور مسلمان، ہندوؤں کے تہواروں میں شرکت

کرتے تھے.......

مسلمان بعض ہندو جوگیوں کا بڑا احترام کرتے تھے۔ مغلیہ زمانے کی بعض تصاویر میں بادشاہ اور اس کے دربار کے بعض امرا ایسے مقدس آدمیوں کی زیارت کرتے دکھائے گئے ہیں۔ ہندو بھی اپنے طور پر ایک مشہور و معروف مسلمان بزرگ....... حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار پر....... برکات حاصل کرنے کی غرض سے حاضری دیا کرتے تھے۔"۱۰

اس سلسلے میں اینڈریوس آگے چل کر بادشاہ کے بارے میں لکھتا ہے:

"بوڑھے شہنشاہ بہادر شاہ ان امور میں اپنی زندگی کے آخری لمحے تک تکلفاتِ رسمی کے نہایت پابند رہے۔ وہ اپنے شاہی ہاتھیوں پر سوار ہو کر جن پر زربفت کی جھولیں پڑی رہتی تھیں، جلوس کی شکل میں گزرتے اور بعد میں قلعے کے مثمن برج میں بیٹھ جاتے اور ہندوؤں کے بڑے تہواروں اور مسلمانوں کی بڑی تقریبوں کے موقعے پر نیچے کے مجمعے کا تماشا دیکھا کرتے تھے۔ مجمع انھیں دیکھ کر آداب بجا لاتا اور اس طرح خیرسگالی کے جذبات بہت کچھ ترقی پاتے۔"۱۱

ظفر ہندوؤں کے جذبات کا بہت احترام کرتے تھے۔ چنانچہ بغاوت کے زمانے میں ہندو مسلم اتحاد کو تقویت دینے کی غرض سے انھوں نے گائے کا ذبیحہ بند کرا دیا تھا اور اس کی خلاف ورزی کرنے والے کے لیے سزائے موت کا حکم جاری کیا تھا۔ یہ اقدام اُن کی دوراندیشی کے ساتھ ان کی کشادہ دلی کا بھی آئینہ دار ہے۔۱۲

بہادر شاہ ظفر جن انسانی کمزوریوں کا شکار تھے، اُن میں اُن کی سب سے بڑی کمزوری روپے پیسے کی طمع تھی۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ ان کی آمدنی قلیل تھی اور اخراجات ضرورت سے زیادہ۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا بال بال قرضے سے بندھا ہوا تھا۔ وہ جس طرح بھی ممکن ہو سکتا تھا، اپنے لیے روپیہ فراہم کرانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس

صورتِ حال نے ان کے دربار میں نذر گزارنے کے سلسلے کو فروغ دیا۔ چنانچہ قلعۂ معلاّ میں ملازمتیں اور منصب صرف بڑی بڑی نذروں کے عوض بٹنے لگے۔ شہر کے متموّل لوگ قلعۂ معلاّ میں منصب حاصل کرنے کے لیے بڑھ چڑھ کر نذریں دینے کا وعدہ کرتے اور جو سب سے زیادہ نذر دیتا تھا، اُس کو منصب مل جاتا تھا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ کسی خاص منصب پر کوئی شخص سرفراز ہے، اُس کی جگہ کسی دوسرے شخص نے مزید نذر دینے کی کوشش کی۔ اس طرح پہلے شخص کو، جو کہ منصب دار ہوتا تھا، اپنے منصب اور عہدے کو برقرار رکھنے کے لیے مزید نذر دینی پڑتی تھی۔ احسن الاخبار کی خبر ہے:

"مولوی تیغ علی کمیدانی نے .... گزارش کی کہ حضورِ والا! اس سے پہلے جب عہدۂ کمیدانی کے لیے میرا تقرر ہوا تھا، تو میں نے دو ہزار روپے بطورِ نذرانہ پیش کیے تھے۔ اب میں نے سنا ہے کہ کوئی شخص اس عہدے کے لیے چار ہزار روپے نذرانہ دینے کو تیار ہے۔ ایک ہزار روپے اور نذرانہ عطا کرتا ہوں (کذا) امید ہے کہ حضور قبول فرما کر مجھے میرے عہدے پر حسبِ دستور برقرار رکھیں گے۔ بادشاہ نے ازراہِ مکرمت مولوی تیغ علی کی درخواست قبول فرمائی۔" (۲۱ر جون ۱۸۴۷ء)[۱۳]

اس سلسلے میں احسن الاخبار کی ایک اور خبر بھی ملاحظہ ہو:

"عرض کیا گیا کہ مرزا شاہ رخ کے مکانوں میں سے ایک مکان کی دیوار گر پڑی ہے: باہر سے اندر کا سارا حصّہ نظر آتا ہے۔ پرانے کلابتوں سے بھرے ہوئے دو صندوق سنہرے کام کے سیلے، اشرفیوں کا دیگچہ، روپوں کا دیگچہ باہر نکل کر گر پڑا ہے۔ حکم ہوا کہ خزانۂ عامرہ میں داخل کیا جائے۔"[۱۴]

اس وقت مرزا شاہ رخ حیات تھے اور ان کے بیوی بچے بھی موجود تھے، ایسی حالت میں ان کے مال کو خزانۂ عامرہ میں داخل کرنا شاید کچھ مناسب اقدام نہیں تھا۔

علم و ہنر

ایک زوال پذیر مغل خاندان کے آخری چشم و چراغ بہادر شاہ ظفر مختلف

علوم وفنون سے بہرہ ور تھے۔ مختلف ذرائع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اردو، ہندی، عربی اور فارسی پر دسترس رکھتے تھے، اس کے علاوہ پنجابی میں بھی شعر کہتے تھے۔ انھوں نے قرآن کی تعلیم حافظ محمد خلیل سے حاصل کی تھی جو حافظ محمد داؤد خاں مستقیم جنگ کے والد تھے۔ غالباً اسی وجہ سے حافظ داؤد خاں کو بادشاہ کا تقرب حاصل تھا، اس لیے حافظ داؤد خاں، بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی کے پہلے ہی سال داروغگی نذر و نثار اور علاقۂ خانسامانی پر مشرف ہوئے۔[۱۵] زباں دانی اور قرآن کی تعلیم کے علاوہ ظفر فنونِ لطیفہ سے بھی تعلقِ خاطر رکھتے تھے۔ وہ بہت اچھے خطاط تھے۔ سپہ گری کا فن ہو یا بٹیر بازی کا شوق ہو ان سب میں انھیں مہارت حاصل تھی۔ وہ زندگی کی ایسی تمام دلچسپیوں میں نہ صرف یہ کہ خود حصہ لیتے تھے، اُن کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔ اینڈریوس نے ایک جگہ لکھا ہے:

"بہادر شاہ ان فنونِ لطیفہ میں، جن کے لیے دلّی اُس زمانے میں مشہور تھی، اچھے خاصے ماہر تھے۔ اُن میں سے چار: موسیقی، خوش نویسی، ہاتھی دانت کی نقاشی اور شاعری بھی تھے۔ دربار ان سب فنون کا سرپرست تھا"۔ ۱۶

مولوی ذکاء اللہ نے بہادر شاہ ظفر کے اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"تعلیم اچھی ہوئی تھی۔ خوش نویس تھا۔ ظفر خوب لکھتا تھا، شعر خوب کہتا تھا۔ اس کی غزلوں کا شور سارے شہر میں دور دور رہتا تھا۔ چار مجلد دیوان اس کے یادگار ہیں...... بادشاہ علمِ تصوف میں ماہر تھا۔ ساری گلستاں کی شرح علمِ تصوف میں لکھی ہے۔ وہ خاندانِ چشتیہ میں مرید تھا اور خود بھی پیر و مرشد تھا اور اوروں کو مرید کرتا تھا۔ خاص مریدوں کو دو دو روپیہ ماہینا بھی دیتا تھا۔" ۱۷

اسپیر نے بادشاہ کی ذہانت، طباعی اور علمی اندازِ فکر کو مدِنظر رکھتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

بادشاہ کو اپنا دربار (ایک حکمراں کے بجائے) فلسفی شہزادے کی طرح سجانا چاہیے تھا۔ اگر وہ کسی شہنشاہ کے تحت جرمنی کی کسی چھوٹی سی ریاست کا حاکم ہوتا یا کوئی پارلیمانی بادشاہ ہوتا تو اسے اپنی علمیت کے اظہار کا زیادہ موقع ملتا۔ اس کے زمانے میں دہلی، ہندوستان کا ویمر تھی اور غالب یہاں کا گوئٹے"[۱۸] (انگریزی سے ترجمہ)

خطاطی[۱۹]

بہادر شاہ ظفر فنِ خطاطی میں راقم الدولہ ظہیر دہلوی کے دادا میر امام علی کے شاگرد تھے۔ بادشاہ کو فنِ خوش نویسی میں ایسی مہارت حاصل تھی کہ دہلی کے بہت سے خوش نویس ان کے شاگرد تھے۔[۲۰]

ناصر نذیر فراق نے بادشاہ کی خوش نویسی کا ذکر کرتے ہوئے انھیں کسی میر کلو کا شاگرد بتایا ہے[۲۱] لیکن ساتھ ہی اس میں اشتباہ بھی ظاہر کیا ہے۔ ظہیر دہلوی اُسی زمانے کے آدمی ہیں، اس لیے اِس سلسلے میں اُن کا بیان مُستند سمجھنا چاہیے۔ راشد الخیری نے فنِ خوش نویسی میں ظفر کو میر پنجہ کش کا ہم عصر بتایا ہے اور لکھا ہے کہ میر صاحب بادشاہ کی خوش نویسی کے مدّاح تھے۔[۲۲] لال قلعے میں دیگر کارخانہ جات کی طرح خوش نویسی بھی ایک باقاعدہ شعبے کا درجہ رکھتی تھی۔ بادشاہوں کو چھاپے کے مقابلے میں قلمی کتابیں زیادہ پسند آتی تھیں اس لیے کہ قلمی کتابیں فنِ خوش نویسی کا ایک نادر نمونہ ہوا کرتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے جدِّ امجد یعنی اکبر کے دربار میں بھی ایک مرتبہ چھاپے کی کتاب کا ایک نمونہ پیش کیا گیا تھا اور ساتھ ہی پریس کی خوبیوں پر روشنی ڈالی گئی تھی لیکن اکبر نے اس کے مقابلے میں قلمی کتابوں کو ترجیح دی اور اور چھاپے خانے کی تجویز کو مسترد کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں پریس کا رواج بہت بعد کو شروع ہوا۔ بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں چھاپے خانوں کو خاص مقبولیت حاصل ہو چکی تھی تاہم لال قلعے میں خوش نویسی کا ایک دفتر کھلا ہوا تھا۔[۲۳]

فنونِ سپہ گری

بہادر شاہ ظفر کو سپہ گری کے مختلف فنون میں بھی کمال حاصل تھا جن میں بندوق بازی، تیر اندازی، شمشیر زنی اور شہسواری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ظفر کی بندوق بازی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اُن کا بندوق کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا تھا اور نشانے بازی کا کمال یہ تھا کہ قائم اور متحرّک دونوں چیزوں پر اسی مشاقی کے ساتھ نشانہ لگاتے تھے۔

ظہیر دہلوی لکھتے ہیں:

"بندوق ایسی لگاتے تھے کہ بایدوشاید، بال باندھا نشانہ اُڑاتے، کبھی نشانہ خطا ہی نہ کرتا۔ بارہا ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ جانور اُڑتا ہوا جاتا ہے، ہوادار پر بندوق دھری ہے، اُٹھائی اور جھونک دی۔ چھتیانے کی حاجت نہیں۔ لوٹ پوٹ ہوا اور ہوادار میں آرہا۔ دریا میں مچھلی یا مگرمچھ نے منہ نکالا اور گولی منخرین پر پڑی اور چیت ہو گیا۔"[۲۴]

عرشؔ تیموری نے بھی بہادر شاہ ظفر کی بندوق بازی کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے[۲۵]

ظہیر دہلوی نے فنِ تیر اندازی میں بہادر شاہ ظفر کو آپاسنگھ کا شاگرد بتایا ہے۔ ظہیر دہلوی اپنے والد کے حوالے سے بادشاہ کی تیر اندازی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بادشاہ زمانۂ ولی عہدی میں جوان تھے...... ایک دن سواری مبارک سلیم گڑھ سے قلعے کو آتی تھی، راستے میں مرزا فتح الملک بہادر ولی عہدِ ثانی کا باغ تھا، وہاں سے کچھ شوروغل کی آواز آتی تھی۔ فرمایا غل کیسا ہے۔ عرض ہوئی مرشدزادے تیر لگا رہے ہیں۔ حکم ہوا سواری اُدھر لے چلو ...... فرمایا تیر کمان ادھر لاؤ۔ کمان کی کشتی پیش کی گئی، ان میں سے ایک کمان اٹھا لی اور تین تیر کھینچ لیے اور ایستادے بر باقاعدہ کھڑے ہو کر ایک تیر لگایا۔ تیر تودے میں پیوست ہوا، ایک بالشت باہر رہا۔ سب نے تحسین آفرین کی۔ دوسرا تیر لگایا، وہ اس سے زیادہ تودے میں داخل ہوا۔ تیسرا، وہ بالکل سب مغروق تھا، فقط لبِ سوفار باہر رہے اور تمام تیر غرق تھا۔ نعرۂ تحسین وآفرین بلند ہو

گیا. یہ میری چشم دید بات ہے۔" ۲۶

عرشؔ تیموری نے بادشاہ کی تیر اندازی کی تعریف کرتے ہوئے انھیں تیر انداز خاں کا شاگرد بتایا ہے۔[۲۷] احسن الاخبار میں، جب کہ ظفرؔ کی عمر ستر برس سے زیادہ تھی، ظفرؔ کی تیر اندازی کے بارے میں ایک واقعہ اس طرح درج ہے:

"مرزا شاہ رخ بہادر نے عرض کیا کہ یہاں ایک مقام پہ ایک ایسا موذی سانپ سنا گیا ہے جس سے لوگوں کو سخت تکلیف اور نقصانِ جان کا اندیشہ ہے. حضور نے یہ بات سنتے ہی فرمایا چلو مجھے بتاؤ وہ سانپ کہاں ہے. شہزادے نے سانپ کے بل کے پاس لے جا کر اشارہ کیا کہ یہاں ہے حضور نے سانپ کو دیکھ کر ایک تیر مارا کہ اس کو دم لینے کی مہلت نہ ملی اور فوراً مر گیا." (۱۰ر جولائی ۱۸۴۶ء) ۲۸

بہادر شاہ ظفرؔ شمشیر زنی اور شہسواری میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے تھے. ظہیرؔ دہلوی نے اِن دونوں فنون میں بادشاہ کی مہارت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"پھکیتی کے فن میں بادشاہ، میر حامد علی صاحب کے شاگرد تھے.... میں نے اپنے والد کی زبانی سنا ہے کہ بادشاہ تنِ تنہا آٹھ آدمیوں کے مقابل یک دم کسرت کرتے تھے اور آٹھ آٹھ آدمی برابر ان پر چوٹ آتے تھے اور بادشاہ سب کے وار روکتے تھے اور اپنی چوٹ چھوڑتے جاتے تھے، اس قدر مشق بہم پہنچائی تھی.....

مشہورِ روزگار ہے کہ ہندوستان میں ڈھائی سوار تھے. ایک بہادر شاہ دوسرے آپ کے بھائی مرزا جہاں گیر...... اور نصف سوار کوئی مرہٹہ کا مشہور تھا. اب سِن مبارک اسّی برس سے تجاوز کر گیا تھا لیکن اب بھی جس دن گھوڑے پر سوار ہو جاتے اپنی شہسواری دکھا دیتے تھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ گھوڑے پر ایک ستون قائم کر دیا ہے۔" ۲۹

گھڑ سواری کے علاوہ بہادر شاہ ظفرؔ ہاتھی کی سواری بھی کرتے تھے. کہا جاتا ہے کہ لال قلعے

میں بادشاہ کی سواری کے لیے جو ہاتھی تھا اس کا نام مولا بخش تھا اور جس گھوڑے پر بادشاہ سواری کرتے تھے اس کا نام ہمدم تھا۔ بادشاہ کو گھوڑوں کی نسل اور ان کی خصوصیات کو پہچاننے میں بھی بہت ملکہ حاصل تھا۔

تفریحات

مرغ بازی اور بٹیر بازی بہادر شاہ ظفر کے دو دلچسپ مشغلے تھے۔ بادشاہ کے علاوہ اکثر امرا اور رؤسا بھی اس شغل میں برابر کی دل چسپی لیتے تھے۔ اینڈریوس نے قلعۂ معلاً کی تفریحات کا ذکر کرتے ہوئے مرغ بازی کا تذکرہ بھی کیا ہے:

"قلعے کے اندر امرا کی محبوب ترین تفریح مرغ بازی تھی۔ ایک ایک بازی پر بڑی بڑی رقوم کی ہار جیت ہو جاتی تھی۔ ایسی انحطاط پذیر تفریح مائل بہ تنزل دور کی نمائندہ تھی۔" ۳۰

احسن الاخبار میں بادشاہ کے اس شوق کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔ ۳۰ ستمبر ۱۸۴۶ کی ایک خبر ہے:

"بادشاہ سلامت بٹیر بازی کے تماشے میں تشریف لے گئے۔ خوب سیر و تفریح فرمائی۔ جو اراکینِ سلطنت آپ کے ساتھ تھے، وہ بھی بہت محظوظ ہوئے۔" ۳۱

احسن الاخبار کی ۱۵ اکتوبر ۱۸۴۷ء کی روداد میں لکھا ہے:

"آج حضرت جہاں پناہ خلد اللہ ملکہ نے بٹیروں کی لڑائی کا تماشا دیکھا اور بہت خوش ہوئے۔" ۳۲

بٹیر بازی کے علاوہ بادشاہ کو کبوتر بازی کا بھی شوق تھا اور وہ کبوتر بازی کا تماشا بھی بڑے شوق سے دیکھتے تھے۔ احسن الاخبار کی خبر ہے:

"شام کے وقت کبوتر بازی کا تماشا ملاحظہ فرمانے کے لیے تشریف لے گئے اور بلند نظری کی داد دی۔" (۱۹ مارچ ۱۸۴۷ء) ۳۳

ظفر اس فن میں خود بھی اس قدر مہارت رکھتے تھے کہ بٹیر بازی کے بہت سے شوقین بادشاہ کی شاگردی قبول کرنے آتے تھے اس فن میں انھوں نے بہت سوں کو شاگرد بنایا

تھا۔ احسن الاخبار میں لکھا ہے:

"محمد اصغر علی خاں، مرزا شاہ رخ کے توسط سے حضور انور کی خدمت میں شرف اندوزِ مجرا ہوئے اور درخواست کی کہ ہمیں بٹیر بازی کا فن سکھا دیا جائے۔ شاگردی کی شیرینی پیش کی اور حضور انور نے انھیں اس فن کی بعض خاص خاص باتوں سے آگہ فرمایا پھر دونوں کو خلعت و دوشالے سے معزز و ممتاز فرمایا اور بٹیروں کا ایک پنجرہ بھی عطا کیا۔" (۲۸ر اگست ۱۸۴۶ء) ۳۴

بادشاہ کو بٹیروں کا شوربا بھی بہت مرغوب تھا۔[۳۵] مرغ بازی ہی کی قبیل کا ایک کھیل انڈے لڑانے کا بھی تھا۔ یہ کھیل نوروز کے دن کھیلا جاتا تھا۔[۳۶]

پیری مریدی

بہادر شاہ ظفر کو مشائخِ چشت سے بے پناہ عقیدت تھی۔ وہ قطب صاحب کے مزار پر اکثر حاضری دیتے تھے۔ مہرولی کا علاقہ جہاں قطب صاحب کی درگاہ ہے، آب ہوا کے اعتبار سے انھیں بہت پسند تھا۔ وہ کبھی کبھی وہاں جا کر کچھ دن قیام بھی کرتے تھے حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ کے لیے قطب صاحب کی درگاہ سے چھڑیوں کا جو جلوس جاتا تھا، ظفر اس میں بھی خاص دل چسپی لیتے تھے اور زرِ نقد سے امداد کرتے تھے۔ مولوی ذکار اللہ نے بہادر شاہ ظفر کے بارے میں لکھا ہے:

"وہ خاندانِ چشتیہ میں مرید تھا اور خود بھی پیر و مرشد تھا اور اوروں کو مرید کرتا تھا۔ خاص مریدوں کو دو دو روپے مہینا بھی دیتا تھا۔"[۳۷]

بہادر شاہ ظفر، حضرت غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب نبیرۂ مولانا فخر الدین کے مرید تھے۔ ظہیر دہلوی کا بیان ہے کہ ظفر کو حضرت کالے صاحب سے بے پناہ عقیدت تھی۔[۳۸] وہ ان سے انتہائی عقیدت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ بادشاہ کی طرف سے کالے صاحب کے لیے چار ہزار روپے سالانہ مقرر تھے۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً بادشاہ ان کے ساتھ سلوک کرتے رہتے تھے۔ احسن الاخبار کی ایک خبر ہے کہ:



بہادر شاہ ظفر اپنے مریدوں کے ساتھ

"موضع شمع پور بادلی کی آمدنی میں سے پانچ سو روپے حضرت شاہ نصیرالدین عرف کالے صاحب کو مرحمت فرمائے اور ارشاد کیا کہ اس آمدنی میں سے ہمیشہ پانچ سو روپے انشاء اللہ قبل از وقت حاضر ہوتا رہے گا۔"

(۳۰ ستمبر ۱۸۴۶ء) ۳۹

ناصر نذیر فراق نے قلعۂ معلّا کی ایک خادمہ کی زبانی حضرت کالے صاحب سے بادشاہ کی عقیدت کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ ۴۰

کالے صاحب کے علاوہ بادشاہ کو پیرزادہ حسن عسکری سے بھی بے پناہ عقیدت تھی، جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ اس مقالے کے پہلے باب میں ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے۔ بہادر شاہ صوفی منش تھے، جس طرح وہ خود بزرگانِ دین سے عقیدت رکھتے تھے اُسی طرح ان کی رعیت بھی اُنھیں اپنا پیر و مرشد سمجھتی تھی۔ چنانچہ بہت سے لوگ بادشاہ کے مرید بننے آتے تھے۔ بادشاہ بھی ان کے سر پہ دستِ شفقت رکھتے اور ان کو مرید کر لیا کرتے تھے۔ احسن الاخبار کی ایک خبر ہے:

"رحیم الدین اور عبداللہ دو شخص دربارِ شاہی میں حاضر ہوئے حضورِ انور سے قدم بوسی کا شرف حاصل کیا۔ ہر ایک نے ایک ایک روپے نذر اور دو دو ٹوکریاں مٹھائی کی پیش کیں اور مرید ہونے کی التجا ظاہر کی۔ حضور نے مرید کر لیا اور اس کے سلوک و عرفان اور عشق و محبت کی باتیں بیان فرمائیں پھر ہر ایک کو ایک ایک رومال اور ایک ایک تسبیح دے کر رخصت کیا۔"

(۲۸ اگست ۱۸۴۶ء) ۴۱

احسن الاخبار کی ایک اور خبر:

"حضور بادشاہ سلامت استراحت فرما رہے تھے کہ چوبدار نے آ کر عرض کیا کہ ایک مسافر اماکنِ مقدسہ کا مرید ہونے حاضر ہوا ہے۔ حکم ہوا کہ اندر بلا لو۔"

(۱۸ ستمبر ۱۸۴۶ء) ۴۲

عام لوگوں نے اس پیری مریدی کے سلسلے کو بادشاہ تک پہنچنے کا ایک وسیلہ بنا لیا تھا۔ ۴۳

بہادر شاہ ظفر پیری مریدی کے علاوہ تعویذ گنڈوں اور ٹونے ٹوٹکوں کے بھی قائل تھے۔ اکثر فقیر فقرا اور مجاور قسم کے لوگ بادشاہ کو آکر طرح طرح کی کہانیاں سناتے اور اپنا مطلب نکالتے تھے احسن الاخبار کی ایک خبر ہے :

" حضور بادشاہ سلامت حضور قطب صاحب قدس سرہٗ کے مزار پُر انوار پر حاضر تھے کہ حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ شریف کے خدام حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا کہ ہمیں درگاہ شریف میں رات کو بشارت ہوئی ہے کہ عنقریب حضورِ انور کو کوئی بڑی مسرّت حاصل ہونے والی ہے۔ حضور نے ان کو سو روپے بطور نذر مرحمت فرمائے۔" (۲۹ مئی ۱۸۴۶ء) ۴۴

احسن الاخبار کی ایک اور خبر اس طرح ہے :

" ایک پیر زادے نے بواسیر کے لیے ایک مجرّب تعویذ جہاں پناہ کی خدمت میں پیش کیا۔ جہاں پناہ نے اسے پچاس روپے انعام کے مرحمت فرمائے۔" (۲۶ جون ۱۸۴۶ء) ۴۵

جیون لال نے ایامِ غدر کا ایک واقعہ اپنے روزنامچے میں اس طرح درج کیا ہے :

" ایک مولوی بادشاہ کے پاس آیا اور کہا کہ اگر آپ مجھے بکرے کی اوجھڑی پر قرآن شریف کی چند آیات پڑھنے کی اجازت دیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ انگریزی توپیں بے کار ہو جائیں گی۔" ۴۶

اپنی انہی تمام باتوں کی وجہ سے بہادر شاہ ظفر علمار کی نظر میں بدعتی سمجھے جاتے تھے، یہاں تک کہ یہ بھی کہا گیا کہ بہت سے مولوی ان مسجدوں میں نماز پڑھنے نہیں جاتے تھے جو بادشاہ کی تحویل میں تھیں۔ چنانچہ سر سیّد احمد خاں نے ایک جگہ لکھا ہے :

" دلّی میں ایک بہت بڑا گروہ مولویوں کا اور اُن کے تابعین کا ایسا تھا کہ وہ مذہب کی رو سے معزول بادشاہِ دہلی کو بہت بُرا اور بدعتی سمجھتے تھے۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ دِلّی کی جن مسجدوں میں بادشاہ کا قبضہ

و دخل اور اہتمام ہے، اُن مسجدوں میں نماز درست نہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جامع مسجد میں بھی نماز نہیں پڑھتے تھے اور عذر سے بہت قبل کے چھپے ہوئے فتوے اس معاملے میں موجود ہیں۔" ۴۷

افسوس یہ ہے کہ ایسے فتوے آج ہمارے سامنے نہیں، اس لیے صحیح صورتِ حال کے متعلق تفصیل یا قطعیت کے ساتھ ہمارے لیے کچھ کہنا مشکل ہے، تاہم اگر ایسا ہوا ہو تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہوگی، اس بنا پر کہ خانوادۂ ولی اللّٰہی کے اثرات دہلی میں ہمہ گیر تھے اور دوسرے خانوادے بھی موجود تھے اور طبقۂ علما میں ایسی بحثیں ہوتی رہتی تھیں۔

وسیع المشربی

بہادر شاہ ظفر وسیع المشرب انسان تھے۔ اُن کے دل میں لوگوں کے لیے دوستی اور ہمدردی کا جذبہ تھا اور یہ دوستی اور ہمدردی بلا تفریقِ مذہب و ملت تھی۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک نظر سے دیکھتے تھے۔ محض اس لیے نہیں کہ وہ ایک ہندو عورت کے بطن سے پیدا ہوئے تھے، بلکہ اس لیے کہ وہ ایک وسیع القلب اور وسیع المشرب انسان تھے۔ ان کے دربار میں ہندو بھی بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ کنور سالگ رام ان کے دربار میں بخشی گری کے عہدے پر فائز تھے ۴۸ اٹھارہ سو ستاون کے پُر آشوب دور میں ٹکسال کا کام منشی اجودھیا پرشاد کے سپرد کیا گیا ۴۹ احسن الاخبار میں جگہ جگہ یہ ذکر بھی ملتا ہے کہ بادشاہ ہندو امرا کے عزیز و اقارب کی اموات پر تعزیت کے علاوہ کچھ مالی امداد بھی کرتے تھے۔ اینڈریوس نے ظفر کی اس وسیع المشربی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"شہر دہلی میں دو فرقے ہندو اور مسلمان مغل شہنشاہوں کی دانش مندانہ رہ نمائی میں جنھوں نے ہندوؤں پر اعتماد کرنا سیکھ لیا تھا اور اس کے جواب میں ہندو بھی ان پر اعتماد کرتے تھے، نہایت پُرامن طریقے سے پہلو بہ پہلو رہتے بستے تھے۔ دہلی کے قدیم باشندوں میں سے جو لوگ ہندو تھے جب میں ان کے پاس اطلاع حاصل کرنے کی

غرض سے گیا انھوں نے خود بغیر کسی پس وپیش کے مجھ سے یہ بات بیان کی کہ آخری مغل بادشاہوں کا برتاو ان کے فرقے کے ساتھ بہت اچھا تھا اور اس سلسلے میں انھیں کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی ...... (مغل شہنشاہ) اپنے اندرونی تعصّب پر غالب آگئے تھے اور اس بناپر اس قابل ہو گئے تھے کہ اپنی ہندو رعایا کے ساتھ مہربانی کا سلوک کریں اور غیر جانبدارانہ انصاف کریں نیز انھوں نے شاہی دربار کے مسلمان امرا پر بھی اچھی طرح ذہن نشین کر دیا تھا کہ وہ ہندوؤں کے احساسات اور جذبات کا انھی کی طرح خیال رکھیں" ۵۰

بہادر شاہ ظفر کے اس مسلک کا عوام کے ذہنوں پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ چنانچہ ان کے زمانے میں دہلی میں ہندو مسلم نفاق جیسی کوئی چیز بظاہر نظر نہیں آتی۔ ظفر نے شہر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو عوامی سطح پر یکجا کرنے کی کوشش کی اور انھیں اپنی اس کوشش میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ ان کوششوں میں ان کا وہ اقدام بھی شامل ہے جس کی رو سے انھوں نے شہر میں گائے کا ذبیحہ بند کرا دیا تھا۔ اینڈریوس اس ہندو مسلم اتحاد پر اس طرح روشنی ڈالتا ہے:

"ہندوؤں کے تہواروں کے موقعے پر ہندو گھرانے کے بچّے مساجد کے مکتبوں کے اساتذہ کے لیے کھانے پینے کی چیزیں لایا کرتے تھے۔ وہ اپنے استادوں کو اپنے گھر میں دعوت دے کر بلاتے تھے تاکہ وہ بھی ان مسرتوں میں شریک ہوں...... اسی طرح مسلمان بھی ہندوؤں کے مذہبی تہواروں کا ذکر بڑے احترام سے کرتے تھے اور اس بات کا خاص لحاظ رکھتے تھے کہ وہ ہندو رسوم کے خلاف کوئی ایسی بات نہ کہیں جس سے ان کی دل آزاری ہو۔ معاشرتی تقریبات کے مواقع پر مثلاً شادی بیاہ میں وہ لازمی طور پر اپنے ہندو دوستوں کو تحفے بھیجتے تھے اور ان سے درخواست کرتے تھے کہ شادیوں میں شرکت کرکے انھیں عزت

بخشیں"۔ ۵۱

میلے اور تہوار

بہادر شاہ ظفر کی مالی پریشانیوں کا ایک بڑا سبب وہ تمام میلے اور تہوار بھی تھے جنھیں وہ بڑی دھوم دھام سے مناتے تھے۔ قلعۂ معلّا میں ان میلوں اور تہواروں کی وجہ سے دن عید اور رات شبِ برات تھی۔ ہندوؤں کے تہوار ہوں یا مسلمانوں کے، لال قلعے کی رونق اِن تہواروں پر ایک ہی جیسی ہوتی تھی۔ اُن تہواروں کا ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے جو لال قلعے میں خصوصیت کے ساتھ منائے جاتے تھے۔

عید الفطر

اگر عید کا چاند انتیس کا ہوتا تو اس عید کو جوان عید کہا جاتا تھا۔ چاند دکھائی دینے کی پچیس توپیں داغی جاتی تھیں، اس کے بعد شادیانے بجتے، اس طرح عید کا اعلان ہوتا تھا۔ راتوں رات توپیں ڈیرے، خیمے فرش فروش وغیرہ عیدگاہ پہنچ جاتے۔ صبح بادشاہ غسل کرتے، پوشاک بدل کر دودھ سویاں نوش کرتے، ہوادار کی مدد سے ہاتھی پر سوار ہوتے پھر اکیس توپوں کی سلامی کے بعد جلوس عیدگاہ روانہ ہوتا۔ عیدگاہ کے احاطے میں بادشاہ اور ولی عہد تو نالکی میں بیٹھ جاتے باقی لوگ پیدل ہی چلتے۔ نماز سے فارغ ہو کر بادشاہ قلعے میں واپس آتے، دیوانِ خاص میں دربار ہوتا۔ نذریں لیتے، پھولوں کے طرّے اور ہار تقسیم کرتے، اس کے بعد خاصہ کھاتے اور آرام فرماتے۔ ۵۲

عید الاضحےٰ

اِس عید کے معمولات بھی عید الفطر ہی کی طرح ہوتے تھے، البتہ ان میں ایک قربانی کی رسم زیادہ ہوتی۔ یہ قربانی عیدگاہ کے میدان ہی میں ہوتی تھی۔ منشی فیض الدین اس کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں:

> "ایک اونٹ، بانات کی جھول پڑی ہوئی، سینے پر چونے کا نشان کیا ہوا، رسّوں میں جکڑا ہوا، فرّاش پکڑے کھڑے تھے۔ دیکھو اب اونٹ کی قربانی ہوتی ہے۔ بادشاہ اونٹ کے پاس آئے، فرّاش نے ایک بڑی

سی چادر بادشاہ اور اونٹ کے بیچ میں تان لی۔ قورخانے کے داروغہ نے بادشاہ کے ہاتھ میں برچھی دی' قاضی نے اونٹ کی قربانی کی دعا پڑھوائی بادشاہ نے دعا پڑھ کر چونے کے نشان پر اونٹ کے تاک کے برچھی ماری قاضی نے اسے ذبح کیا۔ بادشاہ سوار ہو کر خیمے کی سہ دری کے پاس آئے اے لو یہاں ایک دنبا مہندی میں رنگا کھڑا ہے۔ بادشاہ نے اس کی قربانی کی خیمے میں آئے مسند پر بیٹھے' بائیں طرف ولی عہد دائیں طرف شہزادے بیٹھ گئے' امیر امرا سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ خاصے والوں نے جھٹ پٹ دسترخوان بچھا' اونٹ اور دنبے کی کلیجی کے کباب اور شیرمالیں اس پر لگا دیں۔ بادشاہ نے پہلے ایک ٹکڑا شیرمال اور ایک کباب آپ منہ میں ڈالا' پھر ولی عہد' شہزادوں اور معزز امیروں کو جو حاضر تھے' کباب اور شیرمالیں اپنے ہاتھ سے دیں' سب نے مجرا کر کے لیں۔ دربار رخصت ہوا' خیمے میں زنانہ ہو گیا' بیگمات آئیں' بادشاہ نے خاصہ کھایا۔ تھوڑی دیر ٹھہر کے سوار ہوئے۔ دیوانِ خاص اور محل میں آئے' وہی عید کی طرح دربار کیا' نذریں لیں۔ قربانی کے بکرے حیثیت کے موافق سب کے ہاں بھیجے گئے۔" ۵۳

دسہرا

دسہرے کے دن بہادر شاہ ظفر صبح دربار کرتے۔ پہلے ایک نیل کنٹھ بادشاہ کے سامنے اڑایا جاتا' اس کے بعد باز خانے کا داروغہ باز اور شکرا لے کر آتا۔ بادشاہ باز اور شکرے کو لے کر ہاتھ پر بٹھاتے۔ باز' شکرے کا جانی دشمن ہوتا ہے' اس لیے باز اور شکرے کو ایک ساتھ اپنے ہاتھوں پر بٹھانے سے غالباً بادشاہ کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ ان کے دربار میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں۔ تیسرے پہر کے قریب ہندو امرا نذریں پیش کرتے اور بادشاہ جھروکے میں آ بیٹھتے۔ نو دن تک رام لیلا کے جلوس نکلتے۔ دسویں دن بھرت ملاپ ہوتا اور اس طرح دسہرے کا تہوار خیر سگالی کے جذبات کے ساتھ ختم ہو جاتا۔ ۵۴

دِوالی

دِوالی پر جا بجا نوبت نقارے بجتے، کھیل، تماشوں، کھانڈ اور مٹی کے کھلونوں کی دُکانیں لگتیں، حلوائیوں کی دُکانیں رنگ برنگ کی مٹھائیوں سے سج جاتیں۔ پہلے دیے سے تیسرے دیے تک ایسی روشنی ہوتی کہ رات کو دن کا سماں ہو جاتا۔ دِوالی کے تین دن تک محل میں سب کی آمد و رفت بند ہو جاتی تھی۔ ثابت تر کاریاں مثلاً بینگن، مولی، کدو، گاجر وغیرہ کے محل میں آنے کی ممانعت ہوتی تھی تاکہ کوئی جادو ٹونا نہ کر سکے۔ تیسرے دیے کو بادشاہ سونے چاندی میں تلتے اور بادشاہ کے وزن کے برابر کا یہ سونا چاندی محتاجوں کو بانٹا جاتا۔ بھینسا، کالا کمبل، کڑوا تیل، سونا چاندی، زرِ نقد وغیرہ بادشاہ پر سے صدقے کیے جاتے۔ قلعے کی روشنی کا حکم ہوتا۔ ہندو امرا مٹھائی کے کھلونے اور مٹھائی بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتے اور بادشاہ اس روز عام تعطیل کا حکم صادر کر دیتے۔ ۵۵

ہولی

لال قلعے میں ہولی کا تہوار جس طرح منایا جاتا تھا، اُس کا ذکر ایک دلّی والے نے اس طرح کیا ہے:

> "رہی ہولی تو یہ بھانت بھانت کے سانگ سے دل لگی کی چیز بن جاتی۔ بازاروں، گلیوں، گھروں میں رنگ کھیلے جا رہے ہیں۔ دف جھانجھ، نفیری بج رہی ہے۔ جا بجا طائفے ناچ رہے ہیں۔ شہر کے سارے رنگ ایک ایک کر کے قلعے پہنچے۔ حضور عالم پناہ ہندو مسلمان ایک طرف بادشاہ زادیاں اور امیر زادیاں دوسری طرف جھروکوں میں بیٹھی ہیں۔ رنگ سانگ آ رہے ہیں انعام لے کر جا رہے ہیں۔" ۵۶

نوروز

نوروز اصل میں ایرانی تہوار ہے۔ نوروز کے دن شہر میں بادشاہ سے لے کر فقیر تک سب نوروز مناتے تھے۔ لال قلعے میں دیوانِ عام، دیوانِ خاص چھوٹا بڑا رنگ محل

خاص محل، ہوا محل، موتی محل، باغِ حیات بخش، مہتاب باغ، ساون بھادوں غرض ہر عمارت کو خوب سجایا جاتا تھا۔ نجومی پنڈت جو رنگ سال کا بتاتے، وہی نوروزی رنگ کہلاتا۔ بادشاہ، بیگمات، شہزادے، شہزادیاں سب اسی رنگ کی پوشاکیں پہنتے۔ بادشاہ حضرت علی کے دستر خوان پر نیاز دیتے۔ پہلے ذرا سا خود چکھتے اس کے بعد ولی عہد شہزادوں اور معزز امیروں کو اپنے ہاتھ سے تبرک دیتے۔ نوروز ہی کے دن سلاطین دیوانِ خاص میں بادشاہ سلامت کے سامنے سبزوار مرغی کے انڈے لڑاتے۔ طرح طرح کے کھیل ہوتے۔ بادشاہ سلامت نوروزی لباس زیب تن کر کے قطب صاحب بھی جاتے۔ محل سرا میں چاندی کی کرسی پر بیٹھ کر دربار کرتے اور ارا کینِ سلطنت سے نذرانے قبول کرتے۔ ۵۷

جشن

بادشاہ کی تاج پوشی کی سال گرہ کو جشن کہا جاتا تھا۔ جشن کا تہوار لال قلعے میں چالیس دن تک بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ وزیرؔ دہلوی نے جشن کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے:

" جشن ...... بادشاہ سلامت کی تختِ نشینی کی سال گرہ ہوتی۔ پورا ایک چلّہ رنگ رلیوں میں گزرتا، دس روز پہلے تورے بندی شروع ہو جاتی۔ امیر امرا میں جیسی جس کی عزت، اتنے خوان کا تورا سرفراز ہوتا۔ چار دن باقی رہے مہمان داری ہونے لگتی۔ شہزادیوں، امیرزادیوں سے محلات بھر جاتے۔ نت نئے شگون ہوتے، طرح طرح کی تیاریاں کی جاتیں۔ شادیانے بج رہے ہیں، خلعت و انعام دیے جا رہے ہیں، نذر و نذور، مہمان داری، ناچ رنگ کی بہار ایک چھوڑ چالیس دن تک۔" ۵۸

جشن کی نمایاں خصوصیات میں تورے بندی، مہمان داری، رت جگا، صحنک، جشن کا دربار اور محل کا دربار جیسی دلچسپیاں شامل تھیں۔ ۵۹

محرم

محرم کا چاند نظر آتے ہی قلعے میں ماتم کے باجے بجنے لگتے تھے اور شہر میں جگہ جگہ

سبیلیں لگائی جاتی تھیں۔ بادشاہ خود امام حسینؑ کے فقیر بنتے سبز کپڑے پہنتے اور درگاہ میں جاکر سلام کرتے۔ دس روز تک فقیروں کو کھانا اور شربت بٹتا تھا۔ ساتویں تاریخ کو رنگ برنگ کی قندیلیں روشن کی جاتیں اور منہدی کی تیاری ہوتی۔ رات کو منہدی امام باڑے پہنچا دی جاتی۔ محرم کی آٹھویں تاریخ کو بادشاہ حضرت عباسؑ کے سقّے بنتے۔ لال کھاروے کی ایک لنگی باندھ کر شربت کی ایک مشک کندھے پر رکھتے اور معصوموں کو اپنے ہاتھ سے شربت پلاتے۔ اس کے بعد ملیدے پر نیاز دی جاتی۔ عشرے کے دن یعنی محرم کی دس تاریخ کو موتی مسجد میں بادشاہ عاشورے کی نماز پڑھتے۔ اس کے بعد دیوانِ خاص میں دسترخوان کی تیاری ہوتی۔ دسترخوان پر شیرمالیں چنی جاتیں شیرمالوں پر کباب، پنیر، پودینہ، ادرک اور مولیاں کتر کر رکھی جاتیں۔ بادشاہ کھڑے ہوکر ان پر نیاز دیتے۔ نیاز کے بعد ذرا سا شیرمال کا ٹکڑا کباب کے ساتھ آپ چکھتے اس کے بعد ایک شیرمال اور کباب ولی عہد کو اور اس کے بعد شہزادوں اور امیرزادوں کو اپنے ہاتھ سے تقسیم کرتے۔ اکثر سلاطینِ قلعہ تعزیہ داری بھی کرتے تھے۔ تعزیوں کے آگے ڈھول تاشے بجتے، مرثیے پڑھے جاتے۔ مرثیہ خوانوں کو انعام واکرام دیا جاتا۔ اس طرح عزاداری کے دن تکمیل کو پہنچتے۔ ۶۰

آخری بدھ

صفر کے مہینے میں، جسے دلی میں تیرہ تیزی بھی کہا جاتا ہے، آخری بدھ کا تہوار منایا جاتا تھا۔ اس مہینے کی تیرہویں تاریخ کو چنوں کی نون مرچ لگی ہوئی سلونی گھنگھنیاں اور گیہوں کی میٹھی گھنگھنیاں نیاز دے کر تقسیم کی جاتی تھیں۔ اس مہینے کے آخری بدھ کو بادشاہ صبح کو دربار کرتے، جواہر خانے کا داروغہ سونے چاندی کے چھلّے کشتی میں لگا کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتا، اس میں سے دو سونے اور چاندی کے چھلّے بادشاہ پہلے خود پہنتے، دو ولی عہد کو دیتے اور ایک ایک اور شہزادوں اور امرا کو اپنے ہاتھ سے تقسیم کرتے۔ تیسرے پہر بادشاہ پر سے ایک اشرفی مٹی کی کوری ٹھلیا میں ڈال کر صدقے کی جاتی، یہ اشرفی حلال خوری کا حصہ ہوتی۔ شام کے وقت بادشاہ سبزہ

روندتے۔ شہزادوں کے استاد سنہرے، رُپہلے، اور پھول دار کاغذوں پر شاہزادوں کی عیدیاں لکھ کر لاتے اور عیدیوں کے روپے لے کر رخصت ہوتے تھے۔[61]

سلونو

سلونو کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ جب بہادر شاہ کے جدِّ امجد عالم گیر ثانی کو ان کے وزیر غازی الدین خاں نے سازش سے کوٹلا فیروز شاہ میں لے جا کر قتل کرا دیا تو ان کی لاش وہاں دیر تک بے یار و مددگار پڑی رہی۔ اتفاقاً ایک ہندنی کا ادھر سے گزر ہوا، اُس نے بادشاہ کی لاش کو شناخت کر لیا اور لاش کو تنہا پا کر وہیں حفاظت کے لیے بیٹھ گئی اور جب تک بادشاہ کے وارث نہ آ گئے، وہ لاش کی رکھوالی کرتی رہی۔ بعد ازاں شاہ عالم ثانی نے اس ہندنی کی اس خیر خواہی پر اس کو بہن بنا لیا۔ وہ ہندنی بھی بادشاہ کو اپنا بھائی سمجھنے لگی اور اپنی رسوم کے مطابق راکھی سلونو کے تہوار پر بہت سی مٹھائیاں تھالوں میں لگا کر لاتی اور بادشاہ کے ہاتھ میں سچے موتیوں کی راکھی باندھتی۔ بادشاہ بھی اس کو اشرفیاں اور روپے دیتے۔ شاہ عالم ثانی کے بعد اکبر شاہ ثانی نے اس ہندنی کے ساتھ یہ رشتہ نبھایا اور یہی رسم بہادر شاہ ظفر نے اس کی اولاد کے ساتھ نبھائی۔ احسن الاخبار میں راکھی سلونو کی تقریب کا ذکر اس طرح ملتا ہے:

> " حضورِ انور نے راکھی سلونو کے میلے کی تقریب میں راجا بھولا ناتھ کو پچاس روپے اور بر تختِ خاص کے کہاروں کو ایک اشرفی مرحمت فرمائی۔ اس عیش و عشرت کے وقت میں حضور نے ایک مطربہ زہرہ پیکر ماہ طلعت کو شرفِ مناکحت سے اعتبار و امتیاز کا رتبہ مرحمت فرمایا۔"
>
> (۲۴ ستمبر ۱۸۴۷ء) ۶۲

سلونو کے تہوار کا ذکر راشد الخیری نے بھی اپنی کتاب وداعِ ظفر میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ ۶۳

پھول والوں کی سیر

پھول والوں کی سیر کو "سیرِ گل فروشاں" کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ میلا

اگرچہ بہادر شاہ ظفرؔ کے زمانے میں بڑی دھوم دھام سے منایا جانے لگا تھا لیکن اس کی ابتدا بہادر شاہ ظفر کے والد اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں ہوئی تھی۔ اکبر شاہ ثانی کے منجھلے بیٹے مرزا جہانگیر بہت شورہ پشت قسم کے انسان تھے۔ وہ دلّی کے رزیڈنٹ کو "لولو" کہتے تھے اور ایک موقعے پر اس سے جھگڑا بھی کر بیٹھے تھے۔ اس جرم کی پاداش میں وہ قید کرکے الہ آباد بھیج دیے گئے تھے۔ ان کی والدہ کو ان کی جدائی بہت شاق گزری اور انھوں نے منت مانی کہ اگر مرزا جہانگیر قید سے چھوٹ کر دلّی واپس آ گئے تو میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار پر چادر اور پھولوں کی مسہری چڑھاؤں گی۔ اور جب مرزا جہانگیر کسی طرح بری ہوکر آ گئے تو ان کی والدہ نے منت چڑھائی۔ قطب صاحب میں ایک میلا سا لگ گیا۔ دلّی کے پھول والوں نے بھی ایک پنکھا اپنی طرف سے چڑھا دیا۔ یہ میلا قطب صاحب میں کئی دن تک لگا رہا، جس میں شہر کے ہندو مسلمان سب شریک ہوئے۔ بادشاہ اس میلے سے بہت خوش ہوئے اور حکم دیا کہ ہر سال بھادوں کے شروع میں یہ میلا لگنا چاہیے۔ مسلمان درگاہ شریف میں پنکھا چڑھایا کریں اور ہندو جوگ مایا کے مندر پر۔ مسلمانوں کے پنکھے میں ہندو اور ہندوؤں کے پنکھے میں مسلمان شریک ہوا کریں۔ یہ میلا بھادوں کی پندرہ تاریخ کو منایا جاتا تھا۔ شمسی تالاب سے پنکھا اُٹھتا اور مہرولی کے بازار سے گزرتا ہوا جنگلی محل پر آتا، جہاں وہ بادشاہ کو سلامی دیتا۔ اس کے بعد پہلے دن کا پنکھا جوگ مایا کے مندر پر اور دوسرے دن کا پنکھا قطب صاحب کے مزار پر چڑھایا جاتا۔ جب بہادر شاہ ظفرؔ پھول والوں کی سیر کے لیے قلعے سے نکلتے، تو راستے میں صفدر جنگ کے مقبرے پر ضرور رُکتے اور خاصا وہیں نوش کرتے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ظفرؔ کے والد اکبر شاہ ثانی کو یہاں کی آب و ہوا بہت موافق تھی اور وہ برسات میں ہمیشہ یہاں آکر رہتے تھے۔ بہادر شاہ ظفرؔ کے زمانے میں اس میلے میں تقریباً لاکھ ڈیڑھ لاکھ آدمی جمع ہوتے تھے۔ یہ میلا بدھ سے جمعے تک تین دن رہتا تھا۔ یہ کہا گیا ہے کہ اس میلے کا خرچ اس زمانے میں ڈھائی تین لاکھ تک پہنچ جاتا تھا۔ ۶۴

تعمیرات

بہادر شاہ ظفر فنونِ لطیفہ سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ ان میں سے اکثر فنون پر نہ صرف یہ کہ انھیں دسترس حاصل تھی، بلکہ وہ ان کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔[۶۵] وہ شاعری سے لے کر فنِ تعمیر تک ہر فن کے دلدادہ تھے لیکن ان کے مالی وسائل انتہائی محدود تھے اس لیے وہ فنِ تعمیر کا کوئی یادگار نمونہ نہیں چھوڑ سکے۔ تاہم انھوں نے اپنے نامساعد حالات میں بھی جو کچھ تعمیراتی کام انجام دیے، اُن حالات کو دیکھتے ہوئے وہ بھی غنیمت تھے۔

ہیرا محل

قلعۂ معلّٰی میں شاہی حمّام کے نزدیک نہرِ بہشت کے کنارے، جس کا عرض چار گز ہے اور جو مار پیچ کی بنی ہوئی ہے، بہادر شاہ ظفر نے سنگِ مرمر کی ایک نازک اور خوش نما سی بارہ دری تعمیر کرائی تھی۔ اس کا سال تعمیر ۱۲۵۸ھ ہجری مطابق ۱۸۴۲ء ہے۔ سر سید نے اس بارہ دری کی تعمیر کے سلسلے میں لکھا ہے:

"یہ محل قدیم نہیں بلکہ چار پانچ برس ہوئے کہ حضرت ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ غازی خلداللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ نے بنایا ہے۔"[۶۶]

مولوی بشیر الدین احمد نے اپنے اندازے کے مطابق اس بارہ دری کو ۱۲۵۸ھ ہجری کی تعمیر قیاس کیا ہے۔ اس بارہ دری کا اصل نام تو ہیرا محل ہے لیکن یہ مرزا فخرو کی بارہ دری کے نام سے بھی مشہور ہے۔[۶۷]

کنواں

لال قلعے میں شاہی حمام کی پشت پر ایک کنواں ہے۔ اس پر خود ظفر کی کہی ہوئی ایک تاریخ کندہ ہے، جس سے سالِ تعمیر ۱۲۵۷ھ (مطابق ۴۲-۱۸۴۱ء) نکلتا ہے۔ جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ یہ کنواں بہادر شاہ ظفر نے تعمیر کرایا تھا۔ قطعۂ تاریخ حسبِ ذیل ہے:

ظفر تعمیر شد ایں چاہِ شیریں
کہ آبش شربت و قند و نبات است
ازیں خوش تر نہ باشد سالِ تاریخ
ہویدا چشمۂ آبِ حیات است[۶۸]
۱۲۵۷ھ

جھرنا

لال قلعے کے باغِ حیات بخش کے مغرب میں مہتاب باغ تھا، اس باغ کے بیچوں بیچ ایک وسیع اور خوش نما نہر تھی۔ اس نہر پر مغرب کی جانب قطب صاحب کے جھرنے کی طرز پر بہادر شاہ ظفر نے ایک سنگِ سرخ کا جھرنا بنوایا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ اسی باغ میں ایک درگاہ قدم شریف کی بھی تھی جس کے بارے میں سر سید احمد خاں نے لکھا ہے کہ "کچھ عمدہ نہیں" درگاہ بعد میں منہدم ہوگئی اور اب اس کا کوئی نام و نشان باقی نہیں۔ ۶۹

مسجد

لال قلعے ہی میں چھتا چوک کے شمال میں بہادر شاہ ظفر نے ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کرائی تھی۔ اس مسجد کے زمانۂ تعمیر کا پتہ نہیں چلتا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد یہ مسجد سپلائی اور ٹرانسپورٹ کے احاطے میں آگئی اور یہ سپلائی اور ٹرانسپورٹ کا گودام بن گئی۔ ۷۰

دروازہ

لال قلعے کی پشت پر جمنا کی جانب بہادر شاہ ظفر نے سنگِ سرخ کا ایک دروازہ تعمیر کرایا تھا۔ دروازے پر ظفر کا لکھا ہوا یہ کتبہ موجود ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ اس دروازے کا سالِ تعمیر ۱۲۵۷ھ (مطابق ۴۲-۱۸۴۱ء) ہے۔

گشت چو تعمیر بفضلِ خدا ۔۔۔ ایں درِ خوش منظر و فرحت فزا
گفت خرد سالِ بنائش ظفر ۔۔۔ بابِ فلک جاہ و خجستہ بنا"
۱۲۷۱ھ

کٹہرا

لال قلعے میں دیوانِ عام کے سامنے ایک وسیع صحن چھوٹا ہوا تھا، اس صحن کے چاروں طرف سنگِ سرخ کا ایک قدِ آدم کٹہرا بنا ہوا تھا، اور اس کٹہرے پر سنہری کلسیاں تھیں۔ یہ کٹہرا امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں مسمار ہوگیا تھا لہٰذا جب ۱۸۳۷ء میں بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوئے تو انھوں نے اس کٹہرے کو از سرِ نو تعمیر کرایا۔ سر سید احمد خاں لکھتے ہیں:

" سنہ جلوس بادشاہ دین پناہ سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر

غازی خلد اللہ ملکہ، میں کٹہرا از سر نو مرتب ہوا"[2]

ظفر محل

لال قلعے میں درگاہ قدم شریف کے صحن میں سنگِ مرمر کا ایک وسیع و عریض حوض تھا۔ اس حوض کے بیچوں بیچ بہادر شاہ ظفر نے ایک چھوٹا سا جل محل تعمیر کرایا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کے نام کی رعایت سے اس کا نام ظفر محل پڑ گیا تھا۔ اس حوض کی تعمیر لگ بھگ ۱۸۴۲ء میں ہوئی۔ ظفر محل تمام سنگِ سرخ کا بنا ہوا ہے۔ اس محل کے ایک طرف سنگِ سرخ کا ایک پل بنایا گیا تھا جس پر سے ہو کر محل میں پہنچتے تھے لیکن اب یہ پل منہدم ہو گیا ہے اور محل کی چھت بھی گر چکی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد یہ حوض عرصے تک فوج کا سوئمنگ باتھ بھی بنا رہا"[3]

بابِ ظفر

بہادر شاہ ظفر نے درگاہ قطب صاحب کے متصل جانبِ غرب ایک عالی شان محل تعمیر کرایا تھا جو اب بالکل کھنڈر ہو چکا ہے۔ اس محل کے ساتھ سنگِ سرخ کا ایک دروازہ بھی تعمیر کرایا تھا جو آج تک موجود ہے۔ اس دروازے کا نام جیسا کہ اس پر کندہ ہے "بابِ ظفر" رکھا گیا۔ ظفر نے خود ہی اس کی تاریخ کہی جس کا ذکر احسن الاخبار میں اس طرح کیا گیا ہے:

" اطلاع دی گئی کہ حضور قطب صاحب کی درگاہ شریف کا دروازہ بن کر تیار ہو گیا ہے زبانِ فیض ترجمان سے اس کا مادۂ تاریخ اس طرح ارشاد فرمایا:

ایں درِ عالی چو شد محکم بنا حسب المراد
گفت دل سالِ بنا "بابِ ظفر پاینده باد "[4]
۱۲۶۴ھ

صندل کا کٹہرا

بہادر شاہ ظفر نے اپنے سنہ جلوس کے اگلے سال یعنی ۱۲۵۴ھ میں حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے مزار کے گرد صندل کی لکڑی کا ایک کٹہرا نصب کرایا تھا۔[5]

موتی مسجد

موضع مہرولی میں قطب صاحب کی درگاہ سے متصل بہادر شاہ ظفر کے جدِ بزرگوار شاہ عالم اوّل کی تعمیر کرائی ہوئی سنگِ مرمر کی ایک مسجد ہے جو موتی مسجد کے نام سے مشہور تھی۔ اس مسجد کے تین گنبد اور دو مینار سنگِ مرمر کے بنے ہوئے ہیں۔ مسجد کے میناروں پر بہت خوبصورت قسم کی برجیاں تھیں جو دیکھنے میں بہت خوش نما معلوم ہوتی تھیں۔ ۱۲۶۲ ہجری میں بہادر شاہ ظفر نے ان برجیوں کو کہنہ ہوجانے کے سبب مرمّت کی غرض سے اتروا دیا تھا لیکن بعد میں ان کی مرمّت کی نوبت نہیں آئی۔ ۷۶

درگاہ آثار شریف

دہلی کی جامع مسجد میں شمال کی جانب غربی دالان میں حضرت محمدؐ کے آثار شریف رکھے تھے جن کے گرد اورنگ زیب کے عہد میں الماس علی خاں خواجہ سرا نے سنگِ سرخ کا ایک جالی دار مجر تعمیر کرا دیا تھا۔ ۱۸۴۳ء میں بہادر شاہ ظفر کے دورِ حکومت میں ایک بار ایسی سخت آندھی آئی کہ مجر گر گیا۔ بہادر شاہ ظفر نے اس مجر کو ازسرِنو تعمیر کرایا۔ یہ مجر آج تک موجود ہے لیکن اب یہ جامع مسجد کے شمال کی جانب بجائے غربی دالان کے شرقی دالان میں ہے۔"

ایک اور کٹہرا

دہلی کی جامع مسجد کے حوض پر جنوب مغربی کونے میں سنگِ مرمر کا ایک چھوٹا سا کٹہرا نصب تھا۔ اس کٹہرے کے متعلق یہ روایت ہے کہ کسی بزرگ نے خواب میں حضور صلعم کو یہاں وضو کرتے دیکھا لہٰذا وہاں بہ طور احترام اور یادگار ایک کٹہرا بنا دیا گیا تھا۔ اگست ۱۸۴۷ء میں یہ کٹہرا اتفاق سے چوری ہوگیا۔ اس چوری کی اطلاع بہادر شاہ ظفر کو دی گئی۔ انھوں نے ایک دوسرا کٹہرا بنوانے کا حکم صادر کیا لہٰذا امکان غالب ہے کہ جامع مسجد کے جنوب مغربی کونے پر موجودہ کٹہرا بہادر شاہ ظفر ہی کا بنوایا ہوا ہے۔"

جھاڑ محل

مہرولی میں قطب صاحب کی درگاہ سے متصل ایک عمارت جھاڑ محل کے نام سے موسوم تھی۔ کہا جاتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر نے اس عمارت کی مرمّت بھی بڑے اہتمام سے کرائی تھی۔

عیدگاہ شمس الدین التمش

قطب صاحب ہی میں شمس الدین التمش کے زمانے کی ایک عیدگاہ تھی۔ بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں اس کی بھی مرمت ہوئی اور انھوں نے یہ تاریخ کہی :

ظفر چوں بہ ترمیم آخون جی   صفاداد ایں مسجدِ کہنہ را
بہ پرسید سالِ مرمت ز عقل   بگفت "آفریں نیک مردِ خدا"
۱۲۷۰ھ

سنہری مسجد

لال قلعے سے متصل جنوب کی جانب ایک چھوٹی سی مسجد ہے جو سنہری مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ دہلی میں سنہری مسجد کے نام کی دو اور مسجدیں ہیں، ایک دریا گنج میں اور دوسری چاندنی چوک میں کوتوالی سے ملحق۔ اوّل الذکر مسجد احمد شاہ کے عہد میں جاوید خاں نامی ایک رئیس نے تعمیر کرائی تھی۔ یہ مسجد سنگ باسی کی بنی ہوئی ہے۔ اس پر دو خوش نما مینار اور تین گنبد ہیں۔ یہ تینوں گنبد پہلے سنہری تھے۔ لیکن یہ گنبد کاٹھ کے بنے ہوئے تھے جن پر تانبا منڈھا ہوا تھا اور اس تانبے کے اوپر سونے کا باریک پترا چڑھایا گیا تھا۔ رفتہ رفتہ گنبدوں کا کاٹھ گل کر، برج ٹیڑھے ہو گئے۔ بہادر شاہ ظفر نے اپنے عہد میں یہ برج اتروا کر، پکے چونے گاچی کے برج بنوا دیے۔ یہ مسجد جوں کی توں اب بھی موجود ہے اور اس کے میناروں کے برج اور کلسیاں ابھی تک سنہری ہیں۔ ۷۹

حویلی زینت محل

بہادر شاہ ظفر نے اپنی سب سے چہیتی بیگم زینت محل کے لیے لال کنویں پر لبِ سڑک ایک حویلی تعمیر کرائی تھی۔ اس حویلی کے آثار اب بھی موجود ہیں اور زینت محل کے نام سے اس میں لڑکیوں کا ایک سرکاری اسکول ہے۔ مولوی بشیر الدین احمد نے لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے یہ حویلی خیر خواہی سرکار کے صلے میں پٹیالہ اسٹیٹ کو عطا کر دی تھی۔ یہ حویلی ۱۲۶۲ ہجری مطابق ۴۶-۱۸۴۵ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ بہادر شاہ ظفر نے اس کی تاریخ کہی تھی جو سنگِ مرمر کے کتبے پر کندہ ہے :

کردہ ظفر زینت محل تعمیر قصرِ بے بدل   شد بہ محل سالِ بنا "ایں خانۂ زینت محل"
۱۲۶۲ھ

دو باغ

بہادر شاہ ظفرؔ مناظرِ فطرت سے خاص شغف رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ سال میں چار مہینے قطب صاحب میں گزارتے تھے اور وہاں کے فرحت افزا مناظر سے اپنی رُوح کو تازگی پہنچاتے تھے۔ وہ ضعیف العمری کے زمانے میں بھی صبح کے وقت ہوا خوری کو نکلا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ عمارتوں کی تعمیر یا مرمّت کے ساتھ ساتھ انھوں نے دو باغ بھی لگوائے تھے لیکن اب ان میں سے ایک باغ کا بھی نام و نشان باقی نہیں۔ ایک باغ تو قلعے کی دیوار کے نیچے جمنا کے کنارے تھا اور دوسرا شاہدرہ میں۔ ۸۰

مسجد کی ترمیم

کشمیری دروازے سے متّصل فصیل کے باہر جمنا کے مغربی کنارے پر قدسیہ باغ کے نام سے ایک وسیع و عریض اور کشادہ باغ تھا جسے دہلی والے کرسیہ باغ کہتے ہیں۔ اس باغ کے بڑے حصّے میں تو اب کشمیری دروازے کا بس اڈّا بن گیا ہے لیکن ابھی اس کے کچھ آثار باقی ہیں۔ اس باغ میں ایک مسجد بھی ہے جو قدسیہ بیگم نے اٹھارویں صدی کے وسط میں تعمیر کرائی تھی جس زمانے میں بہادر شاہ ظفرؔ ولی عہد تھے تو باغ کا یہ حصّہ ان کی تحویل میں تھا۔ چناں چہ ولی عہد بہادر نے ۱۲۴۹ھ (۳۴-۱۸۳۳ء) میں اس مسجد میں کچھ ترمیم کرائی تھی جس کا پتا مسجد کی شمالی دیوار پر نصب سنگِ مرمر کے اُس کتبے سے ہوتا ہے جس پر یہ شعر کندہ ہے :

سالِ ترمیم ایں بنائے قدیم
اے ظفرؔ جد و جہد اجرِ عظیم ۸۱

۱۲۴۹ھ

شاہ باغ

شاہدرہ ریلوے اسٹیشن کے مقابل شاہ باغ نام کا کوئی باغ تھا جس کے دو منزلہ صدر دروازے پر سنگِ مرمر کا ایک کتبہ نصب ہے۔ اس کتبے پر ظفرؔ کی کہی ہوئی جو تاریخ کندہ ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ اس باغ کی بنیاد ۱۲۶۹ھ ۵۳-۱۸۵۲ء میں پڑی تھی، لیکن یہ بات وثوق سے نہیں کہی جاسکتی کہ آیا یہ باغ ظفرؔ نے خود تعمیر کرایا تھا یا کسی کی فرمائش پر اس کی صرف تاریخ رقم

کی تھی۔ تاریخ یہ ہے :

سالِ تاریخ ایں بنائے پائدار
اے ظفرؔ پرسیدم از دل گفت باغِ میوہ دار ۸۲

۱۲۶۹ھ

سنگِ مرمر کی قبر

بہادر شاہ ظفرؔ کے لیے مہرولی کا علاقہ ایک صحت افزا مقام بھی تھا اور چشتیہ خاندان کے مرید ہونے کی حیثیت سے ان کی روحانی تسکین کا بھی ذریعہ تھا۔ ان کے والد اکبر شاہ ثانی اور جدِّ امجد شاہ عالم کی آخری آرام گاہیں یہیں تھیں، اس لیے ان کی بھی عین خواہش یہی تھی کہ مرنے کے بعد وہ قطب صاحب ہی میں سپردِ خاک کیے جائیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنے لیے ایک قبر بنوا لی تھی۔ لیکن اب اس قبر کا پتا نشان موجود نہیں۔ مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں :

"وہ خاندانِ چشتیہ کا مرید تھا۔ قطب صاحب کی زیارت سے مسرور تھا وہیں اس نے اپنی سنگِ مرمر کی قبر بنوائی تھی۔" ۸۳

بہادر شاہ ظفرؔ کی اس دل کش اور متنوع شخصیت کی تشکیل میں بہت بڑا دخل اس بات کا بھی ہے کہ وہ ایک کمزور بادشاہ تھے۔

حواشی "شخصیت"

۱۔ دہلی کی آخری شمع، ص ۱۱

۲۔ ذکاء اللہ دہلوی، ص ۴۱ تا ۴۴

۳۔ داستانِ غدر، ص ۲۶

۴۔ تاریخِ ہندوستان، جلد نہم، ص ۶۴۴

۵۔ TWILIGHT OF THE MUGHALS P.74

۶۔ اس سلسلے میں عرش تیموری نے ایک واقعہ اس طرح نقل کیا ہے:

"جب غدر کے بعد آپ قید کرکے دہلی میں رکھے گئے اور تحقیقات شروع ہوئی تو بعض عزیز و اقارب جو گورنمنٹ سے بے خوف تھے بغرضِ سلام قید خانے میں حاضر ہوتے تھے۔ آپ نے ایک عزیز سے کہا:

اماں ذرا بھائی الٰہی بخش سے کہنا کہ تم ہمیشہ حلوہ سوہن کا گھان چڑھوا کر ہمارے پاس بھی حصّہ داخل کیا کرتے تھے کیا اب ہم کو بھول گئے۔"

(قلعۂ معلّٰی کی جھلکیاں، ص ۳۵)

۷۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۴۲ تا ۱۴۳

۸۔ حسن نظامی نے ایک دلچسپ قصّہ یہ نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ رزیڈنٹ نے گاؤ قصّابان کے اخراج کا حکم جاری کر دیا اور تاکید کی کہ وہ اپنی دکانیں شہر سے باہر لے جائیں۔ قصّابوں کے پاس جب کوئی چارہ کار نہ رہا تو انھوں نے بیوی، بچوں سمیت محلِ شاہی کے جھروکوں کے نیچے ڈیرہ ڈال دیا۔ بادشاہ نے جب ان کی فریاد سنی تو اپنے ملازم کو حکم دیا کہ ہمارا ڈیرا خیمہ بھی جمنا کی ریتی میں ان کے برابر لگا دو جو حال ان کا وہ ہمارا جب رزیڈنٹ کو یہ خبر ملی تو وہ گھبرائے ہوئے بادشاہ کے پاس آئے اور کہا حضور ایسا نہ کریں آپ کے ساتھ تمام خلقت شہر سے نکل کھڑی ہوگی۔ بادشاہ نے جواب دیا جہاں میری رعیت وہاں میں۔ چنانچہ مجبوراً رزیڈنٹ کو اپنا حکم واپس لینا پڑا۔

(دہلی کا آخری سانس، ص ۱۴۲ تا ۱۴۳)

۹۔ داستانِ غدر، ص ۲۷

۱۰۔ ذکاءاللہ دہلوی، ص ۴۴

۱۱۔ ذکاءاللہ دہلوی، ص ۴۶

۱۲۔ M.P., COLLECTION NO.142, FILE NO. 144, N.A.1.

۱۳۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۲۶

۱۴۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۳۶

۱۵۔ آثارالصنادید، ص ۱۹۰

۱۶۔ ذکاءاللہ دہلوی، ص ۴۲

۱۷۔ تاریخ ہندوستان، ص ۳۴۶

۱۸۔ TWILIGHT OF THE MUGHALS P.74

۱۹۔ ملاحظہ ہو "خطوط" کے زیرِ عنوان اس کتاب کے باب "تصانیف" کی عبارت:

۲۰۔ "خطِ نسخ میں حضرت بادشاہ ظل اللہ میرے جدِّ بزرگوار میر امام علی شاہ صاحب مرحوم کے شاگردِ رشید تھے۔ میرے دادا نے میرے والد اور بادشاہ کو برابر بتایا تھا۔ دونوں بزرگوار خوش نویس لاثانی تھے۔ دہلی میں جتنے اس فن کے خوش نویس تھے میرے والد یا بادشاہ کے شاگرد تھے۔"

(داستانِ غدر، ص ۱۹)

۲۱۔ "بادشاہ زادوں اور ان کے باپ دادوں کے تین شوق ضرور تھے۔ ایک نجوم کا، ایک مصوّری کا اور ایک خوش نویسی کا ..... ہمارے جہاں پناہ عربی اور فارسی خط کے کامل تھے .... شاید خوش نویسی کے استاد حضور کے میر کلو صاحب تھے اور بادشاہ نے اس ہنر میں سینکڑوں کو شاگرد کیا تھا۔ حافظ امیرالدین صاحب بادشاہ ہی کے شاگرد ہیں جنھوں نے ایسا قرآن شریف لکھا جس کی دھوم لندن اور روم تک ہو رہی ہے۔"

(لال قلعے کی ایک جھلک، ص ۲۹)

۲۲۔ "میر پنجہ کش شہر کے مشہور خوش نویس بادشاہ کے ہم عصر تھے۔ برسوں دونوں نے ساتھ ریاضت کی اور اس محنت کے فن کو کمال کے درجے پر پہنچا دیا۔ میر صاحب کا خط ہندوستان میں بے نظیر تھا مگر بادشاہ کی خوش نویسی کے وہ بھی مدّاح تھے۔"

(وداعِ ظفر، ص ۱۴۲)

۲۳۔ "لال قلعے کے بادشاہوں کے ہاں یہ آئین تھا کہ ایک استاد خوش نویس کے ہزار پانچ سو کم عمر غلام، شاگرد کروائے جاتے تھے اور وہ مشق کرتے کرتے خوش نویسی میں کامل ہوجاتے تھے اور سب کا خط ایسا ملتا جلتا ہوتا تھا کہ زید بکر کے لکھے میں کچھ فرق نہیں معلوم ہوتا تھا۔ جب حضور والا چاہتے تھے سو جز کی کتاب کا شیرازہ توڑ کر ایک ایک جز بانٹ دیتے اور فرماتے کہ ہر کاتب اپنا جز غروبِ آفتاب سے پہلے لکھ کر پورا کرے اور اس تدبیر سے سو جز کی کتاب ایک دن میں لکھی جاتی تھی پھر ساری کتاب ایک قلم، ایک سیاہی، ایک کاتب کی لکھی معلوم ہوتی تھی۔"

(لال قلعے کی ایک جھلک، ص ۵۴)

۲۴۔ داستانِ غدر، ص ۲۰

۲۵۔ "بندوق کا نشانہ نہایت لاجواب تھا کبھی خطا نہ ہوتا تھا اور کمال یہ تھا کہ نشانہ جس طرح ایک جگہ قائم چیز پر خطا نہ ہوتا تھا اسی طرح متحرک پر بھی خطا نہ ہوتا۔ چنانچہ وہ اڑتے ہوئے پرندوں کو بڑی آسانی سے شکار کر لیتے تھے..... آپ، اپنی حیات میں کبھی شکار سے خالی ہاتھ نہیں آئے بلکہ ہمیشہ ایک بڑی مقدار شکار کی بہنگیوں، نوکروں اور بادشاہی کہاروں کے سر پر آتی تھی۔"

(قلعۂ معلّٰی کی جھلکیاں، ص ۲۷ تا ۲۸)

۲۶۔ داستانِ غدر، ص ۲۱ تا ۲۲

۲۷۔ "بہادر شاہ کو تیر لگانے کا عجیب ملکہ تھا کہ استاد بھی حیران ہو کر دعائیں دینے لگتے تھے۔ تیر انداز خاں آپ کے تیر اندازی میں استاد تھے۔ آپ کی تیر اندازی کی مشق آخیر زمانے تک رہی...... روزانہ دیوانِ عام کے بالائی حصے سے خاک تودے پر تیر لگاتے تھے۔ کمال یہ ہے کہ تیر تلیر کی اڑان کی طرح بجائے خاک تودے کے سر سے پر لگنے کے بیچ میں جا کر پیوست ہو جاتا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کسی نے اس سطح پر کھڑے ہو کر تیر لگایا ہے جس پر خاک کا تودہ ہے۔"

(قلعۂ معلّٰی کی جھلکیاں، ص ۲۶ تا ۲۷)

۲۸۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۸۳

۲۹۔ داستانِ غدر، ص ۲۱

۳۰۔ ذکاء اللہ دہلوی، ص ۳۴

۳۱۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۰

۳۲۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۹

۳۳۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۴۴

۴۴۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۹۴

۴۵۔ لال قلعے کی ایک جھلک، ص ۵

۴۶۔ "اس دن صبح کو سبزوار مرغی کے انڈے لڑائے جاتے تھے .... یہ انڈا بہت سخت و کرخت اور چھوٹا ہوتا تھا اور اس میں چنے کی دال کے برابر ایک نوک نکلی ہوتی تھی، اس کو نیش کہتے تھے ..... اس پر ہزاروں روپے کی ہار جیت ہو جاتی تھی لیکن سبزوار کے انڈے صرف شہزادوں اور اہلِ دولت کو ہی ہاتھ آتے تھے۔"

(قلعۂ معلّا کی جھلکیاں، ص ۷)

۴۷۔ تاریخِ ہندوستان، ص ۳۴۶

۴۸۔ "حضرت کو بیعت میاں کالے صاحب نبیرۂ مولانا فخر الدین علیہ الرحمۃ سے تھی۔"

(داستانِ غدر، ص ۱۹)

۴۹۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۰۴

۵۰۔ "حضور کو حضرت میاں کالے صاحب سے بیعت تھی اور ایسا اعتقاد تھا کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ بس پیر پرستی کرتے تھے۔ قاسم جان کی حویلی ہی جو حضرت کو حویلی نظر (نذر) کی تھی، وہ لاکھوں روپے کی تیاری کی تھی جس میں باغ تھا، نہر تھی، سینکڑوں مکان شاہانہ تھے۔ حضرت میاں کالے صاحب بھی اس میں جایا کرتے تھے اور بادشاہ سلامت حضرت کے دولت خانے پر حاضر ہوا کرتے تھے۔ ایک دفعہ بادشاہ حضرت سے کچھ رنجیدہ ہو گئے۔ حضرت کو تو کیا غرض پڑی تھی جو لال قلعے میں جاتے مگر بادشاہ سلامت بھی اپنی بادشاہت کے گھمنڈ میں حضرت کے سلام کے لیے حضرت کی حویلی میں کئی دن حاضر نہ ہوئے۔ آخر بادشاہ سلامت کو خدا نے سمجھ دی اور وہ یہ سمجھے کہ مجھ سے غلطی ہوئی جو میں پیرو مرشد کی خدمت میں حاضر نہ ہوا مگر اب ملنا چاہیے۔ خود بدولت ہاتھی پر سوار ہوئے۔ حکیم احسن اللہ خاں صاحب وزیر کو ساتھ لیا۔ جب حضرت کے دروازے پر پہنچے تو ہاتھی پر سے اُترے، حکیم صاحب سے کہا کہ رومال سے میرے ہاتھ باندھ دیجیے ...... اطلاع کرائی کہ بہادر حاضر ہے، حکم ہو تو روبرو حاضر ہو۔ جواب ملا شوق سے تشریف لائیں۔ جب بادشاہ میاں صاحب کے سامنے ہاتھ باندھے پہنچے تو..... دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ میاں کالے صاحب نے اُٹھ کر بادشاہ سلامت کے ہاتھ کھول دیے اور گلے سے لگا لیا۔"
(لال قلعے کی ایک جھلک، ص ۲۹ تا ۳۰)

۴۱۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۹۳

۴۲۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۹۹

۴۳۔ "بادشاہ تک ویسے تو بڑے بڑے راجہ نوابوں کی پہنچ نہ ہو سکتی تھی مگر حکم تھا کہ جو مرید بادشاہ کا شاگرد ہونے آئے اسے آنے دو۔ اس بہانے غریب لوگ بھی حضور تک پہنچ جاتے تھے۔"
(لال قلعے کی ایک جھلک، ص ۲۹)

۴۴۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۷۱

۴۵۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۷۸

۴۶۔ غدر کے صبح و شام، ص ۱۹۵

۴۷۔ اسبابِ بغاوتِ ہند، ص ۹

۴۸۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۵۷

۴۹۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، ص ۱۲۹

۵۰۔ ذکاء اللہ دہلوی، ص ۳۹

۵۱۔ ذکاء اللہ دہلوی، ص ۴۵

۵۲۔ (الف) داستانِ غدر، ص ۳۰

(ب) دہلی کا آخری سانس، ص ۱۱۱ تا ۱۱۲

(ج) بزم آخر ص ۷۰ تا ۷۲

(د) طامس مٹکاف نے 'دہلی بک' (ص ۱۵۲ تا ۱۵۷) میں کئی صفحات پر پھیلی ہوئی ایک قلمی تصویر پیش کی ہے جس میں بادشاہ کی سواری کے جلوس کو عید گاہ جاتے ہوئے دکھایا گیا ہے اس ہم عصر ماخذ میں شاہی سواری کا جو تام جھام دیکھنے کو ملتا ہے اس سے منشی فیض الدین، ناصر نذیر فراق، عرش تیموری اور راشد الخیری وغیرہ کے ان قلمی مرقعوں کی صداقت میں زیادہ شبہے کی گنجائش نہیں رہتی جو ظفر کی وفات اور دہلی کی بربادی کے بعد لکھے گئے ہیں۔

۵۳۔ بزم آخر، ص ۷۲ تا ۷۳

۵۴۔ بزم آخر، ص ۷۵ تا ۷۶

۵۵۔ بزم آخر، ص ۷۶ تا ۷۷

۵۶۔ دلی کا آخری دیدار، ص ۲۵

۵۷۔ بزمِ آخر، ص ۱۲ تا ۱۳

۵۸۔ دلّی کا آخری دیدار، ص ۱۵

۵۹۔ بزمِ آخر، ص ۴۴ تا ۴۶

۶۰۔ بزمِ آخر، ص ۴۶ تا ۵۰

۶۱۔ (الف) بزمِ آخر، ص ۵۲ تا ۵۳

(ب) دلّی کا آخری دیدار، ص ۱۶

(ج) قلعۂ معلّا کی جھلکیاں، ص ۸

۶۲۔ بزمِ آخر، ص ۴۷ تا ۷۵

۶۳۔ "آسمان پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے لیکن باغ میں..... آموں کے جھنڈ چھائے ہوئے ہیں۔ جامنوں کے گچھے ہَوا میں جھول رہے ہیں۔ زمین پر لکرونددوں کی بہار، آسمان پر بگلوں کی قطار۔ پپیہا الاپ رہا ہے، کوئل کوک رہی ہے۔ نقارے پر چوٹ پڑی..... نفیری بجی اور جھولے والیاں جھولے پر گئیں۔ پینگیں بڑھ رہی ہیں، جھونٹے مل رہے ہیں۔ دوپہر تک جھولے اور پکوان ہوتے رہے، کھانا کھایا اور بادشاہ سلامت نے اپنے ہاتھ سے زمرّدیں چوڑیاں ایک ہاتھ میں پانچ اور ایک ہاتھ میں تین اپنی ہندو بہن کے باندھیں اور ساتھ والیوں کو جوڑے عطا ہوئے، نقد روپے دیے گئے۔ مٹھائیوں، کھجوریوں اور پوریوں کے تھال ساتھ ہوئے اور اس طرح یہ بہن بھائی کے انعام و اکرام سے مالامال شاہی جوڑا پہن کر سسرال رخصت ہوئی۔"

(وداعِ ظفر، ص ۱۰)

۶۴۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

(الف) داستانِ غدر، ص ۳۰

(ب) بزمِ آخر، ص ۹۴ تا ۱۰۴

۶۵۔ ملاحظہ ہو اقتباس متعلّقہ حاشیہ نمبر ۱۷

۶۶۔ آثار الصنادید، ص ۳۰

۶۷۔ واقعاتِ دارالحکومت ہند، جلد دوم، ص ۶۹

۶۸۔ واقعاتِ دارالحکومت ہند، جلد دوم، ص ۶۹ (یہ کتبہ اب لال قلعے کے میوزیم میں رکھا ہوا ہے)

۶۹۔ آثار الصنادید، ص

۷۰۔ واقعاتِ دارالحکومت ہند، ص ۳۷ تا ۴۷

۷۱۔ غالب و ظفر کے منظوم کتبے ضیاء الدین ڈیسائی (غیر مطبوعہ)

۷۲۔ آثار الصنادید، ص ۱۱

۷۳۔ آثار الصنادید، ص ۳۶

۷۴۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۷۳

۷۵۔ داستانِ غدر، ص ۳۹

۷۶۔ آثار الصنادید، ص ۱۹۲

۷۷۔ (الف) آثار الصنادید، ص ۱۵

(ب) واقعاتِ دارالحکومت ہند، ص ۱۰۹ تا ۱۱۰

۷۸۔ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۸۰

۷۹۔ واقعاتِ دارالحکومت ہند، ص ۱۱۸

۸۰۔ TWILIGHT OF THE MUGHALS P.74

۸۱۔ غالب و ظفر کے منظوم کتبے

۸۲۔ غالب و ظفر کے منظوم کتبے

۸۳۔ تاریخ عروجِ انگلشیہ، ص ۳۸۳

۲

- ادبی پس منظر
- تصانیف
- ظفر اور ذوق

ادبی پس منظر

اردو شاعری کی روایتی تنقید میں دہلی کی شاعری کی خصوصیات کو داخلیت سے اور لکھنؤ کی شاعری کی خصوصیات کو خارجیت سے موسوم کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کے بارے میں مطلق انداز میں یہ بات کہنا مناسب نہیں۔ زیادہ صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ داخلیت اور خارجیت کے اثرات دونوں جگہ کارفرما تھے مگر اس فرق کے ساتھ کہ دہلی کی شاعری کا غالب عنصر داخلیت اور لکھنؤ کی شاعری کا خارجیت ہے۔ یہ خصوصیات دہلی اور لکھنؤ کے تاریخی اور سماجی حالات کا نتیجہ تھیں۔ اگر دہلی کی شاعری تاثر کے لحاظ سے دل میں اتر جانے والی تھی تو لکھنؤ کی شاعری فن کارانہ اظہار کا اعلا نمونہ تھی اور ذہن کو متاثر کرنے کی اس میں بڑی طاقت تھی۔

۵ ستمبر ۱۸۰۳ء کو لارڈ لیک کی فوجوں نے دریاے جمنا کو پار کر کے دہلی میں قدم رکھا اور بہادر شاہ ظفر کے دادا نابینا شاہ عالم ثانی کو ایسٹ انڈیا کمپنی کا پنشن خوار بنا کر دہلی کے تخت پر بٹھا دیا۔ اگرچہ مشہور تو یہ ہو گیا تھا کہ "سلطنتِ شاہ عالم از دلی تا پالم" لیکن اس قول کی شہرت میں بھی قافیے کی رعایت کو دخل تھا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ عملی طور پر مغل بادشاہ کے تمام اختیارات ختم ہو گئے تھے اور اس کی بادشاہت صرف قلعے کی چہار دیواری تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ صورتِ حال اپنے آپ میں کتنا ہی بڑا تاریخی المیہ سہی لیکن اس کے نتیجے میں دہلی کی ثقافتی تہذیب کے وہ نئے نقش و نگار بننے شروع ہوئے

جن سے شاعری کے میدان میں بھی ایک نئی دہلویت ظہور پذیر ہوئی۔ مغل شہنشاہ جہاں بانی کے بکھیڑوں سے آزاد ہو کر لال قلعے میں امن و آسائش کی زندگی بسر کرنے لگے۔ وہ تفریحات و مشاغل جو بادشاہوں کو کبھی کبھی امن کے زمانے میں میسّر آتے تھے اب روزانہ زندگی کا معمول ہو گئے۔ شہر دہلی نے بھی بہت عرصے بعد اطمینان کا سانس لیا۔ انگریزوں کے نظامِ حکومت سے شہری زندگی میں بھی ایک ایسا نظم و ضبط پیدا ہوا جس سے دہلی عرصے سے محروم تھی۔ مغربی طرزِ فکر اور طرزِ معاشرت کی ہوائیں دہلی کے گلی کوچوں سے گزرنے لگیں۔ لال قلعہ ایک بار پھر ادبی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ اگرچہ مالی اعتبار سے دربار کی حالت خستہ تھی پھر بھی دربار کے متوسلین کی سرپرستی اور قدر افزائی میں شاہانہ روایات کو برقرار رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ شاہ عالم خود بھی شاعر تھے اور آفتاب تخلّص کرتے تھے۔ وہ اردو، برج بھاشا اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ان کے یہ دو شعر تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے نقل کیے ہیں:

شب دل آرام سے گزرتی ہے
صُبح اٹھ جام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے
اب تو آرام سے گزرتی ہے

قلعۂ معلّا میں شعر و سخن کی محفلیں آراستہ ہونے لگیں اور اس دور کے سر برآوردہ شعراء ان محفلوں کو اپنی شرکت سے رونق بخشنے لگے۔ شاہ عالم ثانی اور قلعۂ معلّا کی بزمِ سخن کا ذکر کرتے ہوئے قدرت اللہ قاسم نے لکھا ہے:

"بہتے ازاوانِ شباروزی تفریحاً للطبع اللطیف بدیں شغلِ شریف کہ عبارت از ابتکارِ شعر و شاعری است، فارسی باشد یا ریختہ، سنسکرتہ بود خواہ بھاکا، صرف می شود۔ دریں ہنگام عشرۂ آغاز فرحت انجام شطرے از نکتہ سنجانِ شیریں زباں و برخے از سخن آرایانِ سحر بیاں بشرفِ حضورِ فیض گنجور مشرّف می گردند و بحکمِ ارفع اعلیٰ اقدس بعضے از آں

جادو طرازانِ ذوی الاختصاص در دیوان خاص بہ وقتِ معینۂ سعادت اندوزِ خدمت گشتہ (بہ) درِ غررِ ہر گونہ اشعارِ آب دار سامعہ افروزِ آں خدیوِ ہفت کشور می شوند"۔ ۲

ظفر کے ادبی شعور نے جب آنکھ کھولی تو دہلی کے بیشتر نامور شعرا دہلی کو خیرباد کہہ کر لکھنؤ جا چکے تھے۔ لکھنؤ میں ایک نئی بساطِ سخن بچھ رہی تھی۔ میر، سودا، میر حسن اور میر سوز جیسے شعرائے دہلی نے اہلِ لکھنؤ کو متاثر کیا۔ انشا، جرأت اور مصحفی کا اندازِ سخن دہلی کے بزرگ شعرا سے قدرے مختلف ضرور تھا لیکن اہلِ لکھنؤ کے لیے اس میں بھی ایک نیا پن تھا۔ انشا اور جرأت اس ناسٹالجیا کی گرفت میں نہیں تھے جس میں میر جیسے شاعر تھے اس لیے لکھنؤ کو انھوں نے اور ان کو لکھنؤ نے بہت جلد قبول کر لیا۔ اس طرح لکھنؤ میں شعر و شاعری کے ایک نئے دبستان کا آغاز ہوا۔ گویا جس وقت ظفر کے ادبی شعور نے آنکھ کھولی تو دبستانِ لکھنؤ کے خط و خال بن رہے تھے۔

ظفر کا سالِ پیدائش ۱۱۸۹ھ (۱۷۷۵ء) اور ناسخ کا ۱۱۸۵ھ (۱۷۷۲-۷۱ء) ہے اس اعتبار سے ناسخ، ظفر سے صرف چار سال بڑے تھے۔ ظفر کے پہلے استاد شاہ نصیر دہلوی تھے۔ شاہ نصیر کے سالِ پیدائش کا پتا نہیں چلتا لیکن امکان یہ ہے کہ اگر وہ ظفر سے بڑے نہیں تو ان کے ہم عصر ضرور ہوں گے اس لیے کہ شاہ نصیر، ذوق کے بھی استاد تھے جو ظفر سے چودہ سال چھوٹے تھے۔ شاہ نصیر کے بارے میں آزاد نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ انگریز کی عملداری کے بعد حیدر آباد چلے گئے تھے۔ دہلی میں انگریز کی عمل داری ۱۲۱۸ھ (۱۸۰۳ء) میں ہوئی۔ شاہ نصیر کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ نواب اعظم الامرا ارسطو جاہ کے عہد میں پہلی بار حیدر آباد پہنچے۔ ارسطو جاہ کا انتقال ۱۲۱۹ھ (۱۸۰۵-۱۸۰۴ء) میں ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شاہ نصیر ۱۲۱۹ھ یا اس سے کچھ ہی پہلے دہلی کو خیرباد کہہ کر حیدر آباد گئے۔ اس تمام بحث کا لب و لباب یہ ہے کہ ظفر کی شاعری پر شاہ نصیر کے جو کچھ بھی اثرات پڑ سکتے تھے، وہ ۱۲۱۸ھ یا ۱۲۱۹ھ تک پڑ چکے ہوں گے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دبستانِ لکھنؤ تشکیل کے ابتدائی مراحل میں تھا اور ناسخ تو خاص طور پر اس

وقت تک شہرت کی بلندیوں تک نہیں پہنچے تھے۔ اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ شاہ نصیر لکھنوی رنگ میں شعر کہتے تھے اور ناسخ کی تقلید کرتے تھے۔ شاہ نصیر کا جیسا بھی تھا اپنا ایک خاص انداز تھا۔ وہ نہ دہلوی شعرا کی طرح جذبے اور خیال کی گہرائی تک جا سکتے تھے اور نہ ان میں 'معنی آفرینی' کا وہ کمال تھا جو بعد میں لکھنؤ میں ناسخ کے عہد کی پہچان بنا۔ اُن کا اصل کمال صرف سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنا اور نئی نئی اور مشکل زمینیں ایجاد کرنا تھا۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ ۱۹-۱۸۱۸ھ تک ہی ظفر کے استاد رہے تو ظفر کے اس کلام پر، جو دیوانِ اوّل میں شامل ہے اور جس کی تکمیل ۱۲۴۴ھ میں ہوئی، ان کے اثر کو ظفر کی صرف ان غزلوں تک محدود سمجھا جا سکتا ہے جو ان کے اثر سے سنگلاخ زمینوں میں کہی گئی ہیں۔ تذکرہ نگاروں نے بھی شاہ نصیر کا ذکر کچھ ایسے تعریفی انداز میں نہیں کیا ہے۔ مصحفی نے ریاض الفصحا میں شاہ نصیر کے لکھنؤ آنے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"در روانیِ طبعش شکی نیست۔ امّا چوں در لکھنؤ گزرافگندہ و با فصحاے ایں دیار ملاقات کرد و در مشاعرہ ہا غزلِ طرحی گفتہ خواندہ مرتبۂ سخنِ بلند اوراً معلوم شد" ۶

انتخابِ ناسخ کے طویل دیباچے میں رشید حسن خاں نے بعض ٹھوس دلائل کی بنیاد پر یہ بات کہی ہے کہ ناسخ کی شاعری سعادت علی خاں کے عہد میں اپنے عروج کو پہنچی۔ سعادت علی خاں کا انتقال ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۴ء) میں ہوا۔ اس سے دو چار برس پہلے ہی لکھنؤ میں طرزِ ناسخ کی شناخت اور اس کی تقلید کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ مصحفی نے اپنے دیوانِ ششم کے دیباچے میں، جو غیر مطبوعہ ہے، اور جو ۱۲۲۴ھ کی تحریر ہے، ناسخ کے ان اثرات کا جائزہ لیا ہے جو لکھنؤ کی اس دور کی ادبی فضا پر مرتب ہو رہے تھے۔ رشید حسن خاں نے مصحفی کی اس تحریر سے جو نتائج اخذ کیے ہیں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"........ (۲) ناسخ نے سادہ گو شاعروں کے کلام پر خطِ نسخ کھینچ دیا تھا۔ بہت کم عرصے میں ان کا طرز مقبول ہو گیا تھا۔ (۳) آتش نے

ناسخ کے انداز کی پیروی کی۔ مصحفی نے بھی سادہ گو ہونے کے باوجود اس کے بعد مشاعروں میں شرمندگی نہیں اٹھائی۔ بلکہ اکثر غزلیں انھی لوگوں کے انداز میں یعنی اس انداز میں جس کو ناسخ نے فروغ دیا تھا اور جس کی آتش نے تقلید کی تھی، کہیں۔ (۴) چھٹے دیوان کی بیشتر غزلیں اسی انداز میں کہی گئی ہیں یعنی یہ دیوان اس نئے طرز میں، یا طرز ناسخ میں مرتب ہوا ہے۔" ۹

ظفر کے دیوانِ اوّل کی تکمیل کا زمانہ بھی ۱۲۲۴ھ یا اس سے پہلے کا ہے۔ ظفر کے اس کلام پر جو دیوان اول میں شامل ہے ناسخ کا اثر نہ سہی لیکن اس کے بعد ناسخ کی شہرت کا چرچا دہلی میں عام ضرور ہو گیا تھا۔ غالب کا سالِ ولادت ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) اور مومن کا ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ء) ہے۔ گویا ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۴ء) میں جو سعادت علی خاں کا سالِ وفات ہے اور جس وقت ناسخ کی شہرت اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی اس وقت غالب کی عمر تقریباً سترہ سال اور مومن کی کم و بیش چودہ سال تھی۔ گویا غالب اور مومن کے ادبی شعور نے طرزِ ناسخ کی مقبولیت کی فضا میں آنکھ کھولی۔ چناں چہ دہلی کے یہ دو اہم شاعر، غالب اور مومن اپنی انفرادی صلاحیتوں کی بنا پر اور اپنے دور کی ادبی فضا کے زیرِ اثر 'سادہ گوئی' کی اس ڈگر پر چلنے سے محفوظ رہے جس کے لیے شعرائے دہلی مشہور یا بدنام تھے۔ لکھنؤ میں 'سادہ گوئی' کے مقابلے میں جب 'معنی آفرینی' کو فروغ حاصل ہوا اور طرزِ ناسخ کا چرچا پھیلا اور چلن عام ہوا تو دہلی میں غالب اور مومن جیسے شاعروں کے لیے اس 'معنی آفرینی' کو گرفت میں لانا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔ البتہ غالب کا ذہنی افق مومن کے ذہنی افق سے کہیں زیادہ وسیع تھا اس لیے غالب تو ناسخ کی تقلید میں نہیں بلکہ ان کے اثر سے اپنی ایک علاحدہ طرز نکالنے میں کامیاب ہو گئے لیکن مومن بہک گئے۔ شاید یہ کہنا صحیح ہو کہ مومن اپنی عشقیہ شاعری کے لیے اگر 'معنی آفرینی' کے مقابلے میں 'سادہ گوئی' سے کام لیتے تو زیادہ کامیاب رہتے۔

شاہ عالم آفتاب کے بعد جب اکبر شاہ ثانی شعاع کا زمانہ آیا تو شعر و سخن کی

یہ محفلیں کچھ سرد پڑ گئیں۔ اکبر شاہ ثانی کو شعر و سخن سے برائے نام دل چسپی تھی لہٰذا بادشاہ کے مقابلے میں ولی عہد یعنی ظفر کے دربار کی رونق بڑھ گئی۔ ذوق بھی ظفر کے زمانۂ ولی عہدی ہی میں ان سے متوسّل ہوئے تھے۔ ظفر کی سخن سنجی کا ذکر قدرت اللہ قاسم نے اس طرح کیا ہے:

"شوقِ این فنِ شریف بسیار دارند۔ اکثر اوقات ہمایوں بہ سخن سازی و نکتہ پردازی می گمارند۔" ۱۰

ظفر کی سخن دانی سے شعر و سخن کی محفلوں میں اور جان پڑ گئی۔ ہر طبقے، ہر مکتبۂ فکر کے شاعر دربار سے متوسّل تھے۔ میر و سودا کے شاگرد، انشا و مصحفی کے ہم عصر اور دوسرے بہت سے شعرا ظفر کے حلقۂ مقربین میں داخل تھے۔ دن رات شعر و سخن کی محفلیں گرم رہتی تھیں جن میں سب اپنی اپنی جولانیِ طبع کا مظاہرہ کرتے تھے۔ بقول محمد حسین آزاد:

"اکبر شاہ، بادشاہ تھے انھیں تو شعر سے کچھ رغبت نہ تھی مگر مرزا ابوظفر ولی عہد کہ بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے شعر کے عاشق و شیدا تھے اور ظفر تخلّص سے ملکِ شہرت کو تسخیر کر لیا تھا۔ اس لیے دربارِ شاہی میں جو جو کہنہ مشق شاعر تھے مثلاً حکیم ثناء اللہ خاں فراق، میر غالب علی سَیّد، عبدالرحمان خاں احسان، برہان الدین خاں زار، حکیم قدرت اللہ قاسم ان کے صاحب زادے حکیم عزت اللہ عشق، میاں شکیبا شاگردِ میر تقی مرحوم مرزا عظیم بیگ شاگردِ سودا، میر قمرالدین منّت، ان کے صاحب زادے میر نظام الدین ممنون وغیرہ سب شاعر وہیں آ کر جمع ہوتے تھے۔ اپنے اپنے کلام سناتے تھے۔ مطلعے اور مصرعے جلسے میں ڈالتے تھے ہر شخص مطلعے پر مطلع کہتا تھا، مصرعے پر مصرع لگا کر طبع آزمائی کرتا تھا۔" ۱۱

غرض جب ظفر نے میدانِ شاعری میں قدم رکھا تو بار بار کی اجڑی ہوئی دہلی میں اب بھی ایسی ہستیاں موجود تھیں جنھیں "منتخبِ روزگار" کہا جا سکتا تھا۔ لاکھ تباہی اور بربادی کے باوجود یہاں شعر و سخن کے آسمان پر ایسے ستارے جگمگا رہے تھے جن کی تابندگی

سے فضا منور تھی۔ دہلی شعر و ادب کا گہوارہ بنی ہوئی تھی۔ مولوی امام بخش صہبائی، مفتی صدرالدین آزردہ اور مولانا فضلِ حق خیر آبادی کے علم و فضل کی شہرت دور دور تک تھی۔ غالب مومن اور شیفتہ کی شاعری تاریخِ ادبِ اردو کا اہم باب بننے والی تھی۔ میر و سودا کے بعد دہلی نے ایسی عمدہ محفلیں شاید اسی زمانے میں دیکھی ہوں گی۔ ظفر نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی۔ انھیں شاعری کا شوق خود قلعے کی ادبی سرگرمیوں ہی سے پیدا ہوا۔ چوں کہ وہ ایک ایسی حکومت کے ولی عہد تھے جس میں ملک گیری کا کوئی جھمیلا نہیں تھا، اس لیے ولی عہد تو کیا بادشاہ کے کاندھوں پر بھی حکمرانی کی کوئی ذمّے داری نہیں تھی۔ چناں چہ ولی عہد کو ادبی محفلوں میں زیادہ سے زیادہ شریک رہنے کا موقع ملتا ہو گا۔ ان ادبی محفلوں نے ان کے ذوق کی تربیت اور فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔ شروع میں ظفر پر شاہ نصیر کے رنگِ سخن کا کچھ اثر پڑا۔ چناں چہ ان کے کلیات، خصوصاً دیوانِ اوّل میں ایسی غزلیں موجود ہیں جن کو دیکھ کر بہ آسانی یہ بات کہی جا سکتی ہے۔ ظفر اپنے دوسرے استاد ذوق سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کے کلام میں سلاست، روانی اور محاورہ بندی کی طرف زیادہ رجحان ذوق کے اثرات کو ظاہر کرتا ہے۔ اس دور کے دو اہم شاعر، غالب اور مومن، ظفر کو زیادہ متاثر نہیں کر سکے۔ غالب کا فلسفیانہ پیرایۂ اظہار فارسی الفاظ کا زیادہ صرف، اور عام پسندی سے بے زاری کا انداز ظفر کو زیادہ نہیں بھایا۔ اسی طرح مومن کی 'معنی آفرینی' کا بھی ظفر کی شاعری پر اثر نظر نہیں آتا۔ خود ظفر کو بھی اس کا اعتراف تھا کہ ان کے مذاقِ سخن کو ذوق ہی سمجھ سکتے تھے:

تیرا مذاقِ شعر ظفر جانتا ہے کون
استاد ذوق تھا ترے واقف مذاق سے

اس کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ظفر کا کلام اپنے اساتذہ کے رنگِ سخن ہی کی آئینہ داری کرتا ہے۔ سنگلاخ زمینیں، قافیہ پیمائی، محاورہ بندی یہ سب چیزیں جو شاہ نصیر اور ذوق کے رنگِ سخن سے عبارت ہیں، ان کے کلام میں ایک حد تک ہی ملتی ہیں ظفر اپنے ماضی اور حال کی تمام ادبی قدروں سے آگاہ اور متاثر نظر آتے ہیں۔ چوں کہ

انھوں نے ہر رنگ میں کہا ہے اس لیے ان کے کلام میں ہر رنگ کے شعر بہ آسانی مل جاتے ہیں۔

ظفر کے استاد

بہادر شاہ ظفر کے مذاقِ شعر کی تشکیل میں اس زمانے کی ادبی اقدار کے ساتھ ساتھ ان اساتذۂ فن کا بھی ہاتھ رہا ہے جن سے وہ کسی نہ کسی اعتبار سے متاثر ہوئے۔ ظفر نے یکے بعد دیگرے پانچ شعرا کی شاگردی اختیار کی تھی۔ ان کے پہلے استاد شاہ نصیر تھے۔

شاہ نصیر

شاہ نصیر کا پورا نام نصیر الدین اور تخلص نصیر تھا اور میر کلو عرف[۱۴] تھا۔ آزاد کا بیان ہے کہ ان کا رنگ سیاہی مائل تھا۔ اس رعایت سے ان کا نام میر کلو" پڑ گیا۔ شاہ نصیر میر محمدی مائل کے شاگرد تھے[۱۴] اور بہ قولِ آزاد ان کا سلسلہ میرزا رفیع سودا اور خواجہ میر درد دونوں تک پہنچتا ہے۔ آزاد لکھتے ہیں:

"یہ شاہ محمدی مائل کے شاگرد تھے اور وہ قیام الدین قائم کے۔ قائم نے سودا سے بھی اصلاح لی اور خواجہ میر درد سے بھی"۔ ۱۵

شاہ نصیر زیادہ تر سنگلاخ زمینوں میں شعر کہتے تھے۔ چوں کہ ظفر کے استادِ اوّل وہی تھے اس لیے ظفر کے ادبی مذاق کی تربیت میں ان کا دخیل ہونا قدرتی ہے یہی وجہ ہے کہ ظفر کے ابتدائی کلام پر شاہ نصیر کے رنگ کی کچھ کچھ چھاپ ہے۔ شاہ نصیر عجیب عجیب زمینیں نکالا کرتے تھے۔ وہ مہینے میں دو بار یعنی پندرہ اور انتیس تاریخ کو ایک محفلِ مشاعرہ منعقد کرتے تھے۔ شیفتہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ہنگامِ قیام جہاں آباد بتاریخِ پانزدہم و بست و نہم ہر ماہ محفلِ مشاعرہ منعقد می سازد و زمین ہائے سنگلاخ طرح می کند"۔ ۱۶

سرور نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"اکثر غزلیاتِ سنگلاخ بطورِ خود خوب گفتہ"۔ ۱۷

چناں چہ ان کی بعض طرحیں بہت مشہور ہوئیں، جیسے: 'فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں'۔

گاہ خدنگ و گاہ کماں، سرپہ طرّہ ہار گلے میں، وغیرہ ظفر کا کلیات اٹھائیے تو ان کے ہاں بھی بڑی بڑی عجیب زمینیں دیکھنے کو ملتی ہیں مثلاً: امکاں یہ نہ ہو وہ ہو" "اک اس میں کا اک اُس میں کا"، "نگہ الٹی سے سیدھی ہو"، "زمیں پہ گو ہر فلک پہ اختر" وغیرہ آزاد نے اگرچہ ظفر کے تمام سرمایے کو ذوق کے نام لکھ دیا ہے، لیکن اس حقیقت کا اعتراف انھوں نے بھی کیا ہے کہ ظفر زمین ایجاد کرنے کا بادشاہ تھا۔ چناں چہ آزاد لکھتے ہیں:

"..... والدِ مرحوم کہا کرتے تھے۔ بادشاہ تمھارا زمین کا بادشاہ ہے طرحیں خوب نکالتا ہے"۔ ۱۸

اگرچہ شاہ نصیر، ظفر کے پہلے استاد تھے لیکن حیرت کی بات ہے کہ قاسم، سرور، شیفتہ اور اشپرنگر ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں لکھا کہ شاہ نصیر کبھی ظفر کے استاد تھے یا دربارِ دہلی سے ان کا کوئی تعلق تھا۔ سب سے پہلے خوب چند ذکا نے عیار الشعرا[19] میں اس بات[20] کا ذکر کیا ہے کہ ظفر، شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ ذکا کے بعد نواب صدیق حسین خاں نے اپنے تذکرے طورِ کلیم[20] میں اور پھر آزاد نے آبِ حیات[21] میں شاہ نصیر کے استادِ ظفر ہونے کا ذکر کیا ہے۔ بہ ظاہر آزاد کے اس بیان کو تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی جب کہ اس امر کی تصدیق دوسرے ماخذوں سے بھی ہو رہی ہے اور پھر آزاد کا بیان زیادہ تر ایسے معاملات میں مشکوک ہو جاتا ہے جہاں وہ دو ایسے فریقوں کا موازنہ یا مقابلہ کر رہے ہوں جن میں سے کسی ایک کے ساتھ ان کی ہمدردیاں وابستہ ہوں۔ چناں چہ شاہ نصیر اور ذوق کے معرکوں میں وہ ذوق کے حامی نظر آتے ہیں اور انشا اور مصحفی کا جھگڑا ہو تو وہ انشا کے طرف دار دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن شاہ نصیر اور ظفر کے معاملے میں ان کی حیثیت ایک ایسے غیر جانب دار راوی کی سی ہے جہاں انھیں زیبِ داستاں کے لیے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔

عزت اللہ عشق

عزت اللہ عشق، حکیم قدرت اللہ قاسم، مولفِ مجموعۂ نغز کے بڑے لڑکے تھے

اور حکیم ثناء اللہ خاں فراقؔ کے شاگرد تھے۔ وہ اپنے والد سے بھی مشورۂ سخن کرتے تھے۔ شیفتہؔ کے الفاظ ان کے بارے میں یہ ہیں :

"عشقؔ تخلص، حکیم میر عزت اللہ، خلف الصدق حکیم قدرت اللہ قاسمؔ، از معتبرانِ دہلی است با راقم اتحادِ موفور دارد۔ اصلاحِ شعر از حکیم ثناء اللہ خاں فراقؔ گرفتہ و از والدِ ماجدِ خود نیز استفادہ کردہ در فنِ طب دستے بلند دارد۔ مردِ سنجیدہ و متین است و صاحبِ دیوان...." [۲۲]

شیفتہؔ کی عبارت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عشقؔ اپنے زمانے کے باصلاحیت شاعر اور معروف فرد تھے جس کی طرف شیفتہؔ نے اِن الفاظ میں اشارہ کیا کہ: "با راقم اتحادِ موفور دارد"۔ قاسمؔ نے بھی اِن کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے :

"حافظِ قرآنِ شریف، صاحبِ طبعِ ظریف، در فنِ طبابت یدِ طولیٰ دارد و بمطالعۂ مرض مسیحائیہا بروے کار آرد۔ از علومِ ضروریہ بقدرِ کفایت فایدہ یاب و بہرہ اندوز است۔" [۲۳]

عشقؔ کے استادِ ظفرؔ ہونے کا علم کم لوگوں کو ہے۔ چناں چہ تذکرۂ سرور، یادگارِ شعرا، گلشنِ بے خار، طبقات الشعرائے ہند اور عیار الشعرا میں سے کسی میں بھی اس طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ البتہ مجموعۂ نغز میں خود قاسمؔ نے عشقؔ کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے :

"برخوردار کام گار میر عزت اللہ عشقؔ مدعمرہٗ و زاد قدرہٗ کہ سر رشتۂ استادیِ ایں دودمانِ عالی شان (ظفرؔ) دارد، اکثر استفادہ می فرمایند۔" [۲۴]

خوب چند ذکاؔ نے یہ تو نہیں لکھا کہ عشقؔ، ظفرؔ کے استاد تھے لیکن اس امر کی طرف ضرور اشارہ کیا ہے کہ اکثر نوسبق ان سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ ذکاؔ لکھتے ہیں :

"اکثرے نوسبقاں استفادۂ اصلاح از و برداشتہ، سخنِ خود را زیب و رونق دادہ اند۔ انسانِ با مروت و پُر حیا و دوستِ یک رنگ و باوفا

است. بعمر شباب لیاقت وشائستگی بسیار دارد۔" ۲۵

حافظ محمود شیرانی نے بھی حکیم قدرت اللہ قاسم کے بیان کو باور کرتے ہوئے یہی نتیجہ نکالا ہے کہ عشق، ظفر کی غزلیات پر اصلاح دیا کرتے تھے. چناں چہ مجموعۂ نغز کے دیباچے میں انھوں نے ایک جگہ عشق کے سلسلے میں بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

" بہر حال استاد ذوق سے پیشتر عشق، ظفر کی غزلیات پر اصلاح دیا کرتے تھے۔" ۲۶

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عشق کس زمانے میں ظفر کے استاد رہے ہیں؟ اب تک جو معلومات ہمارے سامنے تھیں ان کی رو سے شاہ نصیر، ظفر کے استادِ اوّل تھے ان کے بعد میر کاظم حسین بے قرار اور پھر شیخ ابراہیم ذوق اور سب سے آخر میں غالب کا نام آتا ہے. اب اگر اس فہرست میں عزت اللہ عشق کا نام بھی شامل کریں تو قاعدے سے یہ شاہ نصیر کے بعد اور بے قرار سے پہلے آتے ہیں چناں چہ اسی ترتیب سے ظفر کے اساتذہ میں ان کا ذکر یہاں کیا جا رہا ہے. اس کی وجہ یہ ہے کہ عشق کے والد قدرت اللہ قاسم، شاہ نصیر کے والد شاہ غریب کے ہم عصر اور ہم عمر تھے اور شاہ نصیر ان کے سامنے کے بچے ہی تھے۔[۲۷] اس اعتبار سے عزت اللہ عشق اور شاہ نصیر کو لگ بھگ ہم عمر ہونا چاہیے قاسم کا تذکرہ ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) میں مکمل ہوا۔ آبِ حیات کی روایت کے مطابق یہ وہ زمانہ ہے جب شاہ نصیر دلی چھوڑ چکے تھے. آزاد لکھتے ہیں:

" جب عمل داری انگریزی ہوئی تو انھیں دکن کا سفر کرنا پڑا۔" ۲۸

دلی میں انگریزوں کی عمل داری ۱۲۱۸ھ (ستمبر ۱۸۰۳ء) میں ہوئی، گویا ۱۲۱۸ھ تک شاہ نصیر ہی ظفر کے استاد تھے اور جب وہ ۱۲۱۸ھ میں دکن چلے گئے تو عزت اللہ عشق، ظفر کے استاد مقرر ہوئے، جن کا ذکر بعد میں قاسم نے مجموعۂ نغز میں کیا جو ۱۲۲۱ھ میں مکمل ہوا.

میر کاظم حسین بے قرار

بے قرار کا ذکر بہت کم تذکرہ نگاروں نے کیا ہے. سرور نے ان کا ذکر کرتے

ہوئے صرف چند الفاظ رقم کیے ہیں، لیکن ان الفاظ سے اس امر کی وضاحت پھر بھی ہو جاتی ہے کہ وہ شاہ نصیر کے شاگرد تھے :

"بے قرار تخلص، مرزا کاظم علی، سیدِ صحیح النسب جوانے است مودّب شاگردِ میاں نصیر الدین. کلامش رنگین و سخنش دل چسپ۔" ۲۹

قاسم نے بے قرار کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :

"بے قرار تخلص، میرزا کاظم حسین المعروف میر قمرو، ہمشیرزادۂ سید رضی خاں بہادر صلابت جنگ است۔ وے جوانِ خوش خو، نیک رو نہایت با ادب، بسیار مہذب است، مشقِ سخن از محمد نصیر الدین نصیر می کند۔" ۳۰

نساخ نے بھی سخنِ شعرا میں بے قرار کا ذکر میر قمرو کے نام سے کیا ہے اور انھیں شاگردِ شاہ نصیر بتایا ہے۔[۳۱] آزاد نے اُن کے عرف میر قمرو کا ذکر نہیں کیا وہ لکھتے ہیں :

"میر کاظم حسین نام ایک اُن (ذوق) کے ہم سن، ہم سبق تھے کہ نواب سید رضی خاں کے بھانجے تھے۔ بے قرار تخلص کرتے تھے اور حافظ غلام رسول ہی سے اصلاح لیتے تھے۔" ۳۲

آزاد نے بے قرار کے استادِ ظفر ہونے کے متعلق لکھا ہے :

"شاہ نصیر مرحوم کہ ولی عہد کی غزل کو اصلاح دیا کرتے تھے دکن چلے گئے۔ میر کاظم حسین ان کی غزل بنانے لگے۔" ۳۳

بظاہر تو یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ جب شاہ نصیر دکن کے لیے روانہ ہونے لگے تو انھوں نے اپنی جگہ اپنے شاگرد میر کاظم حسین خاں بے قرار کو ولی عہد بہادر یعنی ظفر سے متعارف کرا دیا اور اس طرح شاہ نصیر کے بعد بے قرار، ظفر کے استاد مقرر ہو گئے، لیکن اگر بے قرار کا استادِ ظفر ہونا شاہ نصیر کے فوراً بعد مان لیا جائے تو پھر عزت اللہ عشق کے استادِ ظفر ہونے کے زمانے کا تعین نہیں ہو سکتا۔ عزت اللہ عشق کے استادِ ظفر ہونے کا ذکر مجموعۂ نغز میں موجود ہے جس کا سالِ تکمیل ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) ہے

مجموعۂ نغز میں ذوق کے استادِ ظفر ہونے کا ذکر نہیں۔ آزاد نے آبِ حیات میں یہ بھی لکھا ہے، جس کا ذکر آگے تفصیل سے آئے گا، کہ بے قرار کے سندھ چلے جانے کے بعد ذوق، ظفر کو اصلاح دینے لگے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ شاہ نصیر کے بعد عزت اللہ عشق اور ان کے بعد یعنی ذوق سے پہلے میر کاظم حسین بے قرار، ظفر کے استاد مقرر ہوئے۔

ذوق

آزاد کے بیان کے مطابق جب میر کاظم حسین بے قرار، جان الفنسٹن کے میر منشی ہو کر سندھ چلے گئے تو ظفر کو ذوق اصلاح دینے لگے:

"انھی دنوں جان الفنسٹن صاحب بہادر، شکارپور سندھ وغیرہ سرحدات سے لے کر کابل تک عہد نامہ کرنے کو چلے۔ انھیں ایک میر منشی کی ضرورت ہوئی..... میر کاظم حسین نے اس عہدے پر سفارش کے لیے ولی عہد سے شقہ چاہا .... اور وہ چلے گئے۔ چند روز بعد ایک دن شیخ مرحوم جو ولی عہد کے ہاں گئے تو دیکھا کہ تیر اندازی کی مشق کر رہے ہیں۔ انھیں دیکھتے ہی شکایت کرنے لگے کہ میاں ابراہیم، استاد تو دکن گئے، میر کاظم حسین ادھر چلے، تم نے بھی ہمیں چھوڑ دیا۔ غرض اس وقت ایک غزل جیب سے نکال کر دی کہ ذرا اسے تو بنا دو۔ یہ وہیں بیٹھ گئے اور غزل بنا کر سنائی۔ ولی عہد بہادر بہت خوش ہوئے....... چناں چہ شیخ مرحوم ولی عہد کے استاد ہو گئے۔"[۳۴]

ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی تحقیق کے مطابق ذوق کی ولادت ۱۲۰۳ھ[۳۵] (۸۹-۱۷۸۸ء) میں ہوئی۔ گویا مجموعۂ نغز کی تکمیل (۱۲۲۱ھ) کے وقت ذوق کی عمر اٹھارہ سال تھی اور ان کا شمار نو عمر شعرا میں ہوتا تھا۔ قلعے سے اس وقت تک ان کا تعلق قائم نہیں ہوا تھا۔ قاسم کا بیان ہے:

"ذوق تخلصے، نو مشق است۔ از شاگردانِ محمد نصیر الدین نصیر کہ گاہ گاہ در مجلسِ شعرا حاضر می شود۔ غزلِ طرحی ہم سرانجام می دہد۔"[۳۶]

ذوق کے دربارِ دہلی سے متوسّل ہونے کا ثبوت پہلے پہل اس قصیدے سے ملتا ہے جسے انھوں نے شہزادہ جہاں گیر کے جشنِ کتخدائی کے موقعے پر پیش کیا تھا۔ قصیدے کے ایک شعر میں انھوں نے قصیدے کی تاریخ بھی نکالی تھی۔ وہ شعر یہ ہے:

کہو سرِ لب بستہ سے، شادیِ فرزند
۳۲
"مبارک آپ کو ہوا ہے شہِ سپہر وقار"

۱۱۹۳ + ۳۲ = ۱۲۲۵

خیال یہ ہے کہ ذوق ۱۲۲۱ھ اور ۱۲۲۵ھ کے درمیان کسی وقت دربارِ شاہی سے متوسّل ہوئے ہوں گے۔ تنویر علوی صاحب نے ذوق کے دربارِ دہلی سے متوسّل ہونے کے سلسلے میں دہلی اردو اخبار کے حوالے سے لکھا ہے کہ ذوق اُنیس برس کی عمر میں دربارِ ولی عہدی میں باریاب ہوئے۔[۳۷] ذوق کے سالِ پیدائش میں اُنیس جوڑ دینے سے ۱۲۲۲ھ برآمد ہوتا ہے۔ مجموعۂ نغز چوں کہ ۱۲۲۱ھ ہی میں مکمل ہو چکا تھا اس لیے اُس میں ذوق کے دربارِ دہلی سے متوسّل ہونے کا ذکر نہیں۔ پھر بھی یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے ظفر کے کلام پر کب سے اصلاح دینی شروع کی۔ مالک رام صاحب نے لکھا ہے کہ "ذوق ۱۸۰۸ء سے استادِ ظفر تھے"[۳۸] لیکن انھوں نے اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا۔ صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ ۱۲۴۰ھ (۲۵-۱۸۲۴ء) اور ۱۲۴۸ھ (۳۳-۱۸۳۲ء) کے درمیانی عرصے میں ذوق کو اکبر شاہ ثانی کے عہدِ سلطنت اور ظفر کے زمانۂ ولی عہدی میں "خاقانیِ ہند" کا خطاب ملا اور ظفر کے تخت نشین ہونے کے بعد انھیں "ملک الشعرا" کے خطاب سے نوازا گیا۔ ذوق تادمِ آخر دربار سے متوسّل رہے۔ [ذوق کا انتقال ۲۴ صفر ۱۲۷۱ھ (۱۹ نومبر ۱۸۵۴ء) جمعرات کے دن صبح کے وقت ہوا تھا۔][۳۹]

غالب

غالب اگرچہ ظفر کے استاد تو ذوق کی وفات کے بعد ہی ہوئے لیکن قلعۂ معلّا سے ان کا تعلّق اس سے پہلے ہی قائم ہو چکا تھا۔ مولانا فخرالدین کے پوتے مولانا نصیرالدین عرف میاں کالے صاحب، بہادر شاہ ظفر کے پیر تھے اور ظفر ان کا بہت

احترام کرتے تھے۔ کالے صاحب، غالب کے مربی اور مہربان تھے۔ ان کے علاوہ بادشاہ کے طبیب خاص، احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں بھی میرزا کے قدرداں تھے انھی دونوں حضرات کی کوششوں سے غالب ۲۲ رشعبان ۱۲۹۹ھ (۴ار جولائی ۱۸۵۰ء) کو بادشاہ کے حضور میں پیش ہوئے۔ بادشاہ نے انھیں "نجم الدولہ دبیرالملک نظام جنگ" کے خطابات عطا کیے۔ انھیں چھے پارچے اور تین رقم جواہر کا خلعت پہنایا گیا اور پچاس روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ اس طرح غالب باقاعدہ قلعے کے ملازم ہو گئے۔ اور فارسی زبان میں خاندانِ تیموریہ کی تاریخ لکھنے کا کام ان کے سپرد ہوا۔[۱۴]

قلعے کے دستور کے مطابق غالب کو تنخواہ ہر ششماہی کے خاتمے پر ملا کرتی تھی لیکن غالب کی ضروریات اس درجہ بڑھی ہوئی تھیں کہ انھیں اس اثنا میں قرض لے کر گزارا کرنا پڑتا تھا۔ اس طرح غالب کی تنخواہ کا ایک بڑا حصہ مہاجن کی نذر ہو جایا کرتا تھا۔ انھی پریشانیوں سے تنگ آ کر غالب نے بادشاہ کی خدمت میں درخواست پیش کی کہ ان کی تنخواہ ماہ بہ ماہ کی جاتے۔[۱۴]

۱۸۵۴ء میں بادشاہ کے فرزند اکبر فتح الملک مرزا غلام فخرالدین عرف مرزا فخرو غالب کے شاگرد ہوئے۔ اسی سال ۱۶ر نومبر کو ذوق کا انتقال ہوا اور شاہ ظفر، مرزا غالب سے اصلاح لینے لگے۔ یہ سلسلہ ۱۸۵۷ء تک جاری رہا جس کے بعد بہادر شاہ ظفر معزول کر کے رنگون بھیج دیے گئے۔

ظفر کی شاعری پر ان پانچ استادوں میں سے تین استادوں کا اثر کم و بیش کی نسبت کے ساتھ پڑا ہے۔ اس لیے کہ یہ تینوں استاد یعنی شاہ نصیر ذوق اور غالب اپنی اپنی طرز کے بادشاہ تھے اور دلی میں ان میں سے ہر ایک کا تعلق ایک مخصوص مکتبۂ فکر سے تھا۔ عزت اللہ عشق اور میر کاظم حسین بے قرار کے اثرات ظفر کی شاعری میں تلاش کرنے کے کوئی معنی اس لیے نہیں ہیں کہ یہ دونوں شاعر نہ صرف یہ کہ غیر معروف تھے بلکہ ان کا کوئی مخصوص رنگِ سخن بھی نہیں تھا۔ لال قلعے کی ادبی صحبتیں، شاہ عالم ثانی آفتاب کی بنیادی تربیت، شاہ نصیر ذوق اور غالب جیسے استادانِ فن سے مشورۂ سخن، ان تمام چیزوں نے مل کر یقیناً ظفر کے مذاقِ سخن کو نکھارا ہے لیکن یہ بات واضح کر دی جائے کہ جہاں تک طرزِ سخن کا تعلق ہے، وہ ظفر کا اپنا تھا جس میں ان کی شاعرانہ انفرادیت پوری طرح جھلکتی ہے۔

حواشی ادبی پس منظر

۱۔ غدر کے صبح و شام، ص ۲۰

۲۔ مجموعۂ نغز جلد اول، ص ۱۸

۳۔ انتخاب ناسخ، ص ۱۱۶

۴۔ ذوق، سوانح اور انتقاد ص ۳۹۱

۵۔ ملاحظہ ہو اس کتاب کے باب 'تصانیف' کا اقتباس متعلقہ حاشیہ ۱ؔ

۶۔ ریاض الفصحا، ص ۳۳۷

۷۔ انتخابِ ناسخ، ص ۱۸

۸۔ تاریخِ اودھ، جلد چہارم

۹۔ انتخابِ ناسخ، ص ۶۲ تا ۶۳

۱۰۔ مجموعۂ نغز، جلد دوم، ص ۲۷۳

۱۱۔ آبِ حیات، ص ۴۱۴

۱۲۔ (الف) مجموعۂ نغز، جلد دوم، ص ۲۷۲

(ب) عمدۂ منتخبہ، ص ۷۵۲

(ج) تذکرۂ نادر، ص ۱۹۵

۱۳۔ آبِ حیات، ص ۴۰۲

۱۴۔ (الف) عمدۂ منتخبہ، ص ۷۵۲

(ب) مجموعۂ نغز، جلد دوم، ص ۲۷۲

۱۵۔ آبِ حیات، ص ۴۰۳

۱۶۔ گلشنِ بے خار، ص ۲۲۰

۱۷۔ عمدۂ منتخبہ، ص ۷۵۲

۱۸۔ آبِ حیات، ص ۴۱۹

۱۹۔ عیار الشعرا، ص ۲۴۲

۲۰۔ طورِ کلیم، ص ۹۷

۲۱۔ آبِ حیات، ص ۴۱۹

۲۲۔ گلشنِ بے خار، ص ۱۲۴ تا ۱۲۵

۲۳۔ مجموعۂ نغز، جلد اول، ص ۳۸

۲۴۔ مجموعۂ نغز، جلد اول، ص ۳۰۳

۲۵۔ عیار الشعرا، ص ۲۵۸

۲۶۔ مجموعۂ نغز، جلد اول، ص ۱

۲۷۔ مجموعۂ نغز، جلد دوم، ص ۲۷۳

۲۸۔ آبِ حیات، ص ۴۰۳

۲۹۔ عمدۂ منتخبہ، ص ۱۴۸

۳۰۔ مجموعۂ نغز، جلد اول، ص ۱۲۷

۳۱۔ سخنِ شعرا، ص ۲۷

۳۲۔ آبِ حیات، ص ۴۳۸

۳۳۔ آبِ حیات، ص ۴۴۱

۳۴۔ آبِ حیات، ص ۴۴۱ تا ۴۴۲

۳۵۔ ذوق، سوانح اور انتقاد، ص ۲۳ تا ۲۵

۳۶۔ مجموعہ نغز، جلد دوم، ص ۳۸۵

۳۷۔ ذوق، سوانح اور انتقاد، ص ۴۵

۳۸۔ ذکرِ غالب، ص ۸۹

۳۹۔ ذوق، سوانح اور انتقاد، ص ۱۱۷

۴۰۔ غالب خود مورخ نہیں تھے۔ غالب کو تاریخی مواد دربار سے فراہم ہوتا تھا جسے وہ اپنی نثر میں قلم بند کرتے تھے۔ اس سلسلے میں مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر محمد اشرف کا مضمون، غالب اور مغل شاہانِ دہلی کا تاریخی نظریہ، مطبوعہ اردوئے معلّا، غالب نمبر، حصہ اول، دہلی یونیورسٹی

۴۱۔ اسی سلسلے میں غالب نے وہ مشہور قطعہ نظم کیا تھا جس کا عنوان ہے "گزارشِ مصنف، بحضورِ شاہ"

اس قطعے کے چند شعر اس طرح ہیں:

میری تنخواہ جو مقرر ہے — اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مردے کی چھے ماہی ایک — خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات — اور چھے ماہی ہو سال میں دو بار
بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض — اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا — ہو گیا ہے شریک ساہوکار

. . . .

میری تنخواہ کیجے ماہ بہ ماہ — تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

تصانیف

بہادر شاہ ظفرؔ علم دوست تھے اور علم سے بہرہ ور بھی تھے۔ وہ لال قلعے میں پیدا ہوئے اور ان کی تمام تر تعلیم و تربیت لال قلعے ہی میں ہوئی۔ اردوے مُعلّا کا تصوّر اب بھی قلعۂ مُعلّا سے وابستہ تھا۔ قلعۂ مُعلّا کے دستور کے مطابق انھوں نے فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ ان کے کلیات میں برج بھاشا اور پنجابی میں بھی کچھ اشعار ملتے ہیں اور اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ ان زبانوں سے بھی کچھ نہ کچھ واقفیت رکھتے تھے۔ ان کی شعری تصانیف ایک ضخیم کلیات پر مشتمل ہیں جس میں لگ بھگ بیس ہزار اشعار ہیں۔ ظفرؔ کی شخصیت اور ان کی شاعری پر تصوّف کی گہری چھاپ ہے چناں چہ انھوں نے شاعری میں بھی بیشتر جگہ تصوّف کو موضوعِ سخن بنایا ہے اور نثر میں بھی ایک ضخیم کتاب تصوّف کے موضوع پر یادگار چھوڑی ہے جو فارسی میں ہے۔ شاعری میں اُن کی محبوب صنفِ سخن غزل ہی ہے۔ یوں تو انھوں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن یہ صرف قادرالکلامی کے جوہر دکھانے کے لیے تھا۔ جہاں تک ان کی فن کارانہ انفرادیت کا تعلق ہے وہ ان کی غزلوں ہی میں نکھر کر آتی ہے۔ غزلوں کے علاوہ انھوں نے مُستزاد، مخمّس، مثلّث، مسدّس، تضمین، قصیدہ، سلام، مرثیہ، مجرا، شہر آشوب، رباعی، قطعہ، سہرا، پنکھا، گیت، بھجن، ہولی، ٹھمری اور دوہے سبھی کچھ کہا ہے لیکن سب سے زیادہ کمال ان کو غزل ہی میں حاصل ہے۔ یہاں ہم ظفرؔ کی تصانیف کا علاحدہ علاحدہ

جائزہ لیں گے۔

کلیات

بہادر شاہ ظفر کی شعری تصانیف میں چار دیوان یادگار ہیں۔ عبدالغفور نسّاخ نے اُن کے بارے میں لکھا ہے:

"شعر نہایت شیریں اور نمکین کہتے تھے، چار دیوان ان کے نظر سے گزرے۔" ۱

نواب صدیق حسین خاں نے بھی ان کے دواوین کی تعداد چار ہی بتائی ہے اور لکھا ہے:

" بعدِ وفاتِ ذوق خدمتِ استادی بہ میرزا غالب متعلق گشت وے را چہار دیوان است۔" ۲

منشی جگ ناتھ پرشاد لکھتے ہیں:

" آپ کا کلام نہایت سادہ سلیس اور روزمرّہ اردو کا نمونہ ہے چار دیوان موجود ہیں۔" ۳

امیر احمد علوی نے اپنی کتاب 'بہادر شاہ ظفر' میں بغیر کسی ماخذ کی نشان دہی کیے یہ لکھا ہے کہ مشہور ہے کہ بادشاہ کے پانچ دیوان تھے اور یہ کہ پانچواں دیوان ۱۸۵۷ء کے پُرآشوب زمانے میں ضائع ہوگیا۔۴ ظفر کے پانچویں دیوان کا تذکرہ اور کہیں نہیں ملتا۔ موجود دیوان اس وقت چار ہی ہیں۔ یہ چاروں دیوان پہلی بار لال قلعے کے مطبع سلطانی سے شائع ہوئے تھے۔ رضا لائبریری رام پور میں 'دیوانِ اوّل' اور 'دیوان ثانی' کا ایک ایک نسخہ موجود ہے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

'دیوان اوّل'۵

مطبع سلطانی سے ظفر کا پہلا دیوان ۹ جلوس مُعلّا یعنی ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۵ء میں طبع ہوا۔ یہ دیوان شیخ ابراہیم ذوق کے زمانۂ شاگردی سے پہلے ترتیب دیا جا چکا تھا جس کی نشان دہی ظفر کے اس قطعۂ تاریخ سے ہوتی ہے جو انھوں نے اس دیوان کی تکمیل کے موقعے پر کہا تھا۔ یہ قطعہ دیوان میں موجود ہے اور اس سے جو تاریخ

نکالی گئی ہے وہ ۱۲۲۴ھ ہے۔ قطعہ یہ ہے:

یہ دیواں رشکِ گلشن کیوں نہ ہو گلہائے مضموں سے
کہ اس کا جو ورق ہے سو خیابانِ معانی ہے
ظفر یہ بے تامل مصرعِ تاریخ لکھ اس پر
مرا اب یک قلم دیوانِ بستانِ معانی ہے

دیوان کا سائز ۷ × ۱۱ ½ ہے اور یہ آٹھ سو چوراسی صفحات پر مشتمل ہے۔ آخر میں نو صفحات کا ایک اغلاط نامہ بھی ہے۔ اغلاط نامے کے صفحات کا شمار علاحدہ ہے۔ دیوان کا کاغذ نفیس، کتابت کشادہ اور واضح، قلم جلی اور طباعت آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن کے انداز کی ہے۔ بظاہر دیکھنے میں یہ دیوان قلمی معلوم ہوتا ہے چناں چہ نذیریہ پبلک لائبریری، دہلی میں اس دیوان کا ایک نسخہ غلطی سے قلمی کتابوں میں شامل ہے یہ نسخہ ناقص الاول و آخر ہے۔ دیوان روایت کے خلاف دائیں جانب سے شروع ہوتا ہے جو اگرچہ قاعدے کے مطابق صفحہ ۲ ہے لیکن اس پر صفحہ ۱ چھپا ہوا ہے۔ آگے چل کر یہ غلطی اس طرح سے درست کی گئی ہے کہ صفحہ ۳ کے بعد اگلے صفحے پر صفحہ ۵ چھاپ دیا ہے۔ یہ دیوان اس غزل سے شروع ہوتا ہے:

مقدور کس کو حمدِ خدائے جلیل کا
اس جا پہ بے زباں ہے دہنِ قال و قیل کا

اس غزل کے بعد، جو اصل میں حمد ہے، اگلے صفحے پر وہ نعت ہے جو بعد کے مطبوعہ نسخوں میں مذکورہٴ بالا غزل سے پہلے شامل کی گئی ہے، اس نعت کا مطلع یہ ہے:

اے سرورِ دو کون و شہنشاہِ ذوالکرم
سرخیلِ مرسلین و شفاعت گرِ اُمم

اس دیوان کے سرورق پر نواب کلب علی خاں والیِ رام پور کی یہ خطی تحریر بھی موجود ہے:

" نسخہٴ ہٰذا بتاریخ بستم رجب ۱۲۶۵ھ زجائے بطریقِ تحفہ

نزدِ عاصی محمد کلب علی آمد۔ ہرگز نرفت بر من سرورے بالا تراز دیے کہ ایں نسخۂ بہاریں یافتم۔"

احسن الاخبار کی ایک خبر کے مطابق بہادر شاہ ظفر کا اردو دیوان ۱۸۴۵ء میں مطبع سید الاخبار و سراج الاخبار سے شائع ہوا تھا۔ تلاش کے باوصف اس نسخے کا سراغ نہیں مل سکا۔ تاہم مطبع سلطانی سے شائع ہونے والے 'دیوانِ اوّل' کا سالِ اشاعت بھی چونکہ یہی ہے اس لیے عین ممکن ہے کہ یہ دونوں اشاعتیں ایک ہی ہوں۔ دیوان کی جو کیفیت خبر میں بتائی گئی ہے وہ بھی مطبع سلطانی کی اشاعت سے ہی ملتی جلتی ہے۔ خبر یہ ہے:

"بادشاہ سلامت کا اردو دیوان مرتب ہو کر مطبع سید الاخبار و سراج الاخبار میں چھپ گیا ہے۔ خط نستعلیق ہے اور کاغذ ولایتی ہے کل جز ۲۶ ہیں اور ہر صفحے میں سولہ سطریں ہیں چمڑے کی جلد بھی بنائی گئی ہے۔ آٹھ روپے میں فروخت ہوتا ہے صاحبانِ ذوق کلام الملوک ملوک الکلام کا لطف اٹھانا چاہیں تو دونوں مطبعوں میں جس مطبعے سے چاہیں طلب فرمائیں۔" ۲۴ اکتوبر ۱۸۴۵

'دیوانِ ثانی'

'دیوانِ ثانی'، 'دیوانِ اوّل' کے مقابلے میں کاغذ، کتابت اور طباعت ہر اعتبار سے کم تر ہے۔ اس کا سائز بھی 'دیوانِ اوّل' کے ۷" × ۱۱½" کے مقابلے میں ۶½" × ۱۰¼" ہے ضخامت کے اعتبار سے بھی یہ دیوان 'دیوانِ اوّل' کے مقابلے میں نصف ہے۔ اس دیوان کے کل صفحات چار سو پینتالیس ہیں۔ یہ دیوان ۱۳ جلوس معلّٰی یعنی ۱۲۶۷ھ مطابق ۵۰-۱۸۴۹ء میں طبع ہوا۔ اس دیوان کے ساتھ بھی اغلاط نامہ شامل ہے۔ اغلاط نامے کے سولہ صفحات علاحدہ ہیں۔ اس دیوان کی کتابت نثار علی نامی کسی خوش نویس نے کی ہے جس کا پتا خاتمے کی عبارت کے ان الفاظ سے چلتا ہے:

"چہارم صفر المظفر ۱۲۶۷ھ از خطِ خادم فقیر پُر تقصیر سراپا گنہ گار امیدوار بمغفرتِ پروردگار، نثار علی نثار پیرایۂ اختتام پوشید۔"

دیوانِ حضورِ والا

ظفر کے 'دیوانِ اوّل' میں، جو مطبع سلطانی سے ۱۸۴۵ء میں شائع ہوا تھا اور جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، طباعت کی بہت سی غلطیاں تھیں۔ اس بات کا اندازہ نو صفحات کے اس اغلاط نامے سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو مذکورہ دیوان کے آخر میں شامل ہے۔ انھی اغلاط کی بِنا پر ظفر شاید اس دیوان سے خوش نہیں تھے۔ چناں چہ 'دیوانِ اوّل' کا دوسرا ایڈیشن، جس کی تصحیح ذوق کے ہاتھوں ہوئی، دہلی اردو اخبار پریس سے دوبارہ شائع ہوا۔ اس دیوان کا ایک نسخہ اس وقت میرے سامنے موجود ہے جو ناقص الآخر ہے اور واو کی ردیف کے درمیان ختم ہو جاتا ہے، اس لیے یہ پتا نہیں چلتا کہ اس دیوان کا سالِ طباعت کیا ہے۔ دیوان کے پہلے صفحے پر، جلی حروف میں، دیوان کا نام 'دیوانِ حضورِ والا' چھپا ہوا ہے۔ اسی صفحے پر نیچے ایک نثری عبارت ہے۔ یہ عبارت تمام و کمال اپنے اصل املا کے ساتھ اس طرح سے ہے:

"یہہ دیوانِ اول مطبع سلطانی میں چھپا تھا مگر اکثر جگہہ صحت کو نہ پہونچا تھا سو اب مکرر بتصحیح جناب افصح الفصحا ابلغ البلغا خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم صاحب ذوق دام برکاتہم باہتمام بندۂ خاکسار پنڈت موتی لعل پرنٹر و پبلشر مطبع دہلی اُردو اخبار مکانِ مولوی محمد باقر صاحب میں چھاپا یہ ہوا۔" ۱۱

یہ دیوان بھی مطبعِ سلطانی سے شائع ہونے والے 'دیوانِ اوّل' کی طرح دائیں جانب سے شروع ہوتا ہے جو دیوان کا صفحہ ۲ ہے۔ اور یہی نمبر دیوان کے صفحہ پر چھپا ہوا بھی ہے مطبع سلطانی کے 'دیوان اوّل' کی طرح یہ دیوان بھی اسی حمد سے شروع ہوتا ہے جس کا مطلع مطبعِ سلطانی کے 'دیوانِ اوّل' کے ضمن میں پہلے پیش کیا جا چکا ہے۔ اس کے بعد اس دیوان میں بھی حمد کے بعد وہی نعت شامل ہے جو مطبعِ سلطانی والے نسخے میں ہے۔

مطبعِ سلطانی سے ظفر کا 'دیوان ثانی'، ۱۸۴۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس دیوان کا معیارِ صحت دیوان اوّل سے بھی زیادہ پست دکھائی دیتا ہے۔ اگرچہ یہ دیوان اپنی

ضخامت کے اعتبار سے دیوانِ اوّل کے مقابلے میں نصف ہے لیکن اس کے آخر میں جو اغلاط نامہ شامل ہے وہ سولہ صفحات پر مشتمل ہے جبکہ دیوانِ اوّل کا اغلاط نامہ صرف نو صفحات کا تھا۔ اس صورتِ حال سے 'دیوانِ حضور والا' کے سالِ طباعت کے بارے میں قیاس آرائی کا موقع ملتا ہے۔ امکان یہ ہے کہ 'دیوانِ حضور والا' کی طباعت اس وقت عمل میں آئی جبکہ مطبع سلطانی سے ظفر کے چاروں دیوان چھپ چکے تھے۔

ظفر کے 'دیوان اوّل' مطبوعہ ۱۸۴۵ء اور 'دیوان ثانی' مطبوعہ ۵۰-۱۸۴۹ء کے درمیان پانچ سال کا وقفہ ہے۔ ہو سکتا ہے مطبع سلطانی سے ظفر کے بقیہ دو دواوین یعنی 'دیوانِ ثالث' اور 'دیوانِ چہارم'، کے چھپنے میں دو چار سال اور لگے ہوں اور اس کے بعد ہی ظفر کو یہ خیال آیا ہو کہ یہ چاروں دواوین صحت کے ساتھ دوبارہ چھپنے چاہئیں۔ اس طرح دواوین کی تصحیح کا کام ذوق کے سپرد ہوا جس کے نتیجے میں پہلا دیوان 'دیوانِ حضور والا'، کے نام سے دہلی اردو اخبار سے چھپا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد ذوق نے بقیہ تین دواوین کی یا ان میں سے ایک دو کی تصحیح اور کی ہو اور وہ بھی چھپ گئے ہوں۔ لیکن اس کا کوئی ریکارڈ دستیاب نہیں ہے۔ زیادہ تر امکان یہی ہے کہ بقیہ دواوین کی صحت اور طباعت کی نوبت ہی نہ آئی ہو، اس لیے کہ ۱۸۵۴ء میں تو ذوق کا انتقال ہی ہو گیا تھا۔ قیاس کہتا ہے کہ 'دیوانِ حضور والا' ۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۴ء کے درمیان طبع ہوا ہوگا۔

مطبع سلطانی سے شائع ہونے والے ظفر کے چاروں دواوین اور 'دیوانِ حضور والا'، کے علاوہ ظفر کا کوئی دیوان ظفر کی نگرانی میں یا ان کے سامنے نہیں چھپا، ظفر کے بقیہ تمام دواوین ۱۸۵۷ء کے بعد کے ہی چھپے ہوئے ہیں جن کی تفصیل آگے بیان کی جا رہی ہے۔

دیوانِ ظفر معہ انتخاب لاجواب[12]

۱۸۵۷ء کے بعد ظفر کے 'دیوان ثانی' کا ایک نسخہ لکھنؤ پہنچا اور شیخ قادر بخش نے اسے اپنے مطبع اودھ گزٹ سے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔ شیخ قادر بخش

کو ظفر کے دیوانِ اوّل کا کوئی نسخہ دستیاب نہ ہو سکا البتہ اس دیوان کی جو چند غزلیں مل سکیں انھیں 'انتخابِ لاجواب' کے عنوان سے دیوان کے آخر میں ضمیمے کے طور پر شامل کر دیا۔ اس دیوان کا سائز بھی وہی رکھا گیا جو مطبع سلطانی کے 'دیوان ثانی' کا تھا۔ ½۶" x ½۱۰" سائز کا یہ دیوان ایک سو ننانوے صفحات پر مشتمل ہے 'انتخاب لاجواب' کے صفحات اس کے علاوہ ہیں۔ دیوان کے کل صفحات دو سو چالیس ہیں۔ دیوان کے آخر میں مندرجۂ ذیل عبارت موجود ہے جس سے تاریخ طباعت معلوم ہوتی ہے:

"بتاریخ ہفتم شہرِ ذیقعد ۱۲۷۷ھ مطابق بست و نہم ماہ مئی ۱۸۶۱ء بحسن اہتمام برگزیدۂ انام جناب شیخ قادر بخش صاحب مینجر سلمہ الاکبر مطبع اودھ گزٹ لکھنؤ در کوٹھی غلام حسین واقع محلہ سیس گنج طبع گردید"۔

دیوانِ ظفر مطبع احمدی امّو جان[۳]

مطبعِ احمدی سے ظفر کے چاروں دیوان ایک ساتھ شائع ہوئے۔ اس اشاعت میں ہر دیوان کے آخر میں نثر خاتمہ الگ الگ ہے۔ ان میں سے پہلے اور دوسرے دیوان کی عبارت مطبعِ سلطانی کے 'دیوانِ اوّل' اور 'دیوانِ ثانی' کے خاتمے کی عبارت کے مطابق ہے البتہ جہاں سالِ طباعت اور ناشر کا ذکر ہے وہاں عبارت میں فرق ہے اور وہ اس لیے کہ یہ دواوین بعد میں شائع ہوئے اور ان کے کاتب اور ناشر بھی مختلف تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مطبعِ احمدی کے دواوین مطبع سلطانی کے دواوین کی نقل ہیں۔ مطبعِ سلطانی کے 'دیوان ثالث' اور 'دیوانِ چہارم' میری نظر سے نہیں گزرے لیکن قیاس ہے کہ 'دیوان ثالث' کے خاتمے پر بھی صرف آخری سطور میں ذرا سی ترمیم کے ساتھ وہی عبارت ہوگی جو مطبعِ احمدی کے دیوانِ سوم کے خاتمے پر موجود ہے۔ دیوان سوم کے خاتمے پر جو عبارت ملتی ہے وہ اس طرح ہے:

"ایں دیوانِ فیض بنیاد کہ ہر مصرعِ برجستہ اش چوں زلف

خوبان و ہر بیتِ شگفتہ اش بسانِ بیتِ ابروِ محبوبان، ریختۂ طبعِ وقاد و نتیجۂ فکرِ نقاد حضرت ظلِ سبحانی، چراغِ شبستانِ گورگانی، نورِ بصر صاحب قرانی، شہنشاہِ دین پناہ محمد ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ بادشاہ غازی، خلد اللہ ملکہ، وسلطنتہ، وافاض العالمین برو احسانہ، بخطِ خام الف با تا خوانِ مکتبِ نادانی، خادمِ اربابِ علم و معانی، معصیت آمود محمد مقصود بتاریخ دوازدہم شہر ذی قعدہ ۱۲۷۰ھ روز دوشنبہ در مطبع احمدی واقع دلہائی ضلع میرٹھ حلیۂ اختتام پوشید۔" ۱۳

مطبعِ احمدی کے دیوانِ چہارم کے آخر میں جو عبارتِ نثر دی گئی ہے وہ مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی پتا دیتی ہے کہ یہ عبارت وہ نہیں ہے جو مطبع سلطانی کے دیوانِ چہارم کے آخر میں دی گئی ہوگی، اس لیے کہ یہ مختصر عبارت تمام و کمال مطبعِ احمدی کی اشاعت ہی سے متعلق ہے۔ عبارت اس طرح ہے:

"باہتمام کج مج زبان، ہیچمدان، امیدوارِ مغفرتِ یزدان، اتو جان وسعی و کوششِ بے پایان محمد حسین خاں صاحب الرحمٰن مہتمم مطبعِ مصطفائی دہلی وبہ تصحیح و مقابلہ حسن خاں صاحب در مطبع احمدی واقع شاہدرہ دلہائی ضلع میرٹھ بتاریخ بست و چہارم ذی قعدہ ۱۲۷۸ ہجری رونقِ انطباع یافت"۱۴

جیسا کہ مندرجۂ بالا عبارت سے پتا چلتا ہے مطبع احمدی کی اس اشاعت میں مطبعِ مصطفائی دہلی کے مہتمم محمد حسین صاحب کی بے پایاں سعی و کوشش کا بھی دخل تھا۔ ۱۵

کلیاتِ ظفر نول کشور

۱۸۶۹ء میں منشی نول کشور نے اس کلیات کو اپنے مطبعے سے شائع کیا۔ مطبع نول کشور سے کلیاتِ ظفر کا پانچواں ایڈیشن ۱۹۱۸ء میں طبع ہوا اور اب عام طور پر یہی دستیاب ہے۔ پانچویں ایڈیشن سے پہلے کلیاتِ ظفر کا ایک سابقہ ایڈیشن نول کشور پریس سے ۱۸۸۶ء میں شائع ہوا تھا جس کا پتا پانچویں ایڈیشن کے اختتام کی اس

عبارت سے چلتا ہے:

"قطعۂ تاریخ طبع سابق نتیجۂ فکر، مورخ بے مثال شاعرِ باکمال منشی بھگوان دیال مرحوم و مغفور۔

ہر غزل ہے کس بلاغت سے بھری
پُر فصاحت ہے یہ کتنا کلیات
بکھو عاقل عیسوی تاریخ طبع
کیسا عمدہ ہے ظفر کا کلیات" [16]
۱۸۸۷ عیسوی

خیابانِ تصوّف

ظفر کو تصوّف سے گہری دل چسپی تھی اور وہ خود بھی صوفی منش تھے۔ چناں چہ انھوں نے اپنے متصوّفانہ خیالات اور علمِ تصوّف کے اظہار کے لیے گلستانِ سعدی کو ذریعہ بنایا اور سعدی شیرازی کی اس مشہور زمانہ غیر متصوفانہ کتاب کی شرح متصوّفانہ انداز میں لکھی۔ ظفر کی فارسی نثر کی یہ کتاب ۱۲۲۸ھ مطابق ۱۸۱۳ء میں مکمل ہوئی اور بعد میں لال قلعے کے مطبع سلطانی سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب کافی ضخیم ہے۔ کل صفحات سات سو انسٹھ ہیں اور اس کا سائز ۶½" × ۱۰ انچ ہے۔ رضا لائبریری رام پور میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ کتاب کے نام 'خیابانِ تصوّف' کی شانِ نزول شروع کے صفحات میں اس طرح بیان کی گئی ہے:

"بعد از تنظیمِ سلکِ لآلیِ آب دار، تفرّج کناں از مقامِ موتی محل داخلِ مُعلّا گردیدم و قطعۂ تاریخ اتمامِ کتاب کہ ہم نام او بطریقِ تخرجہ بحصول می انجامد بدیں گونہ از جیبِ عدم سر بر آورد۔

بنوشت ولی عہدِ شہِ اکبرِ ثانی
چوں شرحِ گلستاں پے بستانِ تصوّف
چوں کرد قلم لفظ "بجز" دور، بر آمد
تاریخ مع نام خیابانِ تصوّف" [17]
۱۲۴۰ — ۱۲ = ۱۲۲۸

جیسا کہ قطعۂ تاریخ سے ظاہر ہے، یہ کتاب ظفر کے زمانۂ ولی عہدی کی تالیف ہے۔ لیکن اس کی طباعت ظفر کی تخت نشینی کے بعد عمل میں آئی۔ چناں چہ یہ کتاب ۳رجلوسِ معلّا یعنی ۱۲۵۹ھ مطابق ۱۸۴۳ء میں مطبعِ سلطانی سے شائع ہوئی۔ کتاب کے خاتمے پر یہ عبارت درج ہے:

" از خطِّ زشت سر نوشت گمراہ نامہ سیاہ ازموروثی خانہ زادانِ ایں درگاہِ آسماں جاہ محمد علی قاری القادری الحنفی غفرلہٗ اللہ ذنوبہ وستر عیوبہ در ۱۲۵۹ ہجری مطابق سہ جلوسِ معلّا قلمی گردید و ایں قطعۂ دعائیہ بے تکلف از خامۂ ناظر ازش چکید۔

قطعہ

تعالیٰ اللہ بہارستانِ اقبال — کہ دایم ایمن از بیم خزاں باد

سراج الدیں بہادر شاہ غازی — بتختِ کامرانی جاوداں باد

آمین " [18]

ظفر نے بھی اس کتاب کے خاتمے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جو اس طرح ہے:

" ایں گلدستۂ عرفان اعنیٰ شرحِ گلستان بہ نسیم عنایتِ نخلبندِ خیابانِ جہاں مطابقِ مشربِ عذبِ اربابِ وحدۃ الوجود موجود بر سید تلطفِ پاکِ مالکِ انتدادِ اختتام با اختتام انجامید۔

رباعی

ایں شرح زطبعِ ناقصم کامل شد — ختمش برحسبِ مدعائے دل شد

صد شکر کن اے ظفر کہ از فضلِ خدا — برخاتمہ بالخیر ظفر حاصل شد [19] "

اس کتاب میں شرح لکھنے کا انداز یہ ہے کہ وہ سعدی کی حکایت کے ایک ایک فقرے کو نقل کرکے اس کی شرح کرتے جاتے ہیں۔ سعدی کے الفاظ شروع ہونے سے قبل " قال الشیخ " لکھتے ہیں اور اس کے بعد " اقولُ " لکھ کر شرح کی عبارت لکھتے ہیں۔ جہاں ایک حکایت ختم ہو کر دوسری حکایت شروع ہوتی ہے تو " حکایت

قال الشیخ" لکھتے ہیں۔ نمونے کے طور پر ایک مشہور حکایت کا پہلا فقرہ اور اس کی شرح ملاحظہ ہو:

"حکایت' قال الشیخ: بادشاہے با غلامے عجمی در کشتی نشستہ بود۔
اَقُولُ: مراد از بادشاہ لا محالہ روح باشد و چوں غلام بمعنئ طفل آمدہ است مراد از قلب خواہد بود کہ فارسِ میدانِ ریاضت و قناعت است۔ نیز لفظِ عجمی مخبر است ازیں کہ قلب نہ از جزائے رُوح است بلکہ غیرِ آنست و کشتی از سلوک است کہ بدریائے معرفتِ واجب الوجود سیرِ آں می کند و بے ساحلِ وصال کہ خلاصۂ مآرب اوست می برد۔ چناں چہ محقق مدقق نصیر الدین طوسی الدمشقی قدس اللہ سرالعزیز فرمودہ کہ مدتے خدا را می جُستم و خود را یافتم والحال خود را می جویم و غیر ازا ورا نمی یابیم۔ کذا فی شرحِ فصوص الحکم۔ ازیں جا معلوم شد کہ در سلوک ریاضتِ قلب را بعد از روح دخلِ تمام است"۔ ۲۰

تالیفاتِ ابوظفری

ظفر نے اپنے زمانۂ ولی عہدی میں ایک کتاب لغت اور اصطلاحِ دکن کے موضوع پر ۱۲۲۶ھ مطابق ۱۸۱۱ء میں لکھ کر مکمل کر لی تھی۔ شرحِ گلستانِ سعدی کے دیباچے میں ظفر نے اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔ اس کتاب کا نام تالیفاتِ ابوظفری تھا۔ افسوس کہ یہ کتاب زمانے کے ہاتھوں برباد ہو گئی اور اب اس کا ایک نسخہ بھی کہیں موجود نہیں۔ یہ کتاب تین جلدوں میں تھی۔ ظفر لکھتے ہیں:

"بتائیدِ ازلی و موفقِ توفیقاتِ لم یزلی از تسویدِ مسودۂ ایں کتابِ لغت و اصطلاحِ دکن کہ از کتبِ معتبرہ و متداولۂ ایں فن استنباط نمودہ، مسمّی بہ تالیفاتِ ابوظفری گردانیدہ، مجلّد بہ سہ ساختہ، در ..... ۱۲۲۶ ہجری النبوی صلی اللہ علیہ وسلم الفراغِ حال و انشرحِ بال کی دست دادہ۔" ۲۱

خطوط

ظہیر دہلوی، ناصر نذیر فراق، عرش تیموری اور راشد الخیری نے جو بنیادی طور پر تاریخ نویس تھے بہادر شاہ ظفر کے بارے میں ایک بات یہ بھی کہی ہے کہ وہ ایک اچھے خوش نویس تھے۔[22] بعض تذکرہ نگاروں نے اس کے لیے "خطوط" کے اصطلاحی لفظ کا استعمال کیا ہے، مثلاً:

" در اکثر خطوط دست گاہے شایستہ دارد۔ بایں فن بسیار مالوف است "۔ [23]

(نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ)

" اکثر خطوط کو اچھی طرح سے لکھتے تھے "[24]

(عبدالغفور نسّاخ)

" یکتائے زمان و وحیدِ عصر۔ انا اہل شائستہ تحریرِ خطوطِ بوقلموں مشّاق "۔ [25]

(قطب الدین باطن)

" اوصافش از بیان مستغنی است۔ در اکثر خطوط دستے توانا داشت "۔ [26]

(نواب صدیق حسین خاں)

مندرجہ بالا اقتباسات میں چوں کہ براہِ راست لفظ 'خطّاطی' کا استعمال نہیں کیا گیا اس لیے بعض لوگوں کا ذہن اس طرف منتقل ہو گیا کہ شاید ظفر نے مکتوب نگاری بھی کی ہے۔ چناں چہ منشی جگ ناتھ پرشاد ظفر کے بارے میں لکھتے ہیں:

" اکثر خطوط کو اچھی طرح شعر میں لکھتے تھے "۔ [27]

بظاہر اس بات کا یہی مطلب نکلتا ہے کہ ظفر منظوم خطوط (مکتوب) لکھا کرتے تھے لیکن ان کے کلام سے اس کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ 'غدر' کے زمانے کی بہت سی تحریریں جن میں شقّے اور احکام شامل ہیں، مکاتیب کے ذیل میں نہیں رکھے

جا سکتے۔ اس لیے کہ اوّل تو یہ تحریریں مراسلوں یا خطوط کی طرح ذاتی نوعیت کی نہیں اور دوسرے ظفر اس قسم کی تحریریں خود لکھتے بھی نہیں تھے۔ یہ تحریریں تو ان کی منظوری کے ساتھ صرف ان کے نام سے لکھی جاتی تھیں۔ دراصل ظفر کے زمانے میں یہ صورتِ حال تھی کہ خطاطی اور خوش نویسی میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ بہ حالتِ مجبوری بعض خطاط کتابت بھی کر لیا کرتے تھے۔ بعد میں چھاپے خانے کے فروغ اور مقبولیت کے بعد خطاطی اور خوش نویسی کے درمیان ایک حدِ فاصل کھنچ گئی۔ برق رفتار چھاپے خانوں کے لیے زود نویس خوش نویس بھی چاہیے تھے اس لیے وقت کی ضرورت کے ساتھ ساتھ خطاطی پر کم اور خوش نویسی پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ چوں کہ ظفر کا زمانہ چھاپے خانے کی مقبولیت سے ذرا پہلے کا رہا ہے، اس لیے اس زمانے میں خطاط کی شخصیت ہی میں ایک شخصیت خوش نویس کی بھی ہوتی تھی یا یوں سمجھیے کہ خطاطی اور خوش نویسی اس وقت کم و بیش ایک ہی فن کے دو نام تھے۔ تاہم جب ظفر کے بارے میں بعض حلقوں میں یہ خبر پھیل ہی گئی کہ وہ مکتوب نگار بھی تھے تو شاید اسی بنا پر بعض لوگوں نے ظفر کے ایک یا دو خط بھی مہیا کر کے دکھا دیے۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے اپنے تحقیقی مقالے 'مکتوباتِ اردو کا ادبی اور تاریخی ارتقا' میں ظفر کے ایسے ہی دو خطوط نقل کیے ہیں، جن میں ایک خط حسین مرزا[28] کے نام اور دوسرا خط غلام نظام الدینؒ[29] کے نام ہے۔ پروفیسر فاروقی نے خود ان خطوط کی صحت پر شبہے کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "بہادر شاہ ظفر کے ان دونوں خطوں کی نقلیں ہمیں جناب محمد رحیم صاحب دہلوی کے توسط سے حاصل ہوئی ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ انھوں نے یہ خط ۱۹۴۲ء میں برما کے ایک مہاجر سے خریدے تھے۔ خط کا آخری پیراگراف شبہات پیدا کرتا ہے ممکن ہے کسی نے تحریف کی ہو۔"[30]

بہادر شاہ ظفر کے رنگون کے حالات ایک عرصے تک پردۂ خفا میں رہے جس سے

بڑی غلط فہمیاں پھیلیں۔ اردو کے بعض انشا پردازوں نے ان غلط فہمیوں کی ترویج میں کافی حصہ لیا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کو رنگون میں سوائے نظر بندی کی پابندی کے ہر ممکن سہولت میسّر تھی البتہ انھیں کاغذ اور قلم فراہم نہیں کیا جاتا تھا۔[31] حسین مرزا کے نام جو خط لکھا گیا ہے اس کا آخری پیراگراف یہ ہے:

"کل دو فرنگی آئے تھے، قید کے زمانے کی پنشن مقرر کرنا چاہتے تھے۔ مگر جب ساری بادشاہت چھوڑ دی تو تھوڑے ٹکوں پر کیا رال ٹپکاؤں گا۔ اس ارادے پر اڑ گیا ہوں اور ان سے کہہ دیا ہے کہ کمپنی سے پھوٹی کوڑی نہ لوں گا۔ ملکہ کے بچے کھچے زیور ہیں انھی کو بیچ بیچ کر روٹیاں چل رہی ہیں۔ جب یہ ختم ہو جائیں گے تو فاقہ کریں گے مگر جو منہ سے نکل گیا وہ پتھر کی لکیر ہے۔ ظفر کی نہیں ہاں سے نہ بدلے گی اور ظفر اپنی آن پر دھبا نہ آنے دے گا۔"[32]

نیشنل آرکائوز کی دستاویزوں کی مدد سے اس مقالے کے سوانحی باب میں ظفر کے رنگون کے جو حالات بیان کیے گئے ہیں ان سے اس خط کے مفہوم کی تصدیق نہیں ہوتی۔ فاروقی صاحب نے تو صرف ہلکا سا شبہہ ظاہر کیا ہے، تاہم تمام حالات کو سامنے رکھ کر اعتماد کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں خطوں کو ظفر سے منسوب کرنے کے لیے کوئی قابلِ قبول شہادت موجود نہیں۔

حواشی تصانیف

۱۔ سخن شعرا، ص ۳۰۷

۲۔ طورِ کلیم، ص ۶۷

۳۔ گلزارِ سخن، ص ۲۸۱

۴۔ بہادر شاہ ظفر (امیر احمد علوی)، ص ۱۴۹

۵۔ دیوانِ اوّل، مطبع سلطانی، قلعۂ معلّا دہلی، مملوکہ رضا لائبریری، رام پور

۶۔ جیسا کہ اس قطعۂ تاریخ کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے، اس سے مادّۂ تاریخ بے کم و کاست برآمد ہوتا ہے یعنی اس میں کسی قسم کا تعمیہ یا تخرجہ نہیں ہے۔ جس مصرعے سے تاریخ نکالی گئی ہے وہ یہ ہے:

مرا اب یک قلم دیوان بستانِ معانی ہے

اس مصرعے کے اعداد ۱۲۲۴ کے بجائے ۱۲۱۴ برآمد ہوتے ہیں جب کہ تاریخ ۱۲۲۴ھ ہی نکالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر اس مصرعے میں لفظ 'مرا' کو 'میرا' کر دیا جائے تو دس اعداد کی کمی پوری ہو جاتی ہے، لیکن اس صورت میں مصرع بحر سے خارج ہو جاتا ہے۔ خلیل الرحمان اعظمی نے بھی مطبعِ سلطانی کے نسخے سے یہ قطعۂ تاریخ اپنی کتاب نوائے ظفر میں نقل کرتے ہوئے ۱۲۲۴ کے اعداد بھی جو مصرعے کے نیچے چھپے ہوئے ہیں بغیر شمار کیے جوں کے توں نقل کر دیے۔ 'دیوانِ حضورِ والا' کا ایک مکمل نسخہ انجمن ترقی اُردو (پاکستان) کے کتب خانے میں موجود ہے۔ یہ قطعۂ تاریخ اس نسخے میں بھی ہے لیکن شاید یہ غلطی وہاں بھی درست نہ ہو سکی۔ چنانچہ خواجہ تہور حسین نے اپنی کتاب 'انتخابِ کلامِ ظفر' فن و شخصیت' میں یہ قطعہ نقل کیا ہے اور انھوں نے بھی آخری مصرعے کے اعداد شمار کیے بغیر مصرعے کے نیچے ۱۲۲۴ھ درج کر دیا ہے۔ گمانِ غالب یہ ہے کہ جس وقت ظفر نے یہ قطعۂ تاریخ نظم کیا ہوگا تو مصرعے کے پہلے لفظ 'مرا' کی مکتوبی شکل تو 'میرا' رکھی ہوگی، لیکن ملفوظی اعتبار سے اس کا تلفظ 'مرا' کیا ہوگا، تاکہ مصرع بھی بحر سے خارج نہ ہو اور تاریخ کے اعداد بھی پورے پورے برآمد ہو جائیں، لیکن غالباً کاتب نے جو موزوں طبع معلوم ہوتا ہے لفظ 'مرا' کی مکتوبی شکل بھی وہی

رکھی جو اس کی ملفوظی شکل تھی۔ اس طرح مصرعے کی قرأت تو صحیح ہوگئی لیکن ۱۲۲۴ کے حساب میں دس اعداد کا فرق پڑ گیا۔ علاوہ ازیں ۱۲۲۴ھ کے بجائے ۱۲۱۷ھ کو صحیح تاریخ ماننے میں اور باتوں کے علاوہ جن پر اس کتاب میں بحث کی گئی ہے، یوں بھی تامّل کی گنجائش ہے کہ اس دیوان کی تکمیل سے متعلق ظفر کا ایک اور قطعۂ تاریخ بھی موجود ہے جس میں مادّۂ تاریخ ۱۲۲۳ھ نکالا گیا ہے۔ یہ قطعہ جیسا کہ ظاہر ہے زیر بحث قطعے سے ایک سال پہلے کہا گیا ہے۔ دیوان کی اشاعت میں کچھ تاخیر ہوئی ہوگی چنانچہ پھر ۱۲۲۴ھ کے اعتبار سے نیا قطعۂ تاریخ نظم کیا گیا۔ جس قطعے میں ۱۲۲۳ھ تاریخ نکالی گئی ہے، وہ یہ ہے :

ہاتفِ غیبی سے کل آئی ندا مجھ کو ظفر
فکر میں تاریخ کی رہتا تو کیوں حیران ہے
دو ہیں صد رشکِ چمن مصرع یہ مجھ سے ڈھل گیا
زورِ اب رنگیں یہ اپنا سربسر دیوان ہے
۱۲۲۳ھ

۷۔ نذیریہ پبلک لائبریری کچھ مدت پہلے تک پہاڑی بھوجلہ پر "انجمن" نام کی عمارت کے ایک حصے میں قائم تھی اور دہلی میونسپل کارپوریشن کی معمولی سی امداد پر چلتی تھی۔ اس لائبریری میں اگرچہ نایاب کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا، لیکن بے توجہی اور بد انتظامی کے سبب اکثر کتابوں کی حالت خراب و خستہ تھی اور بہت سی کتابیں تلف بھی ہو چکی تھیں ـــــ اب یہ لائبریری ہمدرد انسٹی ٹیوٹ کی تحویل میں تغلق آباد منتقل ہوگئی ہے۔

۸۔ (الف) بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ، ص ۳۱

(ب) دہلی کا آخری سانس، ص ۳۸ پر اس خبر کی تاریخ ۱۴/ اکتوبر درج ہے لیکن چوں کہ اس سے قبل کی رپورٹ ۱۷/ اکتوبر کی ہے، اس لیے قیاس ہے کہ ۱۴/ اکتوبر سہوِ کاتب ہے اور ۲۴/ اکتوبر ہی صحیح تاریخ ہے۔

۹۔ دیوانِ ثانی، مطبعِ سلطانی، قلعۂ معلّا دہلی، مملوکہ رضا لائبریری، رام پور

۱۰۔ یہ سنہ غلط ہے، اس لیے کہ ۱۲۶۶ھ میں تو یہ دیوان طبع ہی ہو چکا تھا۔

۱۱۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اپنی کتاب "ذوق، سوانح اور انتقاد" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ظفر کی کلیات کے بیشتر حصے کی تدوین و تکمیل ذوق کے ہاتھوں ہوئی؛ حقیقت یہ ہے کہ ظفر کا دیوانِ اوّل جو

مطبعِ سلطانی سے شائع ہوا تھا، بے شمار اغلاط کا حامل تھا۔ ذوق نے اس دیوان کی تصحیح کی تھی جو بعد میں دہلی اردو اخبار پریس سے 'دیوانِ حضورِ والا' کے نام سے چھپا۔ علوی صاحب نے اس دیوان کے ایک نسخے کی نشان دہی کی ہے جو اسٹیٹ لائبریری حیدر آباد کی ملکیت ہے۔ اس دیوان کے آغاز کی نثری عبارت علوی صاحب نے اس طرح نقل کی ہے :

"بہ تصحیحِ جنابِ افصح الفصحا ابلغ البلغا خاقانیِ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق دامت برکاتہم، بہ اہتمام بندۂ خاکسار پنڈت موتی لال، پرنٹر و پبلشر مطبع دہلی اردو اخبار مکانِ مولوی محمد باقر صاحب میں چھپا۔"

علوی صاحب نے اس نسخے کی پوری کیفیت اپنی کتاب میں بیان نہیں کی لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نسخہ ناقص الآخر ہے جس کی وجہ سے اس کی تکمیل یا اس کے طبع ہونے کا سال انھیں نہیں معلوم ہو سکا، ورنہ وہ اس کا ذکر ضرور کرتے۔ دہلی اردو اخبار پریس سے چھپنے والے اس دیوانِ حضورِ والا' کا ایک نسخہ میرے سامنے بھی ہے۔ بدقسمتی سے یہ نسخہ بھی ناقص الآخر ہے اور واو کی ردیف کے درمیان ختم ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس کے سالِ طباعت کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلتا۔ تاہم اگر اس نسخے کی کیفیت کا موازنہ حیدر آباد اسٹیٹ لائبریری کے اس نسخے سے کیا جائے جس کے کوائف علوی صاحب نے بیان کیے ہیں تو مندرجۂ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں :

۱۔ علوی صاحب نے 'بتصحیح' کو 'بہ تصحیح' اور 'باہتمام' کو 'بہ اہتمام' لکھا ہے چوں کہ علوی صاحب کی کتاب ٹائپ میں چھپی ہے، اس لیے ہو سکتا ہے اس میں ٹائپ کی کوئی مجبوری ہو۔

۲۔ میرے پیشِ نظر جو نسخہ ہے اس میں نثری عبارت 'یہ دیوانِ اوّل مطبعِ سلطانی میں چھپا ..... ' سے شروع ہوتی ہے جب کہ علوی صاحب کی عبارت 'بہ تصحیحِ جنابِ افصح الفصحا .....' سے شروع ہوتی ہے۔ اب اس کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ ہے کہ علوی صاحب نے اس مختصر عبارت کے شروع کے الفاظ غیر ضروری سمجھ کر حذف کر دیے، حالاں کہ وہ غیر ضروری نہیں تھے، یا پھر جو نسخہ انھیں ملا وہ ناقص الآخر ہونے کے ساتھ ساتھ ناقص الاوّل بھی تھا۔ ایک تیسری اور آخری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس نسخے میں

صرف اتنی ہی عبارت درج ہو جتنی انھوں نے نقل کی ہے۔

۱۱۔ میرے پیشِ نظر نسخے کی نثری عبارت اور علوی صاحب کی نقل کی ہوئی عبارت کے املا میں چند مقامات پر کچھ اور بھی اختلافات ہیں جو اس طرح ہیں :

محمد ابراہیم صاحب ذوق بجائے محمد ابراہیم ذوق

دام برکاتہم بجائے دامت برکاتہم

موتی لعل بجائے موتی لال

چھاپہ ہوا بجائے چھپا

ان کیفیات سے دو ہی نتائج نکالے جاسکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ظفر کا تصحیح شدہ دیوانِ اوّل موسوم بہ 'دیوانِ حضورِ والا' دہلی اردو اخبار پریس سے ایک بار نہیں بلکہ دو بار چھپا جس کا ایک اڈیشن تو وہ ہے جو میرے پیشِ نظر ہے اور دوسرا وہ ہے جس کا ذکر علوی صاحب نے کیا ہے لیکن اس کا امکان کم ہے۔ اس لیے کہ 'دیوانِ حضورِ والا' کے دو بار چھپنے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، ایسی صورت میں دوسرا نتیجہ یہی نکالا جاسکتا ہے کہ علوی صاحب نے 'دیوانِ حضورِ والا' کے پہلے صفحے کی نثری عبارت کو نقل کرنے میں احتیاط سے کام نہیں لیا۔

۱۲۔ 'دیوانِ ظفر معہ انتخاب لاجواب'، مطبع اودھ گزٹ لکھنؤ، مملوکہ رضا لائبریری، رام پور۔

۱۳۔ باہتمام اموجان، مطبع احمدی، واقع شاہدرہ، دلہائی، ضلع میرٹھ، مملوکہ رضا لائبریری، رام پور

ص ۳۱۷

۱۴۔ باہتمام اموجان، مطبع احمدی، واقع شاہدرہ، دلہائی، ضلع میرٹھ، مملوکہ رضا لائبریری، رام پور، ص ۲۷۲

۱۵۔ امیر احمد علوی نے اپنی کتاب 'بہادر شاہ ظفر' میں لکھا ہے کہ مطبع سلطانی کے بعد ظفر کے چاروں دواوین کو یکجا شائع کرنے کا شرف سب سے پہلی بار مطبعِ مصطفائی دہلی کو حاصل ہوا، جہاں سے یہ دواوین ۱۸۶۲ء میں شائع ہوئے اور تمام نسخے ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئے، لیکن عجیب بات ہے کہ اس اشاعت کا ایک بھی نسخہ کہیں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ امیر احمد علوی کا یہ بیان بھی صحیح نہیں ہے کہ چاروں دواوین کو یکجا شائع کرنے کا شرف سب سے پہلے ۱۸۶۲ء میں مطبع مصطفائی کو حاصل ہوا، اس لیے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مطبعِ احمدی کی طرف سے ان دواوین کی اشاعت ۱۸۶۱ء میں ہی ہو چکی تھی۔ مطبعِ احمدی کے دیوانِ چہارم کے آخر میں دی گئی نثری عبارت سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس اشاعت میں مطبعِ مصطفائی کے محمد حسین صاحب کی بے پایاں سعی و کوشش

شامل تھی۔ اسی عبارت سے امیر احمد علوی کو مغالطہ پیدا ہوا کہ یہ دواوین پہلی بار مطبعِ مصطفائی سے یکجا کر کے چھاپے گئے۔ ۱۸۶۲ء ظفر کی وفات کا سال بھی ہے اس لیے ممکن ہے کہ ہندوستان میں ظفرؔ کی موت کی خبر پہنچنے کے بعد مطبعِ احمدی کے ۱۸۶۱ء میں طبع ہونے والے دواوین ۱۸۶۲ء میں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئے ہوں۔

۱۶۔ کلیاتِ ظفرؔ، نول کشور، بار پنجم، دیوان چہارم، ص ۲۴۴

۱۷۔ خیابانِ تصوّف، مطبعِ سلطانی، قلعۂ معلّا، مملوکہ رضا لائبریری ص ۱۱ تا ۱۲

۱۸۔ خیابانِ تصوّف، ص ۵۹، ۶۷

۱۹۔ خیابانِ تصوّف، ص ۵۷، ۶۷

۲۰۔ خیابانِ تصوّف، ص ۲-۱

۲۱۔ خیابانِ تصوّف، ص ۵ تا ۶

۲۲۔ ملاحظہ ہو 'خطّاطی' کے زیرِ عنوان اس کتاب کے باب 'سیرت و شخصیت' کی عبارت۔

۲۳۔ گلشنِ بے خار، ص ۲۹

۲۴۔ سخنِ شعرا، ص ۳۰۷

۲۵۔ گلستانِ بے خزاں، ص ۱۵۱

۲۶۔ طورِ کلیم، ص ۶۷

۲۷۔ گلزارِ سخن، ص ۲۸۱

۲۸۔ یہ نواب حسام الدین کے بیٹے تھے جن کے نام سے بلّی ماران دہلی میں ایک محلّہ آج تک موجود ہے۔ قلعے میں تنظر نظارت کے عہدے پر فائز تھے۔ گوڑگاؤں کے کلکٹر فٹ نے انھیں گولی سے اڑوا دیا تھا

۲۹۔ یہ بہادر شاہ کے مرشد، حضرت غلام نصیر الدین کالے صاحب کے لڑکے تھے۔

۳۰۔ 'مکتوباتِ اردو کا ادبی اور تاریخی ارتقا' مملوکہ دہلی یونیورسٹی لائبریری، ص ۲۴۸

۳۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اس مقالے کا باب سوانح۔

۳۲۔ 'مکتوباتِ اردو کا ادبی اور تاریخی ارتقا' ص ۲۴۵

بہادر شاہ ظفر تاج و تخت کے معاملے میں تو بدنصیب تھے ہی شعر و ادب کی دنیا میں بھی ان کے ساتھ بہت دن تک انصاف نہیں ہوا۔ ظفر کی زندگی ہی میں پرستارانِ ذوق کی طرف سے ان کے بارے میں یہ غلط فہمی پھیلائی جا چکی تھی کہ ان کا شعری سرمایہ استاد ذوق کی دین ہے۔ ظفر کی وفات کے بعد بعض ناقدین کی شعوری کوششوں نے اس وہم کو یقین میں بدل دیا کہ واقعی انھیں ذوق شعر کہہ کر دیا کرتے تھے۔ چناں چہ تاریخ ادب کا ایک عام قاری عرصے تک کلامِ ظفر کو ذوق ہی کا زائیدۂ فکر سمجھتا رہا۔ اُردو ادب کی تاریخ میں اس قسم کی ستم ظریفی کی یہ پہلی مثال نہیں۔ اس سے پہلے مرزا مظہر جانِ جاناں کے شاگرد انعام اللہ خاں یقین کے بارے میں بھی ان کے بعض معاصرین کی جانب سے ایسی ہی غلط فہمی پھیلائی گئی تھی۔ اسی قسم کا الزام دیا شنکر نسیم پر لگایا گیا اور نواب الٰہی بخش خاں معروف کے بارے میں بھی کہا گیا کہ ان کا دیوان ذوق کا کہا ہوا ہے!

محمد حسین آزاد نے اپنے استادِ محترم شیخ ابراہیم ذوق کی عقیدت اور محبت میں ظفر کے تمام کلام پر یہ کہہ کر پانی پھیر دیا:

"مسودۂ خاص میں کوئی شعر پورا، کوئی ڈیڑھ مصرع، کوئی ایک کوئی آدھا مصرع فقط بحر اور ردیف اور قافیہ معلوم ہوتا تھا باقی بخیر۔ یہ (ذوق) ان ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھا کر حسن و عشق کی پُتلیاں بنا دیتے۔"[۲]

ظفر کی شاعری کے بارے میں صحیح نتیجے پر پہنچنے کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ظفر کے معاصر تذکرہ نگاروں کی رائے کا جائزہ لیا جائے۔ ظفر کے زمانۂ ولی عہدی میں لکھے جاتے والے اہم تذکرے ہیں، مجموعۂ نغز ۱۲۲۱ھ (۷-۱۸۰۶ء)، عمدۂ منتخبہ ۱۶-۱۲۱۵ھ (۲-۱۸۰۱ء) اور عیارالشعراء ۴۷-۱۲۰۸ھ (۱۸۳۲-۱۷۹۳ء)۔ قاسم نے اپنے تذکرے مجموعۂ نغز میں ظفر کے سلسلے میں ذوق کا ذکر کہیں نہیں کیا۔ ظفر کی شاعرانہ صلاحیتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے ظفر کو اپنے لڑکے عزت اللہ عشق کا شاگرد بتایا ہے[۳]۔ سرور نے اپنے تذکرے میں ظفر کی شعری صلاحیتوں کا ذکر اِن الفاظ میں کیا ہے :

"از آں بالاتر است کہ در خیال آرد۔ اکثر تصانیفش ناخن زنِ دل ہاست[۴]"

خوب چند ذکا نے ظفر کی سخن دانی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :

"بہ ترقیم بعضے اشعارِ آب دار کہ ہر یکے ازاں دُرِ ثمینِ دریاے سخن است می پردازد و در اشعار خودش بہ میاں نصیر الدین نصیر و دیگر اوستادانِ وقت استشارہ می فرماید۔ طبعِ دل پذیر دارد و کلامِ بے نظیر" ۵

ظفر کے زمانۂ بادشاہت میں جو تذکرے تالیف ہوئے ان میں بھی ظفر کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کیا گیا ہے۔ شیفتہ نے ظفر کے ساتھ ذوق کا ذکر اِس طرح کیا ہے :

"شیخ ابراہیم ذوق از مائدۂ نعمتش ذلّہ ربا و وظیفہ خوار است و افکارِ ایشاں بحکّ و اصلاحِ او درست و ہموار" ۶

شیفتہ کے الفاظ سے صرف اتنی بات کا پتا چلتا ہے کہ ظفر کے اشعار پر ذوق اصلاح دیا کرتے تھے اور اس سے کسی کو انکار نہیں۔ مولوی کریم الدین نے ظفر کی شاعرانہ صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی بہت تعریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"شعر ایسا کہتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں ان کے برابر کوئی نہیں کہہ سکتا۔ ابراہیم ذوق سے اصلاح لیتے ہیں۔ تیرہ یا چودہ برس کا عرصہ ہوا کہ تخت نشیں ہوئے۔ ابتدا میں ولی عہد تھے۔ ان ایام میں بھی ان کے شعر بہت اچھے ہوتے تھے....." ۷

مولوی کریم الدین نے اپنے تذکرے میں ذوق کی بہت تعریف کی ہے اور انھیں "شہنشاہِ شعرا" کہا ہے لیکن اس کے باوجود قلعے کی ملازمت اور بادشاہ کے استاد ہونے کے سلسلے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی قابلِ غور ہے :

"تیس برس کے عرصے سے ملازم درگاہِ حضورِ والا حالتِ ولی عہدی سے شہنشاہ حال دہلی کے ہیں۔ فنِ شعر میں بھی ابتدائے عمر سے مصروف ہیں؛ مگر حالتِ صبا سے آج تک یہ عادت طبیعت میں متمکن ہے کہ جو شعر کہتے ہیں کسی کو نہیں دیتے ..... بادشاہ کے استاد ہیں، اصلاح شعر کی بادشاہ کو دیتے ہیں۔"[8]

مرزا قادر بخش صابر گورگانی نے ظفر کی شعر گوئی پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے :

"..... الفاظِ منقوطہ گنجِ گوہر سخن (؟) اس کے لب سے ہم پایۂ اعجاز اور مضمونِ نیاز اس کے اشعار میں ہم پہلوے ناز ...... حرفوں کے دائرے اشعارِ متصوفانہ میں دیدۂ بینا اور ابیاتِ عاشقانہ میں چشمِ گریہ زا اور بین السطورِ بہاریہ میں خیاباں اور فلکیات میں کہکشاں۔ نفسِ شگفتگیِ الفاظ سے نسیمِ چمن اور نگاہ نازکِ رقم سے ریشۂ یاسمن مصرع قامت شمشاد، بیت ابروے خوبانِ خلخ ونوشاد۔"[9]

گویا ان تمام تذکروں کے بیانات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ظفر خود شعر کہنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور کوئی بھی صاحب رائے اس بات کو نہیں مانتا تھا کہ ان کا کلام دوسروں کا زائیدۂ فکر تھا۔ تاریخِ ادب میں اکثر ایسا ہوتا رہا ہے کہ بادشاہوں اور نوابوں کے نام سے ان کے درباری شاعر شعر کہہ کر دیتے رہے ہیں، اس لیے ظفر کے بارے میں بھی یہ آسانی کے ساتھ باور کر لیا گیا کہ ان کو ذوق شعر کہہ کر دیا کرتے تھے۔

ظفر کی زندگی میں اشپرنگر کے علاوہ یہ بات کسی نے بھی نہیں کہی کہ ظفر کا تمام کلام ذوق کا کہا ہوا ہے۔ ذوق کی وفات کے بعد دہلی اردو اخبار میں ان پر ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں اور باتوں کے علاوہ یہ بات بھی کہی گئی تھی :

" ان کی توجہات سے شاگردوں کے دیوان کئی جلدوں میں مرتب ہو گئے

لیکن طرفہ تر یہ کہ اپنا دیوان مرتب نہیں کیا۔ اگر کسی نے احباب و تلامذہ میں سے تکلیفِ جمعیت دی بھی تو ہنس کر ٹال دیا اور کہا تو یہ کہا کہ حضورِ والا کا دیوان مقدم ہے۔" ۱۰

ان الفاظ کا بظاہر تو یہی مطلب ہے کہ ذوق کو اپنے شاگردوں کے کلام کی اصلاح سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ وہ اپنے دیوان کی طرف توجہ دیتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ "کہا تو یہ کہا کہ حضورِ والا کا دیوان مقدم ہے۔" بڑے معنی خیز الفاظ ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جب دہلی اردو اخبار میں یہ مضمون چھپا ہے تو اس وقت مولانا محمد حسین آزاد اس کے اڈیٹر تھے۔ ۱۸۴۹ء سے قبل دہلی اردو اخبار کے اڈیٹر، آزاد کے والد مولوی محمد باقر تھے۔ ۱۸۵۳ء میں دہلی اردو اخبار کے متعلق سرکاری رپورٹ یہ تھی :

" یہ ایک گندہ اخبار ہے جو ذاتیات سے بھرا رہتا ہے۔ مقامی باعزت شرفا جو اڈیٹر کے مذہبی خیالات سے اختلاف رکھتے ہیں یا جن سے کسی اور وجہ سے وہ ناراض ہے، ان پر اپنے اخبار کے صفحات میں وہ براہِ راست یا بالواسطہ حملے کیا کرتا ہے۔" ۱۱

۱۸۵۴ء میں اشپرنگر کی کتب خانۂ اودھ کی فہرست انگریزی میں شائع ہوئی۔ اس فہرست میں ایک حصہ اردو شاعروں کے تذکروں پر مشتمل ہے۔ اشپرنگر نے اپنی کتاب میں پہلے تو بیس شاعروں کا تعارف کرایا ہے۔ پھر مذکورہ تذکروں کے حوالے سے شاعروں کے حالات بیان کیے ہیں۔ اس فہرست کا جو حصہ اردو شعرا سے متعلق ہے اس کی تلخیص اور ترجمہ یادگارِ شعرا کے نام سے طفیل احمد نے کیا تھا، اس حصے میں اردو کے جن شعرا کا ذکر کیا گیا ہے ان میں ظفر شاید واحد شاعر ہیں جن کا حال کسی تذکرے کا حوالہ دیے بغیر لکھا گیا ہے اور صرف یہ لکھا ہے :

" ظفر ۔۔۔ میرزا ابو ظفر، شاہِ دہلی، ایک دیوان کے مصنف ہیں جو اصل میں ذوق کا لکھا ہوا ہے۔" ۱۲

جن تذکروں کی مدد سے اشپرنگر نے دوسرے شعرا کے حالات مرتب کیے ہیں ان میں سے کم از کم چھے تذکرے ایسے ہیں جن میں ظفر کا ذکر بھی شامل ہے لیکن اشپرنگر نے کسی تذکرے سے

ظفر کا حال نقل نہیں کیا۔ شاید اس لیے کہ ظفر کے بارے میں جو کچھ اشپرنگر کہنا چاہتا تھا اور جو اس نے کہہ بھی دیا اس کی تائید یا تصدیق ان میں سے کسی تذکرے سے نہیں ہو سکتی تھی۔ چناں چہ کسی بھی تذکرے کا حوالہ دیے بغیر اس نے اطمینان سے اپنی طرف سے یہ لکھ دیا کہ ظفر کا دیوان ذوق کا کہا ہوا ہے۔

اشپرنگر شاید یورپین ہونے کی وجہ سے ظفر سے ناخوش ہے اور ظفر کا وہ احترام اس کے دل میں نہیں جو عام ہندوستانیوں کے دلوں میں تھا۔ بادشاہِ دہلی کا نام کوئی بھی ہندوستانی اتنے غیر رسمی انداز سے نہیں لکھتا تھا کہ اسے بے ادبی پر محمول کیا جا سکے۔ اشپرنگر کے تذکرے کی تالیف تک ظفر کے تین دیوان شائع ہو چکے تھے جب کہ اس نے ظفر کے ایک دیوان کا تذکرہ کیا ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ ظفر کے ادبی کارناموں سے پوری طرح واقف نہیں۔ گویا اشپرنگر واحد شخص تھا جس نے ظفر کی زندگی ہی میں کھلّم کھلّا یہ الزام لگایا کہ ان کا دیوان ذوق کا کہا ہوا ہے اور یہی بات محمد حسین آزاد کے دہلی اردو اخبار میں مبہم الفاظ میں کہی گئی۔ اشپرنگر کی بات کو تھوڑی دیر کے لیے درگزر کیا جا سکتا ہے لیکن اس معاملے میں محمد حسین آزاد نے جو کچھ لکھا ہے اس کا تجزیہ کرنا ضروری ہے۔

آزاد کے بارے میں اُردو ادب کا ہر سنجیدہ طالب علم یہ بات جانتا ہے کہ انھوں نے اپنی مشہور کتاب آبِ حیات میں کہیں انشا پردازی کے زور میں اور کہیں ذاتی پسند اور ناپسند کی بنیاد پر، بہت سی گُل افشانیاں اور واقعہ تراشیاں کی ہیں۔ آبِ حیات کو تذکرے کی حیثیت سے جتنی مقبولیت حاصل ہوئی اتنی کسی دوسرے تذکرے کو نہیں ہو سکی۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ اردو شعرا کے بیشتر تذکروں کے مقابلے میں، جو فارسی زبان میں تھے، یہ تذکرہ اردو میں لکھا گیا۔ دوسرے یہ کہ اس میں شاعروں کے قلمی مرقعے اور ان کے کلام پر تنقیدی حاشیے نئے انداز سے ملتے تھے لیکن یہ سب کام آزاد کی بے مثال انشا پردازی کی نذر ہو گیا۔ چناں چہ آج آبِ حیات اپنی تمام خوبیوں کے باوجود تحقیقی اعتبار سے ایک کمزور اور غیر مستند ماخذ ہے۔ آبِ حیات میں ایسے بے شمار مقامات ہیں جہاں حقیقت بیانی پر مصلحت کوشی، ذاتی تعلقات اور مذہبی تعصب کو ترجیح دی گئی ہے۔ حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود اور حامد حسن قادری جیسے محققین اس پر کافی روشنی ڈال چکے ہیں۔ آبِ حیات کی تالیف کا زمانہ ظفر کی وفات کے بعد کا ہے۔ اس لیے ظفر کے بارے میں جو کچھ آزاد کے جی میں آیا وہ انھوں نے بے دھڑک لکھ دیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا

ہے کہ آزاد کو ظفر سے کیا دشمنی تھی؟ جواب سیدھا سادہ ہے کہ وہ اپنے استاد شیخ ابراہیم ذوق کے مرتبے کو زیادہ سے زیادہ بلند کرنا چاہتے تھے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ذوق اپنے زمانے کے برگزیدہ شعرا میں سے تھے لیکن انھیں اپنے زمانے میں جو عزت اور شہرت نصیب ہوئی اس میں بہت بڑا دخل اس بات کا بھی تھا کہ وہ بادشاہ کے اُستاد تھے۔ اس زمانے کی شعر و ادب کی محفلوں میں غالب، مومن اور آزردہ جیسے شاعروں کی شہرت کا ڈنکا بج رہا تھا۔ آزاد' ادب اور زمانہ دونوں کے نبّاض تھے۔ وہ ان شعرا کے مقابلے میں اپنے استاد' ذوق کی حدود سے ضرور واقف رہے ہوں گے۔ وہ جانتے تھے کہ وقت بڑا نقاد ہے' وہ بڑی مشکل سے کسی ہستی کو تاریخ کا جز بناتا ہے۔ ذوق یقیناً اہم شاعر تھے لیکن ذوق کا المیہ اور آزاد کی مشکل یہ تھی کہ ذوق کے مقابلے میں غالب اور مومن جیسی ادب کی دیو قامت شخصیتیں کھڑی تھیں۔ آزاد نے اپنے استاد کے ان ادبی حریفوں کو نیچا دکھانے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ آبِ حیات کے پہلے ایڈیشن میں مومن کا ذکر سرے سے تھا ہی نہیں۔ آبِ حیات میں مومن کا ذکر نہ کرنا دراصل ذوق کے ایک حریف کا نام و نشان مٹا دینے کی ناکام کوشش تھی۔ غالب کو اتنی شہرت اور مقبولیت حاصل ہو چکی تھی کہ انھیں آسانی کے ساتھ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چناں چہ انھوں نے آبِ حیات میں غالب کا ذکر تو کیا لیکن ساتھ ہی ان کے ساتھ وہ سلوک کیا جو کئی اور شعرا کے ساتھ کر چکے تھے۔ چناں چہ غالب کے بارے میں لکھتے ہیں :

"مرزا صاحب کو اصلی شوق فارسی نظم و نثر کا تھا' اس کمال کو اپنا فخر سمجھتے تھے لیکن چونکہ تصانیف ان کی اُردو میں بھی ہیں اور جس طرح امرائے ہند و رؤسائے اکبرآباد میں علوِ خاندان سے نامی اور میرزائے فارسی ہیں اسی طرح اردوئے مُعلّا کے مالک ہیں۔" ۳

آزاد کہنا یہ چاہتے ہیں کہ غالب نے دراصل فارسی میں کمال پیدا کیا تھا لیکن چوں کہ انھوں نے اردو میں بھی کچھ لکھا ہے اس لیے آبِ حیات میں ان کا تذکرہ ضروری ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ آبِ حیات کی تالیف کے وقت تک غالب کی اردو شاعری اور ان کے خطوط کی اُردو نثر بے پناہ مقبول ہو چکی تھی' جب کہ ان کی فارسی نظم و نثر ایک مخصوص طبقے تک محدود تھی۔ دراصل یہاں ذوق کے

سب سے بڑے حریف کو فارسی کا عالم قرار دے کر اردو شاعری کے میدان ہی سے نکال دینا چاہتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے کتنی خوب صورتی کے ساتھ مرزا کو مہمل گو قرار دیا جارہا ہے :

"جس قدر عالم میں مرزا کا نام بلند ہے اس سے ہزاروں درجہ عالمِ معنیٰ میں کلام بلند ہے بلکہ اکثر شعر ایسے اعلا درجۂ رفعت پر واقع ہوئے ہیں کہ ہمارے نارسا ذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔" ۱۴

غرض آزاد نے اس طرح ذوق کے ادبی حریفوں کی اہمیت کم کرنے کی بہت سی کوششیں کیں مگر اس کا کیا کرتے کہ ذوق کا کلام خود اس کی شہادت ہے کہ وہ غالب اور مومن وغیرہ کے مقابلے میں کم تر شاعر تھے۔ اس کا حل انھوں نے ایک تو یہ نکالا کہ دیوانِ ذوق میں بہت سی غزلیں خود کہہ کر شامل کر دیں[۱۵] اور پھر یہ کہ کلامِ ذوق کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔ آزاد کی ان تمام کوششوں کے باوجود دیوانِ ذوق کا حجم زیادہ نہ ہو سکا، اس لیے اب آخری صورت یہ باقی رہ گئی تھی کہ ظفر اور ذوق کے معاملے کو ایسا پیچیدہ بنا دیا جائے کہ لوگ آپ ہی آپ ظفر کی شعر گوئی پر شک کرنے لگیں۔ ظفر کے بارے میں آزاد کا یہ بیان ملاحظہ ہو :

"بادشاہ کے چار دیوان ہیں۔ پہلے میں کچھ غزلیں شاہ نصیر کی اصلاحی ہیں، کچھ کاظم حسین بے قرار کی۔ غرض پہلا دیوان نصف سے زیادہ باقی تین سر تا پا حضرت مرحوم کے ہیں۔" ۱۶

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آزاد نے اپنے اس بیان میں جان بوجھ کر ایک اُلجھاؤ پیدا کیا ہے تاکہ وہ ظفر پر الزام عائد کرنے کے گناہ سے بھی محفوظ رہیں اور لوگوں کے دلوں میں وہ بات بھی بیٹھ جائے جو اُن کا منشا ہے۔ اقتباس کا آخری جملہ ہے: "پہلا دیوان نصف سے زیادہ باقی تین سر تا پا حضرت کے ہیں۔" اگر عبارت کا سلسلہ پچھلے جملے سے ملایا جائے تو اس جملے سے مُراد یہ ہونی چاہیے کہ "پہلا دیوان نصف سے زیادہ باقی تین سر تا پا حضرت مرحوم کے (اصلاحی) ہیں۔" لیکن عبارت میں تعقید اس طرح پیدا کر دی گئی ہے کہ بظاہر اس جملے کا مطلب یہی سمجھ میں آتا ہے کہ "پہلا دیوان نصف سے زیادہ باقی تین سر تا پا حضرت مرحوم کے (کہے ہوئے) ہیں۔" پھر یہ بات بھی توجہ چاہتی ہے کہ آیا "اصلاحی غزلیں" کے انداز پر "اصلاحی دیوان" جیسی کوئی ترکیب بھی اُس زمانے میں رائج تھی۔

بہر حال اس عبارت میں لفظ 'اصلاحی' کو بہت دور تک کھینچ کر ایک محتاط محقق ہی لے جا سکتا ہے عام قاری کا ذہن اس کھینچا تانی کا متحمل نہیں ہو سکتا، یہاں تک کہ بعض نقادوں نے بھی آزاد کے اس بیان کا صاف مطلب یہی نکالا ہے کہ 'پہلا دیوان نصف سے زیادہ اور باقی تین سرتاپا حضرت مرحوم کے ہیں'۔ آبِ حیات کے بغور مطالعے سے اتنی بات تو پڑھنے والے کے ذہن میں بیٹھ ہی جاتی ہے کہ آزاد کو چہرے مسخ کرنے میں کمال حاصل ہے۔ وہ پہلے خوب صورت چہرے بناتے ہیں اور پھر بہ یک جنبشِ قلم انھیں مسخ بھی کر ڈالتے ہیں۔ مصحفی کے لیے 'امروہہ پن' اور مرزا مظہر جانِ جاناں کے لیے 'ایک دھوبن گھر میں ڈال رکھی تھی' ان کی اسی جنبشِ قلم کا کمال ہے۔

ایک اور جگہ آزاد لکھتے ہیں :

" کئی مخمس تھے، کئی رباعیاں تھیں، صدہا تاریخیں تھیں مگر تاریخوں کی کمائی بادشاہ کے حصّے میں آئی کیوں کہ بہت بلکہ کل تاریخیں انھی کی فرمائش سے ہوئیں اور انھی کے نام سے ہوئیں...... ہزاروں گیت، ٹپّے، ٹھمریاں، ہولیاں وہ بادشاہ کے نام سے مشہور ہوئیں " ۱۷

اِن دونوں اقتباسات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ظفر شعر و شاعری کے میدان میں صفر تھے اور ان کا تمام کلام استاد کا مرہونِ منّت تھا یہاں تک کہ ان کے کلام میں جو گیت، ٹپّے، ٹھمریاں اور ہولیاں ملتی ہیں وہ بھی اُستاد ہی کا عطیّہ ہیں۔

اب اِس سلسلے میں آزاد کے کچھ اور بیانات ملاحظہ ہوں۔ ان بیانات سے وہ تضاد سامنے آتا ہے جو ظفر کے بارے میں آزاد کی باتوں میں ہمیں ملتا ہے :

(۱) " (استاد ذوق) فرماتے تھے کہ ایک دن بادشاہ نے غزل کا مسودہ دیا اور فرمایا ابھی دُرست کر کے دے جانا۔" ۱۸

(۲) " ایک دن شیخ مرحوم جو ولی عہد کے ہاں گئے تو دیکھا کہ تیر اندازی کی مشق کر رہے ہیں۔ انھیں دیکھتے ہی شکایت کرنے لگے کہ میاں ابراہیم اُستاد تو دکن چلے گئے، میر کاظم حسین اُدھر گئے، تم نے بھی ہمیں چھوڑ دیا۔ غرض اسی وقت ایک غزل جیب سے نکال کر دی کہ ذرا اِسے تو بنا دو...... یہ وہیں بیٹھ گئے اور

غزل بنا کر سنائی۔" ۱۹

استاد ذوق کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں کہ :

(۳) "متفرق غزلوں کے بستے اور بڑی بڑی پوٹیں تھیں، بہت سی تھیلیاں اور مٹکے تھے کہ جو کچھ کہتے تھے گویا بڑی احتیاط سے اُن میں بھرتے جاتے تھے۔ ترتیب اس کی پسینے کی جگہ خون بہاتی تھی، کیوں کہ بچپن سے لے کر دمِ واپسیں تک کا کلام انھی میں تھا۔ بہت سی متفرق غزلیں بادشاہ کی، بہتری غزلیں شاگردوں کی بھی ملی ہوئی تھیں۔" ۲۰

اسی طرح ایک اور جگہ ظفر کے کلام پر اصلاح دینے کے سلسلے میں لکھتے ہیں :

(۴) "نوجوان ولی عہد طبیعت کے بادشاہ تھے، ادھر یہ بھی جوان اور ان کی طبیعت بھی جوان تھی۔ وہ جرأت کے انداز کو پسند کرتے تھے ..... ان کی غزلیں انھی کے انداز میں بناتے تھے۔" ۲۱

اوپر کے پہلے اور دوسرے اقتباس سے صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ ظفر اصلاح کے لیے اپنی غزل ذوق کو دیا کرتے تھے۔ تیسرے اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذوق کے پاس مٹکوں میں جو کلام تھا اس میں ظفر کی متفرق غزلیں بھی شامل تھیں۔ اب اس بات کا جواب کون دے کہ "پہلا دیوان نصف سے زیادہ اور باقی تین سراپا حضرت مرحوم کے ہیں" اور یہ کہ جو غزلیں ظفر خود کہتے تھے اور جن کا اعتراف آزاد نے مذکورہ بالا اقتباس میں کیا ہے وہ کہاں گئیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جب ظفر شاہ نصیر اور میر کاظم حسین بے قرار کے شاگرد تھے تو خود شعر کہا کرتے تھے اور استاد محض اصلاح دیتے تھے لیکن جب وہ ذوق کے شاگرد ہوئے تو ان کی عام شاعرانہ صلاحیتیں سلب ہو گئیں اور مجبوراً ذوق کو شعر کہہ کر ان کو دینے پڑے۔ اس سے بھی زیادہ دل چسپ بات یہ ہے کہ ظفر کا اپنا اندازِ سخن تھا۔ چناں چہ مذکورہ بالا چوتھے اقتباس کی رو سے ذوق ظفر کی غزلیں انھی کے انداز میں بناتے تھے۔ ان تمام متضاد بیانوں سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ آزاد کو اپنے استاد سے بے حد عقیدت تھی اور اسی عقیدت کی بنا پر انھوں نے ظفر کا تمام کلام ذوق کے حساب میں لکھ دیا۔

آزاد کے ان متضاد بیانات نے ادبی دنیا میں خاصی غلط فہمی پھیلائی اور وہ اردو داں طبقہ جس کی پہنچ صرف آبِ حیات تک تھی۔ ظفر کے چاروں دواوین کو ذوق کا کلام سمجھنے لگا۔ محققین میں بیشتر نے آزاد کے بیانات کو ان کی اختراع اور ایجاد سے تعبیر کیا، لیکن بعض اہلِ قلم نے ان کے خیال سے اتفاق بھی کیا۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے تحقیقی مقالے "ذوق، سوانح اور انتقاد" سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ شاید علوی صاحب بھی اس معاملے میں آزاد کے ہم نوا ہیں۔ ڈاکٹر علوی کا یہ مقالہ کئی برس پہلے کتابی شکل میں چھپ کر سامنے آچکا ہے۔ آبِ حیات کے بعد یہ پہلی کتاب ہے جس میں بہ ظاہر مدلل طریقے سے اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ظفر اور ذوق کے سلسلے میں آزاد کے بیانات محض اختراع پر مبنی نہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علوی صاحب کے پیش کردہ دلائل کو سامنے رکھ کر ایک بار پھر اس مسئلے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔

(۱) علوی صاحب اپنے مقالے میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

"یہ بات ذوق و ظفر کی زندگی میں بھی کہی جاتی رہی ہے بقول مرزا فرحت اللہ بیگ 'جسے ذرا دبی آواز میں پہلو بچا کر مرزا آغا جان عیش نے اس کا اظہار کیا ہے:

شاگرد و اوستاد میں ہوتا ہے فرق پر
طرزِ سخن میں ذوق و ظفر دونوں ایک ہیں" ۲۲

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، ظفر کے بارے میں اس افواہ کا پھیلنا ایک فطری سی بات تھی۔ اس لیے کہ ایسا عام طور پر ہوا ہے کہ بہت سے بادشاہوں، نوابوں اور رئیسوں نے اپنا کلام دوسروں سے کہلوایا ہے۔ اوّل تو آغا جان عیش کے اس شعر میں واضح طور پر وہ بات نہیں کہی گئی جس کی طرف علوی صاحب اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے جہاں تک طرزِ سخن کے ایک ہونے کا تعلق ہے وہ بھی کوئی نئی بات نہیں۔ اردو شاعری کی تاریخ میں ایسے اساتذہ کی مثالیں موجود ہیں جن کے شاگردوں نے اُن کے طرزِ سخن کی پیروی کی ہے۔ ماضی قریب میں داغ اسکول اس کی سب سے نمایاں مثال ہے۔ داغ کے شاگرد اور ان کے شاگردوں کے شاگرد آج تک داغ ہی کے رنگ میں شعر کہتے چلے آرہے ہیں۔

(۲) علوی صاحب اِس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں :

"مرزا صاحب (فرحت اللہ بیگ) نے اس سے اختلاف کیا ہے لیکن خود ظفر کے بھی ایک شعر سے کم و بیش یہی ثابت ہوتا ہے :

تیرا مذاقِ شعر ظفر جانتا ہے کون
استاد ذوق تھا ترے واقف مذاق سے"[۲۳]

اِس شعر سے صرف علوی صاحب ہی اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ ظفر اپنے غیر شاعر ہونے کو تسلیم کر رہے ہیں اور اس بات کا اعتراف کر رہے ہیں کہ استاد ذوق ان کو شعر کہہ دیا کرتے تھے۔ علوی صاحب کا دھیان اس طرف بھی جانا چاہیے تھا کہ یہ شعر ظفر نے ذوق کی وفات کے بعد کہا ہے (گویا یہ شعر ذوق کا کہا ہوا نہیں ہے)۔ ذوق کے بعد غالب ظفر کے استاد ہوئے ظاہر ہے غالب ظفر کو ایسا شعر کہہ کر کیوں دیتے جس میں ذوق کی تعریف کا پہلو نکلتا ہو۔ اور پھر وہی 'طرزِ سخن' والی بات یہاں 'مذاقِ شعر' کے نام سے دہرائی گئی ہے۔ اگر ذوق 'ظفر کے مذاقِ شعر' سے واقف تھے تو اس کا مطلب یہ کہاں ہو گیا کہ وہ ظفر کو شعر بھی کہہ کر دیا کرتے تھے اور پھر حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ شعر صرف ذوق سے ہی کہلواتے رہے۔ اُدھر شاہ نصیر، عزت اللہ عشق، اور بیے قرار سے اور اِدھر غالب سے انھوں نے کچھ نہیں کہلوایا۔ ظفر لگ بھگ ساڑھے تین سال غالب کے شاگرد رہے لیکن آزاد نے کہیں یہ نہیں لکھا کہ ذوق کی وفات کے بعد ظفر، غالب سے شعر کہلواتے تھے۔

۳۔ علوی صاحب جن دلائل کی بنیاد پر آزاد کے ہم خیال نظر آتے ہیں ان میں اشپرنگر کا وہ بیان بھی شامل ہے جس پر پچھلے صفحات میں بحث ہو چکی ہے۔

۴۔ علوی صاحب نے اپنے دعوے کی دلیل میں دہلی اردو اخبار کا وہ اقتباس بھی پیش کیا ہے جس سے ہم پچھلے صفحات میں بحث کر آئے ہیں اور جس کا یہ فقرہ خاصا معنی خیز ہے کہ "کہا تو یہ کہا کہ حضورِ والا کا دیوان مقدم ہے۔" دہلی اردو اخبار نے اپنی تمام شرارت کے باوجود اس اقتباس میں کہیں واضح طور پر یہ نہیں لکھا کہ ذوق نے حضورِ والا کا دیوان تصنیف کیا اور پھر جیسا کہ کہا گیا اس وقت آزاد دہلی اردو اخبار کے اڈیٹر تھے۔

۵۔ علوی صاحب نے دیوانِ ذوق مرتبہ ویرآن، ظہیر و انور کے دیباچے کی اس عبارت کو اپنے خیال کی تائید میں پیش کیا ہے:

"چہار دیوانِ مجلّد بادشاہ کہ شمارِ اشعارش لاتعداد ولاتحصی است تمام و کمال درست کردہ و چکیدۂ خامۂ فکرش تواں گفت۔" ۲۴

علوی صاحب نے "چکیدۂ خامۂ فکرش تواں گفت" سے یہ مراد لی ہے کہ مرتبین کا یہ خیال ہے کہ ظفر کے چاروں دیوان ذوق کے کہے ہوئے ہیں۔ اگر ایسا ہی تھا تو "تمام و کمال درست کردہ" کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ جب ذوق کے تینوں شاگرد یعنی ویرآن، ظہیر اور انور ذوق کا دیوان ترتیب دینے بیٹھے تو باوجود کوشش کے وہ ذوق کا اتنا کلام جمع کرنے میں ناکام رہے۔ جو اس زمانے میں ایک عام دیوان کے حجم کے لیے ضروری ہوتا تھا۔ چناں چہ استاد کی اس کمزوری پر پردہ ڈالنے اور اپنی خفت مٹانے کے لیے انھوں نے "چکیدۂ خامۂ فکرش تواں گفت" کی ترکیب وضع کرلی اور اس طرح انھوں نے بھی ظفر کے بارے میں اسی طرح کی غلط فہمی پھیلانے کی کوشش کی جو آزاد پھیلا رہے تھے۔

۶۔ علوی صاحب نے حالی کی بیان کردہ اس ایک روایت کو بھی اپنے دعوے کی بنیاد بنایا ہے جو حالی نے یادگارِ غالب میں ناظر حسین مرزا سے منسوب کرکے بیان کی ہے۔ حالی لکھتے ہیں:

"ناظر حسین مرزا مرحوم کہتے تھے کہ ایک دن میں اور مرزا صاحب مرحوم (غالب) دیوانِ عام میں بیٹھے تھے کہ ایک چوب دار آیا اور کہا حضور نے غزلیں مانگی ہیں۔ مرزا نے کہا ذرا ٹھہر جا اور اپنے آدمی سے کہا کہ کچھ کاغذ پالکی میں رومال میں بندھے ہوئے رکھے ہیں وہ فوراً لے آ۔ مرزا نے جو اس کو کھولا اس میں آٹھ نو پرچے جن پر ایک ایک دو دو مصرعے لکھے ہوئے تھے نکالے اور اسی وقت دوات قلم منگا کر ان مصرعوں پر غزلیں لکھنی شروع کیں اور وہیں بیٹھے بیٹھے آٹھ نو غزلیں تمام و کمال لکھ کر چوب دار کے حوالے کیں۔" ۲۵

حالی کے اس بیان پر آمنّا و صدّقنا کہنے سے پہلے یہ سوچنا ضروری ہے کہ حالی کو غالب سے وہی عقیدت تھی جو آزاد کو ذوق سے تھی۔ جس طرح آزاد نے ذوق کو بڑھانے کے لیے

طرح طرح کی داستانیں تراشیں،[۲] ویسے ہی حالی نے غالب کے جوشِ عقیدت میں یہ روایت بیان کر دی اور اپنا دامن بچانے کے لیے بیچ میں ناظر حسین مرزا کو ڈال دیا۔ دراصل حالی کا بیان خود آزاد کے ان الفاظ کا چربہ ہے جو انھوں نے ذوق کے سلسلے میں ایک جگہ لکھے ہیں:

"مسودۂ خاص میں کوئی شعر پورا کوئی ڈیڑھ مصرع کوئی ایک کوئی آدھا مصرع فقط بحر یں اور ردیف اور قافیہ معلوم ہوتا تھا باقی۔ بخیر۔ یہ (ذوق) ان ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھا کر حسن و عشق کی پتلیاں بنا دیتے تھے۔"[۲۶]

حالی اور آزاد دونوں کی عبارتوں کا مفہوم ایک ہے۔ فرق صرف آزاد کی رنگیں بیانی اور حالی کی سادگی کا ہے لیکن حالی نے یہ روایت صرف غالب کی بڑائی جتانے کے لیے بیان کی ہے۔ چنانچہ مقدمۂ شعر و شاعری میں ایک جگہ ظفر اور ذوق کی شاعری میں فرق پیدا کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ذوق کی غزل میں عموماً زبان کا چٹخارا اپنے معاصرین کے کلام سے زیادہ ہے مگر وہ بھی جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں صفائی سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔ ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی سے اول سے آخر تک یکساں ہے۔"[۲۷]

۷۔ علوی صاحب نے اپنے دعوے کے ثبوت میں ظفر کے بارے میں اینڈریوس کا ایک بیان[۲۸] نقل کیا ہے جو اس طرح ہے:

"بہادر شاہ کے مغلیہ دربار میں دو باکمال شاعر تھے جن میں باہم ہمیشہ نوک جھونک رہا کرتی تھی۔ ایسی سلطنت میں جس کا بادشاہ کٹھ پتلی سے زیادہ وقعت نہ رکھتا ہو، اس قسم کی چشمک نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ ان شعرا کے تخلص غالب اور ذوق تھے۔ موخر الذکر بالآخر بہادر شاہ کی عنایات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انھوں نے بشرطیکہ قلعے کی گپ کا یقین کیا جا سکے، اپنے حریف کو اس طرح شکست دی تھی کہ بہت سی بہت سی غزلیں از خود لکھ کر دے دی تھیں جو بادشاہ کے نام سے چھپی تھیں۔"[۲۹]

یہاں ایک بار پھر اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اینڈر یوس نے یہ کتاب اس وقت لکھی جب اشپرنگر اور آزاد کی کتابیں چھپ چکی تھیں اور ظفر کی شاعرانہ حیثیت کے متعلق ایک عام غلط فہمی پیدا ہو چکی تھی۔ اس حقیقت سے تو علوی صاحب بھی باخبر ہیں کہ اینڈر یوس، ظفر کا معاصر نہیں ہے۔ اینڈر یوس کی اس بات پر، کہ دربار میں غالب اور ذوق کے درمیان کش مکش ہوئی اور بالآخر ذوق بادشاہ کی عنایات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے' صرف وہی شخص ایمان لا سکتا ہے جو ذوق اور غالب کے بارے میں کچھ نہ جانتا ہو۔ غالب ۱۲۱۲ھ (۹۷-۱۷۹۶ء) میں پیدا ہوئے اور ذوق کا تعلق قلعۂ معلاّ سے ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) سے ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) کے درمیان قائم ہوا۔ گویا جس وقت ذوق کی رسائی قلعے میں ہوئی ہے اس وقت غالب کی عمر ۹ سے ۱۳ سال کے درمیان تھی اور جس وقت ظفر، ذوق کے شاگرد ہوئے اس وقت بھی غالب کے نام سے بہت کم لوگ واقف تھے۔ اس وقت تک غالب کی کوئی ادبی حیثیت بھی متعین نہیں ہوئی تھی۔ ظفر کو غزلیں لکھ کر دینے کا ذکر کرتے ہوئے خود اینڈر یوس نے "قلعے کی گپ" کے الفاظ استعمال کیے ہیں، لیکن اس کے باوجود علوی صاحب کا یہ خیال ہے کہ:

"مصنف نے اسے قلعے کی گپ شپ کہا ہے مگر قلعے سے متعلق ہونے کی وجہ سے یہ گپ شپ قابلِ اعتنا ہو جاتی ہے۔"[۳۱]

اب یہ بات علوی صاحب ہی بہتر بتا سکتے ہیں کہ قلعے سے متعلق ہونے کی وجہ سے کوئی گپ شپ کیوں کر قابلِ اعتنا ہو سکتی ہے۔

۸۔ علوی صاحب کو کہیں سے تین مسودے بھی دستیاب ہوئے ہیں جن کے عکس انھوں نے اپنی زیرِ بحث کتاب میں شائع کیے ہیں۔ ان مسودوں کے ذریعے بھی انھوں نے اس شبہے کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی ہے کہ ظفر کو ذوق شعر کہہ کر دیتے تھے۔ پہلے مسودے میں ذوق کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دو غزلیں ہیں جن میں ایک غزل ذوق کی ہے اور دوسری ظفر کی۔ کیوں کہ ظفر کی غزل بھی ذوق کے قلم سے لکھی ہوئی ہے اس لیے علوی صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ ذوق کی کہی ہوئی ہو سکتی ہے۔ حال آں کہ ایک درباری شاعر شہنشاہ کی غزل کے ساتھ اپنی غزل لکھتا ہے تو یہ اس کے لیے باعثِ سعادت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوا کہ یہ غزل اس درباری شاعر کا نتیجۂ فکر ہے اور پھر اس مسودے پر کاوش کی کوئی علامت بھی نہیں ہے۔

دونوں غزلیں صاف صاف ایسے لکھی گئی ہیں جیسے نقل کی گئی ہوں۔ دوسرے مسودے میں صرف ظفؔر ہی کی غزل ہے جو ذوقؔ کے قلم سے لکھی ہوئی ہے۔ یہ غزل بھی صفائی کے ساتھ نقل کی گئی ہے جس پر کاوش کی کوئی علامت نہیں۔ چوں کہ آزادؔ نے اس غزل کے چار اشعار دیوانِ ذوقؔ میں شامل کر لیے ہیں اس لیے علوی صاحب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اصل غزل ذوقؔ کی ہے۔ اوّل تو اس معاملے میں آزادؔ پر زیادہ بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے ایک شاعر کے اشعار کا دوسرے شاعر کے کلام میں جا ملنا کوئی نئی بات نہیں۔ اردو شعرا کے تذکروں میں کیا دواوین تک میں اِس شاعر کے اشعار اُس شاعر کے ہاں اور اُس شاعر کے اشعار اِس شاعر کے ہاں عام طور پر ملتے ہیں اور خاص طور پر جب کہ دیوان کی ترتیب میں خود شاعر کا دخل نہ ہو تو ایسا ہو جانا عین ممکن ہے۔ تیسرے مسودے میں ذوقؔ نے ظفؔر کے لیے مادّہ ہائے تاریخ نکالے ہیں اِس پر کاوش کی علامت بھی ہے لیکن یہ بھی ہرگز اس بات کا ثبوت نہیں کہ ذوقؔ ظفؔر کے لیے مادّہ ہائے تاریخ نکالنے کے ساتھ ساتھ ان مادّوں کو نظم کر کے بھی دیا کرتے تھے۔ ظفؔر مادّہ ہائے تاریخ ذوقؔ سے نکلوا کر اپنے اشعار میں نظم کر لیا کرتے ہوں گے۔ خود غالبؔ نے ایک جگہ اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ بیشتر قطعاتِ تاریخ ان کے اپنے کہے ہوئے ایسے ہیں جن کے مادّے دوسروں کے نکالے ہوئے ہیں۔ غالبؔ لکھتے ہیں :

> "میاں اس کو سب جانتے ہیں کہ میں مادّۂ تاریخ نکالنے میں عاجز ہوں لوگوں کے دیے ہوئے مادّے نظم کر دیتا ہوں اور جو مادّہ اپنی طبیعت سے پیدا کرتا ہوں وہ بیشتر لچر ہوا کرتا ہے۔" ۳۲

ظفؔر تو ذوقؔ کی وفات کے بعد تک قطعاتِ تاریخ کہتے رہے ہیں۔ خود ذوقؔ ہی کی وفات پر ان کے دو قطعے ہیں۔ غالبؔ پہلے ہی مادّۂ تاریخ نکالنے میں عاجز تھے۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ظفؔر نے ذوقؔ کے بعد کی تاریخیں کس سے نکلوائیں۔ غرض علوی صاحب کوئی بھی دلیل ایسی نہیں پیش کر سکے جس میں اتنی جان تو ہوتی کہ اگر ہم محمد حسین آزادؔ اشپرنگر اینڈ ریوس اور خود علوی صاحب کے موقف سے اتفاق نہ کرتے تو کم از کم اس پر از سرِ نو غور ہی کرنے کی گنجائش پیدا ہوتی۔ اس طول طویل بحث کے خاتمے پر علوی صاحب خود اپنے دلائل کے چنگل سے چھٹکارا پانے کی کوشش میں ایک متوازن نتیجے پر پہنچتے دکھائی دیتے ہیں :

"بایں ہمہ ظفر کی شاعری سے متعلق کوئی فیصلہ دینے یا کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے بڑی احتیاط اور چھان بین کی ضرورت ہے اور اس سلسلے میں ظفر کی شاعری کے کچھ مخصوص فکری عناصر اور اس معتدبہ حصّے سے کسی طرح صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا جو نسبتاً زیادہ جان دار اور اہم ہے اور جسے ان کے اور ان کے اساتذہ کی شاعری کے درمیان قدرِ مشترک نہیں کہا جاسکتا۔" ۴۳

ظفر کے کلام کی صداقت پر اب تک جو بحث ہوئی وہ تحقیقی نقطۂ نظر سے تھی۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے ظفر کی شاعری سے متعلق تنقیدی زاویۂ فکر بھی ہمارے سامنے آجائے۔ سرسید احمد خاں نے ظفر کا زمانہ دیکھا تھا۔ انھوں نے غالب، مومن اور ذوق تینوں کے کلام کا لطف اٹھایا تھا۔ مولوی عبدالحق نے ایک جگہ ظفر کے بارے میں سرسید احمد خاں کی رائے کو اس طرح نقل کیا ہے:

"ایک بار ظفر اور ذوق پر گفتگو چھڑ گئی اور وہی پُرانی بحث چھڑ گئی کہ ظفر کے سب دیوان ذوق کے لکھے ہوئے ہیں۔ سیّد صاحب اس پر چیں بہ جبیں ہوئے اور فرمایا کہ وہ بادشاہ کا کلام تو کیا لکھتا قلعے کے تعلق سے خود ذوق کو زبان آگئی۔" ۴۴

شعر و ادب کے مذاق کے اعتبار سے دہلی اس وقت ہندوستان کا شیراز تھی۔ لوگ شعر فہمی کے فن سے واقف تھے۔ ایسے حالات میں کسی بھی شاعر کے انفرادی رنگ کو سمجھے بغیر اس کا کلام اوروں سے یا اوروں کا کلام اس سے منسوب کر دینا کور مذاقی کی دلیل تھی۔ مرزا حیات دہلوی نے ظفر اور ذوق کے مسئلے پر اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے اس کور مذاقی کے خلاف شدید ردِ عمل کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ جو مشہور ہے کہ استاد ذوق اشعار کہہ کر دیا کرتے تھے اور بہادر شاہ ظفر اپنے نام سے محفل میں سنا دیا کرتے تھے محض غلط اور بالکل لغو ہے۔ جس کو کچھ بھی شعر گوئی اور شعر فہمی کا مذاق ہوگا وہ سمجھ سکتا ہے کہ ذوق اور ظفر کے رنگ میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ جب معمولی سے معمولی کنجڑے کھوکرے

بھٹیارے اور قصائی اشعار موزوں کر لیا کرتے تھے تو کیا بہادر شاہ ایک شعر بھی موزوں نہیں کر سکتے تھے۔" ۳۵

نواب نصیر حسین خیال نے ظفر کی زبان کو ذوق کی زبان پر ترجیح دیتے ہوئے لکھا ہے:

"پروفیسر آزاد نے تو عشقِ ذوق میں بہادر شاہ کے نام اور اس کی شاعری تک کو مٹانا چاہا ہے مگر جنھیں حقیقی طور پر قلعۂ معلّا اور اس کی وجہ سے اردوے معلّا سے واسطہ رہا ہے اور وہ اردو کو جانتے اور زبان کو پہچانتے ہیں ظفر و ذوق کی زبان میں شاہ و گدا کا فرق ہے اور کیا کہوں۔" ۳۶

حسرت موہانی نے اردو شاعری کے کلاسیکی سرمائے کو بہت کھنگالا ہے۔ وہ لطفِ سخن، طرزِ سخن، مذاقِ سخن اور رنگِ سخن جیسی اصطلاحوں کی باریکیوں کو سمجھتے تھے اس لیے وہ ان اصطلاحوں کا استعمال بے دردی کے ساتھ نہیں کرتے تھے۔ میر سے لے کر نسیم تک انھوں نے ہر شاعر کے رنگِ سخن کو سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ذوق کے کمالِ استادی میں شک نہیں لیکن ساتھ ہی اس کے یہ امر بھی مسلّم ہے کہ ان کا کلام پختگی کی طرح درد و تاثیر کی خوبیوں میں بے مثال نہیں قرار پا سکتا۔ چناں چہ یہی اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ ہم ظفر کی پُر درد غزلوں کو ذوق کی تصنیف نہیں کہہ سکتے۔" ۳۷

نیاز فتح پوری ظفر کی عظمت کے زیادہ قائل نظر نہیں آتے لیکن وہ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ ذوق اور ظفر کا رنگ جدا جدا ہے اور یہ کہ ظفر کا کلام ذوق کا نہیں ہو سکتا۔ وہ لکھتے ہیں:

"ذوق میں ایک چیز اور تھی جسے جوش و خروش کہتے ہیں اور جس کا پورا اظہار ان کے قصائد میں ہوتا ہے۔ ظفر کے کلام میں اس چیز کا پتا نہیں اور نہ ان کا یہ فطری رنگ تھا اور اس کو دیکھ کر آزاد کا یہ الزام کہ ظفر کا اکثر کلام ذوق کی فکر کا نتیجہ ہے بالکل اُٹھ جاتا ہے۔" ۳۸

فراق گورکھپوری نے جو شاعر کے علاوہ نقاد بھی ہیں، ظفر کے بارے میں یہ بات کہی ہے:

"ظفر کے کلام میں خلوص، جذبات، شاعرانہ احساس، سوز و گداز اور دل میں چٹکیاں لینے والی اُداسی اور ایک درماندگی کا کیف اور کئی جگہ موسیقیت کا جو عنصر ملتا ہے وہ کُل کی کُل ذوق کی دین نہیں ہے، اصلاح ذوق کی ضرور ہے۔" ۳۹

اتنا ہی نہیں فراق، ذوق کو ظفر کے گلشن سخن کا خوشہ چیں سمجھتے ہیں اور اس حقیقت کا انکشاف بڑے رازدارانہ لہجہ میں اس طرح کرتے ہیں :

"ذوق کے اشعار ریگِ رواں بھی نہیں ہیں۔ وہ ناسخ سے متاثر تھے لیکن وہ دلی کے شاعر تھے اس لیے غالب و مومن اور اپنے شاگرد ظفر کے یہاں پُرخلوص رنگ کی شاعری دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ ظفر کے ذکر سے آپ چونکیں نہیں، اردو شاعری کی تاریخ اور روایتوں میں جو فائدے استادوں نے شاگردوں سے اُٹھائے وہ ہمیشہ صیغۂ راز میں رہے اور ظفر کوئی معمولی شاگرد نہیں تھا۔ وہ ذوق کی شاعری اور شاعرانہ ذہنیت کی فضا بن گیا تھا۔" ۴۰

اس مضمون میں فراق نے آزاد کے ذہن کا تجزیہ اس طرح کیا ہے :

"آج ذوق کا نام غالب اور مومن کے بعد کیوں آتا ہے، جو انفرادی رنگ اور جو اصلیت کا جوہر غالب اور مومن کے یہاں ہے وہ ذوق کے یہاں اس انداز میں نہیں۔ وہ زمانہ سہل پسندی کا تھا اور اس سے ذوق بازی مار لے گئے اور اس کمی کے احساس سے بے چین ہو کر آزاد ظفر کے کلام پر حریصانہ نظر ڈالتے ہیں۔" ۴۱

اس تمام بحث کا مقصد اس بات پر اصرار کرنا نہیں ہے کہ کلیاتِ ظفر کا ایک ایک مصرع ظفر کا کہا ہوا ہے۔ ممکن ہے ذوق نے بعض مقامات پر بہت اصلاح دی ہو۔ بعض استاد اپنے شاگردوں کے مصرعے بدل دیا کرتے تھے اور اگر شعر کم زور ہو تو وہ اسی قافیے میں دوسرا شعر کہہ دیا کرتے تھے۔ ممکن ہے ذوق کو بھی کہیں کہیں ایسا ہی کرنا پڑا ہو، لیکن کلیات ظفر کا وہ حصہ جو قابلِ اعتنا ہے یقیناً ظفر کا اپنا ہے جس میں ظفر کی خاص زبان، ان کے اپنے موضوعات اور ان کا متعارف رنگِ سخن صاف صاف جھلکتا ہے۔ اس اعتبار سے کلیاتِ ظفر کے تفصیلی جائزے اور ظفر اور ذوق کے کلام کے تقابلی مطالعے کی ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

حواشی ظفر اور ذوق

۱۔ ایسے معاملات میں شاید مہرباں خاں رند کی واحد مثال ہے جن کے بارے میں مستند طور پر یہ ثابت ہوگیا ہے کہ ان کا تمام کلام میر سوز، سودا اور دوسرے ہم عصر شاعروں کا مرہونِ منت ہے

۲۔ آبِ حیات، ص ۴۹۱

۳۔ ملاحظہ ہو اس کتاب کے باب' ادبی پس منظر' میں شامل اقتباس۔ متعلقہ حاشیہ ۲۴

۴۔ عمدۂ منتخبہ، ص ۴۱۱

۵۔ عیارالشعرا، ص ۲۴۲

۶۔ گلشنِ بے خار، ص ۱۲۹

۷۔ طبقات الشعرائے ہند، مطبوعہ معاصر جلد ۱۹، ص ۵۱

۸۔ طبقات الشعرائے ہند، ص ۶

۹۔ (الف) گلستانِ سخن، مرزا قادر بخش صابر دہلوی، مرتبہ خلیل الرحمان داؤدی، مجلسِ ترقیِ ادب لاہور ۱۹۶۶ء، ص ۳۵۵

(ب) گلستانِ سخن پہلی بار مطبعِ مرتضوی دہلی میں طبع ہوا تھا۔ یہ تذکرہ ۱۲۷۱ھ میں شروع ہوا اور ایک سال میں یعنی ۱۲۷۲ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ یہ پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس تذکرے کے بارے میں نساخ نے سخن شعرا میں یہ لکھا ہے کہ یہ تذکرہ دراصل مولوی امام بخش صہبائی کا لکھا ہوا ہے۔ اس نسخے پر مصنف کا نام مرزا قادر بخش صابر گورگانی چھپا ہوا ہے۔ گلستانِ سخن دوسری بار ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ء میں مطبعِ نول کشور لکھنؤ سے طبع ہوا۔ مجلسِ ترقیِ ادب لاہور کے نسخے کا متن ان دونوں نسخوں کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہے۔ نول کشور ہی کے نسخے کو فوٹو آفسیٹ کے ذریعے دوبارہ یوپی اردو اکیڈمی نے شائع کیا ہے۔ اس نسخے میں ظ کی تختی میں ظفر کا ذکر بحیثیت شاعر نہیں کیا گیا ہے البتہ کتاب کا آغاز بادشاہ اور ان کے بعد ولی عہد کے ذکر سے کیا گیا ہے لیکن وہاں ان کی شاعری کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا۔

۱۰۔ تتمہ دہلی اردو اخبار ۱۸ ر نومبر ۱۸۵۴ء
۱۱۔ صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات، ص ۱۰۱
۱۲۔ یادگار شعرا، ص ۱۳۳
۱۳۔ آب حیات، ص ۵۰۰
۱۴۔ آب حیات، ص ۵۱۴
۱۵۔ حافظ محمود شیرانی نے اپنے ایک مضمون 'دیوانِ ذوق ۔ میں مولانا آزاد کے اضافے' میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔
۱۶۔ آب حیات، ص ۴۹۱
۱۷۔ آب حیات، ص ۴۷۲
۱۸۔ آب حیات، ص ۴۹۴
۱۹۔ آب حیات، ص ۴۴۲
۲۰۔ آب حیات، ص ۴۶۷
۲۱۔ آب حیات، ص ۴۷۰
۲۲۔ ذوق، سوانح اور انتقاد، ص ۹۶
۲۳۔ ذوق، سوانح اور انتقاد، ص ۹۶
۲۴۔ ذوق، سوانح اور انتقاد، ص ۹۸
۲۵۔ ذوق، سوانح اور انتقاد، ص ۹۸ تا ۹۹
۲۶۔ آب حیات، ص ۴۹۱
۲۷۔ مقدمہ شعر و شاعری، ص ۱۵۱
۲۸۔ ذوق، سوانح اور انتقاد، ص ۱۰۰
۲۹۔ ذکاءاللہ دہلوی، ص ۴۶ تا ۴۷
۳۰۔ ذکرِ غالب، ص ۲۳
۳۱۔ ذوق، سوانح اور انتقاد، ص ۱۰۰
۳۲۔ خطوطِ غالب (مہر)، ص ۵۴
۳۳۔ ذوق، سوانح اور انتقاد، ص ۱۰۳

۳۴۔ چند ہم عصر، ص ۲۶۱

۳۵۔ بحوالہ نوائے ظفر، ص ۹ تا ۱۰

۳۶۔ مغل اور اردو، ص ۱۵۷

۳۷۔ اردوئے معلّا، بحوالہ نوائے ظفر، ص ۱۱

۳۸۔ انتقادیات، ص ۱۵۱

۳۹۔ اندازے، ص ۱۰۱ ۔ ۱۰۰

۴۰۔ اندازے، ص ۱۰۷

۴۱۔ اندازے، ص ۱۰۳

- ظفر کی شاعرانہ شخصیت کی شناخت
- ظفر کی شاعری
- ظفر کی ایک غزل

ظفرؔ کی شاعرانہ شخصیت کی شناخت

تہذیب کی مثال گلاب کی اس کیاری کی طرح ہے جس میں نمو کی تمام قوتیں اگرچہ زمین کی تہہ میں کارفرما رہتی ہیں لیکن ان کا بھرپور روپ ایک خوب صورت اور شاداب گلاب کی شکل میں شاخ کے سب سے اوپری سرے پر نمودار ہوتا ہے۔ تہذیب کا خمیر عام انسانی زندگی سے اٹھتا ہے لیکن اس کی تزئین معاشرے کی فضا میں ہوتی ہے اور اس کے معیار کا تعین سماج کے اعلا طبقے کے ہاتھوں ہوتا ہے۔ اسی طرح جب ایک تہذیب یافتہ سماج پر کسی دوسری تہذیب یافتہ طاقت کا غلبہ ہوتا ہے تو اس کے ساتھ تہذیب کو بھی ایک بار پھر اپنی ہیئت بدلنی پڑتی ہے لیکن اس صورتِ حال کے تحت ہوتا یہ ہے کہ محکوم قوم کی تہذیب کو نیا حکمراں طبقہ اپنے انداز سے مزین کرکے از سرِ نو لائقِ تقلید بناتا ہے۔ گویا اس نو زائیدہ تہذیب میں اس طرح ایک نئی تاریخی آن بان بھی شامل ہو جاتی ہے۔ تہذیبی اختلاط کا یہ عمل سماج میں تاریخ کے دوش بدوش شعوری اور غیر شعوری دونوں سطحوں پر جاری رہتا ہے۔ اس بات کو اصولی طور پر تسلیم کیا جا چکا ہے کہ تہذیب کے مختلف مظاہر میں زبان اور ادب کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہوتی ہے اور ہندوستان میں اُردو زبان اور ملی جلی تہذیب نے جس طرح فروغ حاصل کیا اس سے اس بات کی مکمل طور پر تائید ہوتی ہے۔

بابرؔ نے ۱۵۲۶ء میں پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی کو شکست دی اور بہادر شاہ ظفرؔ ۱۸۵۸ء میں انگریزوں کے ہاتھوں معزول ہوئے۔ سوا تین سو برس کی یہ مدت ہندوستان

کی اُس تہذیب کے فروغ کا زمانہ ہے جسے ہم ہندوستانی مغل تہذیب کہہ سکتے ہیں۔ وہ تمام تاریخی حقائق جو بابر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک مغل شہنشاہوں کی سرگرمیوں سے متعلق ہیں ہندوستانی مغل تہذیب کے اہم عنوانات ہیں اور بہادر شاہ ظفر کی اردو شاعری اس تہذیبی دستاویز کا ایک روشن باب ہے۔

بابر نے تزک بابری میں اپنے حالات قلم بند کرتے ہوئے زبان کی اس دشواری کا ذکر کیا ہے جس سے اسے ہندوستان جیسے نئے ملک میں دوچار ہونا پڑا۔ وہ لکھتا ہے "نہ ہم یہاں کی بولی بول سکتے ہیں اور نہ یہاں والے ہماری زبان جانتے ہیں۔" اسی طرح ایک اور جگہ اُس نے لکھا ہے "ہمارے آدمیوں کے لیے یہاں کی زبان نئی ہے اور وہ اس سے بھڑک رہے ہیں۔" چناں چہ بابر نے ہندوستانی زندگی کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے جو تدابیر اختیار کیں اُن میں زبان کی دشواری پر قابو پانا بھی شامل تھا۔ یہاں تک کہ ایک وقت وہ آیا کہ اس کے ایک ترکی شعر کا پہلا مصرع مقامی زبان کے انداز میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ مصرع یہ ہے:

مجھ کا نہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی

بابر صرف چار برس ہندوستان پر حکومت کر سکا اور ۱۵۳۰ء میں فوت ہو گیا۔ ہمایوں کی شیر شاہ کے ساتھ نبرد آزمائی اور اس کی قبل از وقت موت نے اسے اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ اس روایت کے فروغ کے سامان مہیا کر سکتا۔ مگر اس کے جانشین کو زمانے نے یہ موقعے اچھی طرح فراہم کر دیے۔ اکبر نے طویل زمانے تک حکومت کی۔ خاص بات یہ تھی کہ اکبر کے مزاج میں قدرت نے مقامی روایتوں سے ہم آہنگ ہونے کی عجیب صلاحیت ودیعت کی تھی۔ اُس نے ترجمے کا محکمہ قائم کیا اور سنسکرت کی بعض اہم کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا۔ وہ ہندوستانی سنگیت کا بھی رسیا تھا۔ تان سین اس کے عہد کا باکمال اور بے مثال مغنی تھا۔ اس نے مقامی زبان کے بہت سے شاعروں کی سرپرستی کی۔ یہی نہیں اکبر کے زمانے میں راجپوت تہذیب شاہی محل میں داخل ہو چکی تھی۔ اکبر کے بیٹے جہاں گیر کی ماں ایک راجپوت راجا کی بیٹی تھی۔ اکبر کے حکم سے جہاں گیر کو مقامی زبان کی تعلیم دی گئی۔ جہاں گیر اپنے لباس اور وضع قطع کے اعتبار سے بھی راجپوت لگتا تھا۔ جہاں گیر نے بھی نور جہاں سے پہلے راجپوت خاندان میں شادی کی تھی اور جہاں گیر کا جانشین شاہ جہاں بھی راجپوت رانی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جہاں گیر

شراب کو رام رنگی کہا کرتا تھا' اور یہ فارسی یا ترکی لفظ نہیں۔ اکبر کے زمانے میں دفتر کی زبان اگرچہ فارسی تھی لیکن دیسی زبانوں کے ساتھ اختلاط کا عمل بھی تیز ہو گیا تھا۔ آگرے میں زیادہ تر برج بھاشا کی ادبی روایت کو فروغ حاصل تھا اس لیے اکبر کی سرپرستی میں جس مقامی زبان کو مقبولیت حاصل ہوئی وہ برج بھاشا تھی۔ برج بھاشا کی بعض ادبی روایات کا اثر اُردو کی شاعری میں نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے جس کی وجہ سے بعض ذہنوں میں یہ غلط فہمی بھی پیدا ہوئی کہ اُردو، برج بھاشا سے نکلی ہے۔ شاہ جہاں کے زمانے میں مغلوں کا دارالحکومت آگرے سے دہلی منتقل ہو گیا۔

آگرے کے مقابلے میں دہلی' کھڑی بولی کا علاقہ تھا اس لیے یہاں کی عام بول چال کا ٹھاٹھ برج بھاشا سے مختلف تھا۔ تاہم فارسی کے بعد' جسے سرکاری زبان کی حیثیت حاصل تھی' دہلی میں کم و بیش برج بھاشا کی ادبی روایت مقبول تھی۔ اورنگ زیب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کٹر مسلمان تھا لیکن تہذیبی اختلاط کے جبر پر اس کو بھی اختیار نہیں تھا۔ اورنگ زیب کو دیسی زبان پر عبور حاصل تھا۔ ایک مرتبہ شہزادہ محمد اعظم نے اورنگ زیب کو خاص قسم کے آم تحفے میں بھیجے اور یہ فرمائش کی کہ ان آموں کے نام تجویز فرمائیں۔ اورنگ زیب نے ان آموں کے نام سُدھا رس اور رسنا بلاس' تجویز کیے۔ داراشکوہ کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ وہ بھگتی فلسفے میں دل چسپی رکھتا تھا۔ اس نے اپنشد کا ترجمہ فارسی میں خود کیا تھا۔

قلعے میں مغل خاندان کے لوگ آپس میں ترکی فارسی میں بات چیت کرتے تھے۔ دربار کی زبان فارسی تھی اور شعر و شاعری فارسی اُردو اور برج بھاشا تینوں زبانوں میں ہوتی تھی محمد شاہ کے زمانے میں فارسی کا اثر کم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ محمد شاہ کے عہد کو راگ رنگ کا عہد بھی کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی لکھتے ہیں:

"محمد شاہ کے زمانے میں محفلِ قال کے سجّادہ نشین تک موسیقی کے ماہر ہونے لگے تھے۔ خود میر درد' جو اس وقت کے بڑے ممتاز صوفی اور صاحب سجّادہ تھے' ہندی موسیقی کے اتنے بڑے استاد تھے کہ گوّیے اور کلاونت اپنی چیزیں اصلاح کی غرض سے ان کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے۔"

(نادراتِ شاہی ص ۳)

ظفر کے بارے میں ایک بے بنیاد بات تو یہ پھیلائی گئی تھی کہ ان کے کلام کا بڑا حصہ ان کے استاد ذوق کا کہا ہوا ہے۔ لیکن آج محمد حسین آزاد کے اس بیان کی کوئی وقعت باقی نہیں رہی ہے، اور فی الحال ہمارا یہ موضوع بھی نہیں ہیں۔ اس غلط فہمی نے ایک اور مفروضے کو جنم دیا اور وہ یہ کہ ظفر کی شاعری نے ذوق کا اثر قبول کیا ہے جب کہ زیادہ صحیح نقطۂ نظر یہ ہوگا کہ ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ ذوق کے کلام پر ظفر نے کیا اثرات مرتب کیے۔ مکتبِ سخن میں استاد کا رول یہ ہوتا ہے کہ وہ شاگرد کو فن کی باریکیاں سمجھاتا ہے جس میں فصاحت کی بحث، الفاظ کی بندش، محاورے اور روز مرّہ کا استعمال اور عروض کی نزاکتیں جیسی چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ نااہل شاگردوں کو استاد یہ تعلیم قدم قدم پر دیتا ہے یہاں تک کہ بہ حالتِ مجبوری انھیں شعر تک کہہ کر دے دیتا ہے جبکہ ہونہار شاگرد کو، بھلے گھوڑے کو ایک چابک کے مصداق معمولی اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ ویسے بھی مشرقی تہذیب میں پایۂ اعتبار تک پہنچنے کے لیے کسی استاد سے شرفِ تلمذ حاصل کرنا لازم تھا۔ ظفر نے بھی ایک شاعر کی حیثیت سے ان دبستانی قدروں کو ملحوظ رکھا۔ فن کی باریکیاں شعر گوئی کے لیے خواہ کلیدی حیثیت رکھتی ہوں لیکن یہ اپنے آپ میں شاعری نہیں ہیں۔ اس لیے اگر کوئی شاعر کسی استاد سے اصلاح لیتا ہے تو اس کے قطعی طور پر یہ معنی نہیں کہ وہ اپنے استاد کے کلام کا اثر بھی قبول کرتا ہے۔ اور جہاں تک اثر قبول کرنے کا تعلق ہے وہ تو استاد کے علاوہ کسی اور شاعر کے کلام سے بھی کیا جا سکتا ہے۔

ذوق کی شاعری کا اگر واقعی کوئی اثر دیکھنا ہے تو وہ نمایاں طور پر داغ کی شاعری میں دیکھا جا سکتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر اُس تہذیب کی مسند پر جلوہ افروز تھے جو اس دور کے معاشرے کے لیے لائقِ تقلید تھی۔ قلعۂ معلّیٰ کی اس تہذیب کا ایک اہم جز، وہ زبان بھی تھی جس میں شاہ عالم ثانی اور ان کے بعد ظفر نے بھرپور شاعری کی تھی۔ اس زبان کی گونج اُردو بازار سے گزرتی ہوئی کابلی دروازے کے اس تنگ و تاریک مکان تک سنائی دیتی تھی جو ذوق کا مسکن تھا اور پھر یہ گونج سننے والوں کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ اسی گونج پر ذوق بھی کھنچے چلے گئے اور پھر دلی کا محاورہ اور روز مرّہ جس طرح ذوق کی شاعری میں رچ بس گیا، اس کی دوسری اور نسبتاً زیادہ خوب صورت مثال بس داغ ہی کے ہاں ملتی ہے اور وہ بھی شاید اس لیے کہ داغ نے اُسی لال قلعے میں پرورش پائی تھی جہاں ذوق کے مذاقِ سخن کی تربیت ہوئی تھی۔ اس اعتبار سے سرسید کے اس بیان میں

کچھ زیادہ مبالغہ نہیں کہ "وہ بادشاہ کا کلام تو کیا لکھتا قلعے کے تعلق سے خود ذوقؔ کو زبان آگئی" اور اسی لیے فراقؔ کا یہ کہنا بھی بجا معلوم ہوتا ہے کہ "اُردو شاعری کی تاریخ اور روایتوں میں جو فائدے استادوں نے شاگردوں سے اٹھائے ہیں وہ ہمیشہ صیغۂ راز میں رہے اور ظفرؔ کوئی معمولی شاگرد نہیں تھا وہ ذوقؔ کی شاعری اور شاعرانہ ذہنیت کی فضا بن گیا تھا" صرف محاورے اور روزمرہ کی بنیاد پر شاعری کرنے کے معنی یہ بھی ہوئے کہ اس میدان میں ایک ہی دو اہم شاعر پیدا ہو سکتے تھے جو ذوقؔ اور داغؔ تھے۔ اس کے بعد تو داغؔ اسکول کے تمام شاعر داغؔ ہی کو دہراتے رہے۔ ذوقؔ کی زندگی میں قلعے کی ملازمت اور مشقِ سخن کے علاوہ کوئی جھمیلا ہی نہیں تھا اس لیے ان کے کلام میں شعریت چاہے نہ ہو لیکن انھوں نے الفاظ کی بندش اور محاورے اور روزمرہ کے استعمال میں سلیقے سے کام لیا۔ ذوقؔ کے برعکس ظفرؔ کے ہاں، جو قلعے کی تہذیبی سرگرمیوں میں غرق تھے، شعر گوئی کے عمل میں ایک طرح کی جلد بازی دکھائی دیتی ہے۔ اس لیے ان کے کلام میں شعریت، روانی، روزمرہ، محاورہ، یہ سب کچھ ہونے کے باوجود بندش کی وہ چستی نہ پیدا ہو سکی۔ جو ذوقؔ کی شاعری میں نمایاں نظر آتی ہے۔ ذوقؔ اور ظفرؔ کی شاعری کی مثال آسمان میں اڑنے والی دو پتنگوں کی سی ہے۔ اِن میں سے ایک پتنگ کی ڈور تنی ہوئی ہے لیکن یہ زیادہ اونچی نہیں اڑ رہی ہے، یہ ذوقؔ کی شاعری ہے دوسری پتنگ بلند پروازی میں آسمان کا تارا بنی ہوئی ہے۔ پتنگ بازی کے فن سے واقف لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ پتنگ کو آسمان میں اونچے سے اونچا اڑانے کے لیے ڈور کو بار بار ڈھیل دینی پڑتی ہے۔ یہ ڈھیل کھاتی ہوئی اونچی اڑنے والی پتنگ ظفرؔ کی شاعری ہے۔ ظفرؔ کی شاعری میں یہ ڈھیل بلند پروازی کے ساتھ ساتھ اُن کی بسیار نویسی اور زود گوئی کے سبب بھی نظر آتی ہے۔

ظفرؔ کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی شاعری کا وہ ہندوستانی مغل مزاج ہے جو ذوقؔ کے ذہن اور مزاج سے ذرا دور کی نسبت رکھتا تھا۔ ظفرؔ کے اس مزاج کے عناصرِ ترکیبی میں اُن کا ماحول، وراثت، سرشت اور تقدیر سبھی شامل ہیں۔ ظفرؔ کے معنوی استاد صحیح معنوں میں شاہ عالم ثانی تھے۔ ظفرؔ نے اپنی زندگی کے اکتیس سال شاہ عالم کے ساتھ گزارے۔ شاہ عالم ثانی کی تہذیبی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا امتیاز علی خاں عرشی لکھتے ہیں:

"اکبر کے عہد سے مغل بادشاہوں کے محل میں ہندو رانیاں راج کرتی

تھیں۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ قلعے سے مذہبی تعصب رخصت ہو گیا۔ شاہ عالم بھی ہندو ماں کے بیٹے تھے۔ ہولی، دوالی، بسنت سب کچھ مناتے اور ان تہواروں کی تمام رسمیں برتتے تھے۔ نادراتِ شاہی کی مختلف ہندی نظمیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عید، بکر عید، آخری چار شنبہ اور عرسوں سے، ہولی دوالی وغیرہ کا اہتمام کسی طرح کم نہ ہوتا تھا۔"

(نادراتِ شاہی ص ۸)

شاہ عالم نے رام کنور نام کی اس ہندو عورت کو بھی اپنی بہن بنا لیا تھا جس نے عالمگیر ثانی کے قتل کی خبر لال قلعے پہنچائی تھی۔ تبھی سے لال قلعے میں راکھی سلونوں کا تہوار دھوم دھام سے منایا جانے لگا۔ بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں اس دھوم دھام میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔

شاہ عالم ثانی اُردو، فارسی اور برج بھاشا کے شاعر تھے۔ تذکروں میں ان کے فارسی اور اُردو دواوین کا ذکر ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے اردو، فارسی اور بھاشا کے کلام کا ایک مجموعہ نادراتِ شاہی کے نام سے ۱۷۹۷ء میں مرتب کیا تھا۔ نادراتِ شاہی کی تکمیل کے وقت ظفر کی عمر ۲۳ سال تھی۔ یہ ظفر کے دیوانِ اوّل سے بارہ برس پہلے کی بات ہے۔ ظفر کا دیوانِ اوّل لگ بھگ دس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ نادراتِ شاہی سے شاہ عالم ثانی کے عہد کے لال قلعے کی مغل تہذیب پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ نادراتِ شاہی میں بادشاہ کا اُردو فارسی اور برج بھاشا کا کلام دیوناگری اور نستعلیق دونوں رسم الخطوں میں لکھا گیا ہے۔ ہر صفحے پر پہلے اوپر دیوناگری میں شعر یا اشعار دیے گئے ہیں۔ اس کے بعد نیچے نستعلیق میں۔ ہندی رسم الخط کے قاعدے سے نادراتِ شاہی کی ابتدا بجائے دائیں کے بائیں جانب سے ہوتی ہے۔ کتاب میں ایک دو مقامات ایسے بھی ہیں جہاں کلام دیوناگری میں تو موجود ہے لیکن شاید سہواً نستعلیق میں لکھنے سے رہ گیا ہے اس لیے کہ نستعلیق کی جگہ خالی چھٹی ہوئی ہے۔ اس سے ایک بات یہ بھی پتا چلتی ہے کہ ہر صفحے پر کلام پہلے دیوناگری میں لکھا جاتا تھا اور اس کے بعد نستعلیق میں۔ نادراتِ شاہی آٹھ حصوں پر مشتمل ہے، جن میں غزلِ ریختہ، فارسی کلام، سیٹھنے، دوہرے، کبت، نائیکا بھید، ہوری، مبارک بادِ جشن وغیرہ جیسی چیزیں شامل ہیں۔ ہر کلام کے آغاز میں قوسین میں اس راگ کی بھی نشان دہی کر دی گئی ہے جس میں اسے گایا جا سکتا ہے۔ ریختہ اور فارسی کلام میں شاہ عالم

نے آفتاب تخلص استعمال کیا ہے اور برج بھاشا میں شاہ عالم ہی رکھا ہے۔ شاہ عالم کی ریختے کی ایک غزل ملاحظہ ہو، جس کا راگ، توری اِک تالا، بتایا گیا ہے۔ زبان کی صفائی اور سادگی اس غزل کا خاص حسن ہے:

جب وہ نظریں دوچار ہوتی ہیں
تیر سی دل کے پار ہوتی ہیں
رنجشیں میری اور اُس گل کی
رات دن میں ہزار ہوتی ہیں
عشق میں بے حجابیاں دل کو
کیا ہی بے اختیار ہوتی ہیں
تو جو جاتا ہے باغ میں اے گل
بلبلیں سب نثار ہوتی ہیں
قمریاں بندگی میں تجھ گل کی
سربسر طوق دار ہوتی ہیں
آفتاب اس کے وصل کی باتیں
باعثِ اضطرار ہوتی ہیں

'گوری پوری راگ' میں مبارک بادِ جشن کا یہ دوہا ملاحظہ ہو جس میں شاہ عالم تخلص ہی رکھا ہے:

آج رے رے آئیں سب سکھی مِل یہ نیکو رنگ
نئے نئے پھول سوں کھیلن بسنت شاہ عالم کے سنگ

اس طرح 'نادراتِ شاہی' میں گویا دو زبانوں کو ایک کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ واضح ہو کہ یہ کام فورٹ ولیم کالج کے قیام سے تین برس پہلے ہوا تھا۔

ابھی کہا گیا تھا کہ شاہ عالم ثانی، بہادر شاہ ظفر کے معنوی استاد تھے۔ شاہ عالم ثانی اور بہادر شاہ ظفر کے درمیان جو مماثلتیں پائی جاتی ہیں وہ اس طرح ہیں:

شاہ عالم ثانی اور بہادر شاہ ظفر دونوں ہندو عورتوں کے بطن سے تھے۔ شاہ عالم کے ادبی مشاغل میں تالیفِ نظم و نثر کے علاوہ خطاطی بھی شامل تھی اور ایسا ہی کچھ بہادر شاہ ظفر کے ساتھ بھی تھا۔ شاہ عالم ثانی اور بہادر شاہ ظفر دونوں کو گلستانِ سعدی میں گہری دل چسپی تھی۔ شاہ عالم نے پوری گلستانِ سعدی کی کتابت اپنے قلم سے کی تھی اور بہادر شاہ ظفر نے گلستانِ سعدی کی متصوفانہ شرح فارسی نثر میں لکھی۔ شاہ عالم ثانی کے دو تخلص تھے، اردو اور فارسی میں آفتاب اور برج بھاشا میں شاہ عالم۔ بہادر شاہ ظفر کے بھی دو تخلص تھے۔ اُردو میں ظفر اور بھاشا میں شوق رنگ۔

ذوق، شاہ عالم ثانی کے انتقال کے بعد اکبر شاہ ثانی کے عہد میں لال قلعے سے متوسل ہوئے۔ بہادر شاہ ظفر کی عمر شاہ عالم ثانی کے انتقال کے وقت ۳۱ برس تھی اور وہ اپنا دیوانِ اول جس میں لگ بھگ دس ہزار اشعار تھے تقریباً مکمل کر چکے تھے۔ نادراتِ شاہی کی تکمیل چوں کہ ایسے زمانے میں ہوئی تھی جب کہ شاہ عالم نابینا ہو چکے تھے اس لیے ممکن ہے کہ اس کی دیکھ بھال کا کچھ کام خود ظفر کے ذمے رہا ہو اور قلعے کی تہذیبی زندگی کے ساتھ ساتھ شاہ عالم کے برج بھاشا کے کلام سے متاثر ہو کر ظفر نے بھی ہولی، دوہے، بھجن، ٹھمریاں وغیرہ لکھنی شروع کر دی ہوں۔ آزاد نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ظفر کے دوہے، بھجن اور ٹھمریاں بھی ذوق نے کہہ کر دی تھیں۔ لیکن اس بات پر یقین کرنے سے پہلے دونوں شاعروں کے تہذیبی پس منظر اور ان کے مزاجِ سخن پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ذوق واقعی دوہے، بھجن، پیٹے، ٹھمریاں وغیرہ نظم کرنے کا مزاج رکھتے تھے تو ان کے اُردو کلام میں بھی اس کی کوئی رمق کہیں نہ کہیں ضرور ملنی چاہیے تھی۔ اس کے برعکس ظفر کے اردو کلام میں شوق رنگ کے کلام کی جھلک جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ یہاں ظفر کے صرف چند اشعار اور ان کی ایک غزل نمونے کے طور پر پیش کی جاتی ہے:

اُس جلوے سے یوں خشک لہو کے ہوئے آنسو
جس طرح سکھائے کوئی پھولوں کی لڑی دھوپ

اشک کے قطرے پیے جاتے ہیں بھر بھر کے سبو
جوشِ گریہ نے مری آنکھوں کو پنگھٹ کر دیا

نہیں بھولتی دل سے عاشق ترا
تری ایک پل ایک چھن یاد ہے
خوں مرا کیوں اس بت کافر کے گیسو پی گئے
کچھ یہ گنگا جل نہ تھا جو اس کو ہندو پی گئے
جو سوزِ دل سے ہر ہڈی کو تن میں آگ لگتی ہے
تو پھر گویا کہ اک بانسوں کے بن میں آگ لگتی ہے
نکال اے آشنا ہم کو کہ بحرِ غم میں ہم غوطے
کبھی اس گھاٹ کھاتے ہیں کبھی اس گھاٹ کھاتے ہیں

ظفر کی غزل کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ دنیا ہے اوگھٹ گھاٹی پگ نہ بہت پھیلاؤ جی
اتنے ہی پھیلاؤ کہ جس کے سکھ سے دکھ نہ پاؤ جی
اس دنیا کے جتنے دھندے سگرے گورکھ دھندے ہیں
ان کے پھندے جا نہ پڑو تم ان میں نہ من الجھاؤ جی
یہ منوا ہے مورکھ لوبھی سب ہی پر الجائے ہے
جانو ہو تو اس مورکھ کو جیسے بنے سمجھاؤ جی
جس کارج کا ہونا کٹھن تم اپنے من میں جانتے ہو
اس کی یاد سے سہج وہ سمجھو اتنا نہ گھبراؤ جی!
عمر اکارت تم نے کھوئی کچھ تو ادھر کا دھیان کرو
بہت گئی اور تھوڑی رہی ہے یہ بھی نہ یونہی گنواؤ جی
سدھ بدھ دی کرتار نے تم کو سوچ سمجھ کر کرنا کچھ
ایسی کرنی مت کرنا جو کر کر پھر پچھتاؤ جی
کہئے نہ بھولا اس کو ظفر جو صبح کا بسرا شام کو آئے
چھوڑ کے سگرے جھگڑے اپنے رب سے دھیان لگاؤ جی

آخر میں ظفر کی شاعری پر لسانی نقطۂ نظر سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ لسانیات کا یہ اصول ہے کہ کوئی زبان جب اپنی ابتدائی منزل میں ہوتی ہے تو وہ تفصیلی حالت میں ہوتی ہے اور جیسے جیسے زبان منجھتی اور سنورتی جاتی ہے وہ تفصیلی حالت سے نکل کر ترکیبی حالت میں داخل ہوتی جاتی ہے۔ زبان کے ترکیبی حالت میں داخل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ زبان میں تراکیب اور مشتقات کی مدد سے مختصر، موثر اور بے ساختہ اظہار کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ زبان کے ترکیبی حالت میں داخل ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ارد گرد کی زبانوں کے ساتھ اس کا اختلاط ہو اور اس اختلاط کی مدد سے زبان میں چست اور موثر اظہار کے سانچے تشکیل پائیں۔ بسا اوقات ایسی زبانوں پر، جو بجائے خود اپنے زمانے کا معیار بن جاتی ہیں اور ان کی تقلید ہونے لگتی ہے، اختلاط کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ زبان کا یہ مرتبہ یا اس کی سماجی برتری زبان میں تبدیلی کے اس عمل کے مانع آتا ہے جو اسے تفصیلی حالت سے ترکیبی حالت کی طرف لے جاتا ہے۔ ظفر اور ذوق کی زبان کا بنیادی فرق یہی ہے۔ ظفر کے اشعار میں ذوق کے مقابلے میں جو ایک جھول سا دکھائی دیتا ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ظفر نے قلعۂ معلا کی اس زبان میں شاعری کی جو اہلِ دہلی کے لیے نمونۂ تقلید تھی اور جس نے خود کسی لسانی نمونے کی تقلید نہیں کی۔ اس لیے قلعے سے باہر تو ذوق، مومن، غالب جیسے منفرد شاعر پیدا ہوتے رہے لیکن قلعۂ معلا کی اُردو نے لسانی اعتبار سے ایک ہی طرح کے شاعر پیدا کیے۔ قلعے کے ایسے گمنام شاعروں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ چناں چہ ظفر کی زبان ذوق کے مقابلے میں نسبتاً تفصیلی ہے۔ اس لیے کہ ظفر عموماً بات کو پھیلا کر کہتے ہیں۔ ذوق زبان کے ترکیبی عمل سے کام لیتے ہوئے سمٹے سمٹائے انداز میں بات کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ بادشاہ ں کے مقابلے میں عام شاعروں کے ہاں، اس صورتِ حال کے علاوہ، قصیدہ نگاری کی مشق بھی انھیں زبان کے ترکیبی استعمال پر قدرت دلا دیتی ہے لیکن شاعری چوں کہ صرف مرصع سازی کا نام نہیں ہے اس لیے محض اس بنیاد پر ذوق کو ظفر پر فوقیت نہیں دی جا سکتی۔

ظفر کی شاعری

غالبؔ اردو کے بڑے شاعر ہیں اور انیسویں صدی کے سب سے بڑے شاعر۔ انیسویں صدی کا ہندوستان گوناگوں تبدیلیوں کا حامل ہے۔ یہ ایک ایسا عبوری دَور ہے جو ملکوں اور قوموں کی تاریخ میں روز روز نہیں آتا۔ ایک عہد کی موسیقی وقت کے سمندر کی تہوں میں آہستہ آہستہ ڈوبتی جارہی تھی اور وقت کے سمندر کی تہوں سے ایک اور عہد کی موسیقی آہستہ آہستہ اُبھرتی اور تیز ہوتی جارہی تھی۔ ڈوبتی اور اُبھرتی دونوں موسیقیوں کی دُھنیں ایک ہی ساتھ نشاط انگیز بھی ہیں اور کرب ناک بھی۔ غالبؔ اُبھرتی ہوئی موسیقی کے ساتھ اُٹھتے ہیں اور اس موسیقی کے کرب و نشاط کو اس مشاقی کے ساتھ اپنی گرفت میں لیتے ہیں کہ اپنے دَور کی پوری ادبی فضا پر چھا جاتے ہیں اور جس طرح ہم سُورج سے آنکھیں ملاتے ہوئے سُورج کے سوا اور کچھ بھی دیکھ سکنے کے قابل نہیں رہتے، ٹھیک اسی طرح غالبؔ کے نگاہوں میں سما جانے کے بعد کچھ اور نظر نہیں آتا اور اگر آتا بھی ہے تو بہت دُھندلا دُھندلا سا۔ مومنؔ، ذوقؔ، شیفتہؔ، ظفرؔ۔ یہ سب غالبؔ کے ہی ہم عصر ہیں۔ یقیناً یہ سب اپنی جگہ اُردو کے بڑے اہم شاعر ہیں اور ان سبھوں کی اہمیت کو ان کے مرتبے کے مطابق تسلیم کیا جاتا اگر غالبؔ اُن کے ساتھ نہ پیدا ہوئے ہوتے۔

جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے، انیسویں صدی کو اٹھارویں صدی سے دو بڑی شعری روایتیں ملی تھیں : ایک سوداؔ کی شعری روایت اور دوسری میرؔ کی۔ سوداؔ اور میرؔ کی شعری روایتوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ سوداؔ کی روایت ایک مکتب کا درجہ رکھتی ہے اور میرؔ کی

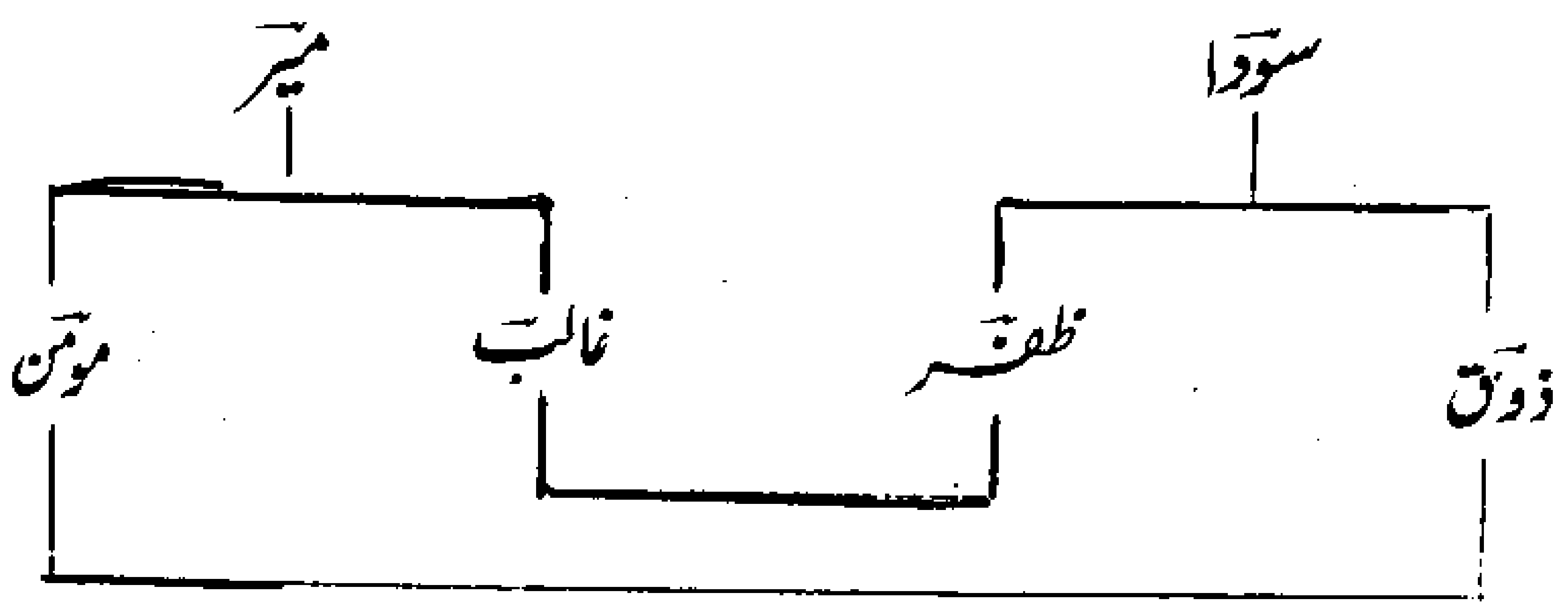
روایت ایک مسلک کا۔ ظفرؔ کے بارے میں کسی تفصیل میں جانے سے پہلے ایک ہلکا سا اشارہ یہ کر دینا ضروری ہے کہ ظفرؔ کے ہاں میریت بھی ہے اور میرزائیت بھی۔ سوداؔ کی میراث کو مکتب سے تعبیر کرنے کا سیدھا سا مطلب ان کے مخصوص رنگِ سخن کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ظفرؔ کے اُستاد اور اُستاد کے اُستاد یعنی شاہ نصیرؔ، میر محمدی مائلؔ کے شاگرد تھے۔ میر محمدی مائلؔ، قائمؔ چاندپوری کے شاگرد تھے اور قائمؔ چاندپوری کو سوداؔ اور دردؔ دونوں سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ اسی لیے قائمؔ کی شاعری میں ایک خوب صورت دوغلاپن ہے اور یہی دوغلاپن استاد اور شاگرد کی کئی نسلوں کے بعد بالآخر ہمیں ظفرؔ کے ہاں ملتا ہے جسے میریت اور میرزائیت کہنے کی ضرورت پیش آئی۔ اس کی مثال یہاں ظفرؔ کے ان دو شعروں سے دی جا سکتی ہے:

کبھی سیدھے نہ ہوتے ہم نے دیکھا نیشِ کژدم کو
تری کس طرح سے نوکِ مژہ اُلٹے سے سیدھی ہو

دوسرا شعر ہے:

تھا جلانا ہی اگر دُوریِ ساقی سے مجھے
تو چراغِ رہِ مے خانہ بنایا ہوتا

میرؔ و میرزا کی ان دو شعری روایتوں کے ساتھ ساتھ انیسویں صدی کی دہلوی شاعری میں دہلویت اور لکھنویت کے دو رُجحان بھی دو دھاروں کی طرح کہیں ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے، کہیں ایک دوسرے میں ضم ہوتے ہوئے اور کہیں ایک دوسرے کے ساتھ بہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بہرحال اگر بات کو ظفرؔ اور ان کے چند قابلِ ذکر معاصرین تک محدود رکھا جائے تو زائچہ کچھ اس طرح تیار ہوتا ہے:



یعنی ایک طرف سودا کی روایت سے ذوق اور ظفر نکل کر آتے ہیں اور دوسری طرف میر کی روایت سے غالب اور مومن۔ لیکن اس طرح کہ بعض سطحوں پر غالب اور ظفر اور بعض دوسری سطحوں پر ذوق اور مومن ہم آہنگ دکھائی دیتے ہیں۔ یعنی یہ کہ رُوحِ عصر تو اپنی اپنی بساط کے مطابق ہمیں غالب اور ظفر کے ہاں جھلکتی دکھائی دیتی ہے، اور پنچایتی اور انفرادی قسم کے معاملات بالترتیب ذوق اور مومن کی شاعری میں کارفرما نظر آتے ہیں۔ اس اعتبار سے فن کارانہ اور تخلیقی سطح پر مومن اگرچہ بڑے شاعر ہیں لیکن ان کا دائرۂ نگاہ محدود ہے۔ اِس لیے ذوق اور مومن، سودا اور میر کی علاحدہ علاحدہ روایتوں سے نکل کر آنے کے باوجود ایک ہی زُمرے میں جا پڑتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ظفر، غالب کے مقابلے میں اپنی تمام ترکم مایگی اور مختلف شعری روایت کے امین ہونے کے باوجود غالب سے قریب دکھائی دیتے ہیں، اِس لیے کہ ظفر ڈوبتی ہوئی موسیقی کے ساتھ ڈوب رہے ہیں اور غالب اُبھرتی ہوئی موسیقی کے ساتھ اُبھر رہے ہیں۔

ظفر کی شاعرانہ اور ادبی لیاقت کے بارے میں محمد حسین آزاد اور اسی قبیل کے لوگوں کی جُل دینے والی رائے کی بنیاد پر کوئی رائے قائم کرنے کا زمانہ بہت پہلے ختم ہو چکا ہے، اِس لیے ظفر کی شاعری کے سارے معاملات کو دلیل کی کسوٹی پر کسنا ہی زیادہ صحیح ہوگا۔

بابر کے زمانے سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک مغل شہنشاہوں میں تصنیف و تالیف کی ایک روایت عام طور پر رہی ہے۔ درباری زندگی نے فنونِ لطیفہ کو ان کے مشاغل زندگی میں شامل رکھا ہے۔ فراغت یا پھر زوال کے زمانے میں، اس لیے کہ زوال بھی ایک طرح کی فراغت ہی مہیا کرتا ہے، درباری مشاغل جن میں شعر و شاعری بھی شامل ہے کچھ زیادہ ہی زور پکڑ جاتے ہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو شاعری کے عروج کا زمانہ وہی ہے جو مغلوں کے زوال کا زمانہ ہے۔

شاہ جہاں کے آخری زمانے سے لے کر شاہ عالم ثانی تک مغل شہنشاہوں اور قلعۂ مُعلّا پر کیا گزرتی رہی اس کے قصے تو بہادر شاہ ظفر نے لال قلعے کی دیواروں سے سُنے ہی ہوں گے، اور پھر شاہ عالم ثانی پر جو کچھ بیتی وہ تو بہت کچھ ظفر کے سامنے کے واقعات ہیں۔ ظفر ۱۷۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۷۸۸ء میں غلام قادر کے ہاتھوں شاہ عالم معزول ہوئے اور انھیں اندھا کر دیا گیا۔ ظفر کی عمر اس وقت بارہ سال تھی۔ ۱۸۰۳ء میں دریائے جمنا کو عبور کر کے لارڈ لیک نے دہلی میں

قدم رکھا۔ شاہ عالم اُس وقت مرہٹوں کی قید میں تھے۔ انگریزوں نے مرہٹوں کے اقتدار کو ختم کرکے دہلی میں اپنی حکومت قائم کردی اور شاہ عالم ثانی کو ایسٹ انڈیا کمپنی کا پنشن خوار بنادیا۔ اورنگ زیب کے بعد سے اب تک مغل شہنشاہ موت اور زیست کی جس کشمکش میں تھے، لارڈ لیک نے انھیں اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات دِلادی۔ اب وہ غلامی کی ایک چھوٹی سی جنت میں تھے لال قلعے کی چہار دیواری میں غمِ زمانہ کی کلفتیں بظاہر ختم ہوگئیں۔ شاہ عالم شاعر بھی تھے، اور آفتاب تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے اردو، برج بھاشا اور فارسی میں اپنی جولانیٔ طبع کے خوب جوہر دکھائے ہیں۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ خارجی رجحانات کا حامل ہے، جس میں ابتذال کی مثالیں انشا اور جرأت کا جواب پیدا کرتی ہیں۔ غرض یہ وہ محرکات تھے جن کی بنا پر دہلی میں ایک نئے دَور کا آغاز ہوا جزوی اعتبار سے یہ خارجی شاعری کا دَور تھا۔ شاہ نصیر اس رجحان کے اوّلین نمائندہ شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں فنّی پینترے بازی کے جوہر دکھلائے ہیں۔ سنگلاخ زمینوں کے استعمال اور قافیہ پیمائی پر زور دیا ہے اور غزل کی مکھی، سر پر طرّہ ہار گلے میں، فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں جیسی زمینوں میں بے شمار غزلیں کہی ہیں۔ ۱۸۰۶ء میں شاہ عالم کا انتقال ہوا۔ ظفر، اس وقت ۳۱ سال کے تھے۔ گویا زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ ظفر نے اپنے دادا شاہ عالم کی صحبت اور تربیت میں گزارا اور شاہ عالم کی بے بسی اور بے مایگی کو بھی انھوں نے بہت قریب سے دیکھا۔ یہی بے بسی اور کم مایگی آگے چل کر ان کو ورثے میں ملی، اس لیے ان کی شاعری کے خمیر میں اس کا داخل ہونا لازمی تھا۔ ظفر کا شاگردِ ذوق ہونا بھی شاہ عالم کی وفات کے بعد ہی ثابت ہوتا ہے۔ ظفر نے شاہ نصیر دہلوی سے متاثر ہوکر مشکل اور سنگلاخ زمینوں میں بھی شعر کہے اور ان کے ہاں وہ شگفتگی، سلاست اور روانی بھی ہے جو ذوق کا طرۂ امتیاز ہے۔ غالب اور مومن نے بھی ظفر کو متاثر تو کیا لیکن غالب کا انداز اور مومن کی باریک بینی دونوں ہی ظفر کے قابو سے باہر کی چیزیں تھیں، پھر بھی انھوں نے بہت کچھ کہا ہے اور ہر رنگ میں کہا ہے۔

ظفر کے کلام کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ وہ اس میدان میں چاروں کھونٹ گئے ہیں۔ ایک کھونٹ تو وہ ہے جہاں انھوں نے قادرالکلامی کا مظاہرہ کیا ہے اور شاہ نصیر اور ذوق کے شاگردِ رشید ہونے کا پورا پورا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ یہاں ان کے ہاں صنعت گری

اور ضلع جگت کا استعمال ہے اور انھوں نے لحاف تنگ شگاف تنگ، صنم چھپا چھپ قدم چھپا چھپ ہنگ کا جوڑا خدنگ کا جوڑا جیسی سنگلاخ زمینوں میں شعر نکالے ہیں۔ ان کی شاعری کا دوسرا کھونٹ وہ ہے جہاں انھوں نے موسیقی کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے گیت، قوالیاں، دوہے، بھجن، ٹھمریاں اور مخمس وغیرہ کہے ہیں اور بجائے ظفرؔ کے شوقؔ رنگ تخلص استعمال کیا ہے۔ اپنے تیسرے کھونٹ کی شاعری میں انھوں نے مذہبی اور متصوفانہ جذبات کا اظہار کیا ہے۔
ہر چند کہ شاہ نصیرؔ اور ذوقؔ نے مشورہ دیا ہوگا کہ تین کھونٹ جانا، پر چوتھے کھونٹ نہ جانا، لیکن داستان کے شہزادے کی طرح وہ اس چوتھے کھونٹ بھی جا کر ہی مانے جہاں انھیں حقیقی شاعری کا گوہرِ مقصود ہاتھ آیا۔ یہ ان کی شاعری کا وہ حصّہ ہے جہاں درد و غم کے افسانے ہیں، رنج و الم کی داستانیں ہیں۔ زخم خوردگی اور سینہ کاوی ہے۔ آنسو ہیں اور آہیں اور خارجی زندگی کی کلفتیں داخلی اذیتوں میں گھلی ملی ہیں۔ اگر وہ صرف اسی چوتھے کھونٹ گئے ہوتے تو نسبتاً بہتر شاعر ہوتے اور پھر ان کی شاعری اتنی چوکھونٹی نہ ہوتی بلکہ اس میں ماورائیت اور ابہام کی وہ پرتیں ہوتیں جن کے ذریعے فن اور غیر فن کے درمیان آسانی کے ساتھ تمیز کی جا سکتی ہے۔ لیکن ایسا کر سکنا شاید ان کے لیے ممکن نہیں تھا اس لیے کہ وہ ظفرؔ ہی نہیں شہنشاہ ظفرؔ بھی تھے۔

ظفرؔ کے کلام میں ایسے اشعار کی اچھی خاصی تعداد ہے جن میں داخلی کیفیات کا بیان ہے۔ زندگی کے تجربات اور احساسات اور وہ تلخ حقیقتیں بھی جن کے ساتھ وہ بظاہر ایک شاہانہ ٹھاٹ باٹ کی زندگی بسر کر رہے تھے، جب ان کے تخلیقی رویّوں میں شامل ہوتی ہیں تو وہ ایسی شاعری کرنے لگتے ہیں جس میں وقار بھی ہے اور اثر بھی، اور یہی وہ مقام ہے جہاں وہ غالبؔ سے خواہ کتنے ہی پیچھے رہ گئے ہوں لیکن شاہ نصیرؔ اور ذوقؔ سے کافی آگے نظر آتے ہیں:

سینے میں اِک دھواں کئی بار، اُٹھ کے رہ گیا
نکلا نہ میرے دل کا غبار، اُٹھ کے رہ گیا

تو ڑی مرنے نہیں غم نے ترے اس طرح سے جان
گھبرا کے غم گسار سرہانے سے اُٹھ گئے

شمع جلتی ہے پر اِس طرح کہاں جلتی ہے
ہڈّی ہڈّی مری اے سوزِ نہاں جلتی ہے

لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار
بے قراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی

ظفر قلعۂ مُعلّا میں ایک بے بسی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ انگریزوں کے قید و بند کے علاوہ اپنے زوال کا خطرہ بھی انھیں سر پر منڈلاتا ہوا نظر آرہا تھا۔ ان سب حقائق کے ٹھوس تاریخی ثبوت موجود ہیں، اس لیے اسے محض ان کا وہم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں صیاد، قفس، بلبل، زنجیر وغیرہ کا ذکر بار بار آتا ہے، جس کی جانب بہت عرصہ پہلے خلیل الرحمان اعظمی بھی اشارہ کر چکے ہیں مخصوص سیاسی حالات میں گھرے ہوئے آخری مغل تاج دار ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ثانی المتخلص بہ ظفر کا ذہنی کرب جب ان کے شعروں میں جھلکتا ہے تو اردو شاعری کی بعض وہ علامتیں جو صدیوں سے پامال ہو رہی تھیں، اچانک جاگ اٹھتی ہیں۔ چناں چہ یہ علامتیں تشبیہوں، استعاروں اور کنایوں کی شکل میں ایک نئی تازگی اور توانائی کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہیں۔ جب ظفر قید و بند کی زندگی سے جھنجھلاتے ہیں تو ان میں ایک باغیانہ جذبہ پیدا ہوتا نظر آتا ہے:

میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں نگہ بانوں کو
میری زنجیر کی آواز نے سونے نہ دیا

قفس کے ٹکڑے اُڑا دوں پھڑک پھڑک کر آج
ارادہ میرا اسیرانِ ہم نفس یوں ہے

برپا نہ کیوں ہو خانۂ زنداں میں روز غل   میرے جنوں سے اب تو سلاسل پہ بن گئی

نام میرے قتل کا منہ پر نہ قاتل لائیو
سر کے دینے کو ہے میرے ساتھ اک عالم رفیق

لیکن ہاتھ پیر مارنے کی اس کیفیت پر بہت جلد ان کی بے بسی قابو پالیتی ہے اور ان کو اپنی اصل حالت کا اندازہ اس طرح ہونے لگتا ہے :

تسمہ تسمہ کر دیا بس کاٹ کر عاشق کی کھال
وہ فرنگی زادِ کلکتہ جو سیکھا ناپنا

جو اس کی جان پہ گزرے ہے وہ ہی جانے ہے
خدا کسی کو جہاں میں کسی کے بس نہ کرے

اپنی بے بسی کا یہ احساس انھیں کبھی کبھی بزدل بھی بنا دیتا ہے اور وہ حالات پر قناعت کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں :

ہمیں بس بس نہ سمجھاؤ اٹھو اے ناصحو، جاؤ
پڑے ہیں ہم کسی ایسے کے بس اب کچھ نہیں چلتی

اے اسیرو اب نہ پر میں طاقتِ پرواز ہے
کیا کروگے تم نکل کر دام سے، بیٹھے رہو

ٹیڑھے جو ہو کے تم سے کہیں کچھ وہ اے ظفر
بولو نہ تم کہ ان کے ہیں یہ بانکپن کے دن

آخر تو پھر تیغِ ستم کے وار ہیں پر ہوویں گے
اور کوئی گر ہوتا ہے اب سینہ سپر ہو لینے دو

میں نے کہا کہو تو مسیحا تمھیں کہوں
کہنے لگے کہ کہنا ابھی پہلے مر تو لو

قلعے میں نہ صرف یہ کہ انگریزوں کا حکم ہی چلتا تھا بلکہ انگریزوں کے جاسوسوں کا جال بچھا ہوا تھا جو بادشاہ کے معاملات کی پل پل کی خبر انگریزوں کو پہنچاتے تھے اس لیے وہ یوں بھی اپنے دل کی بے چینی کا ذکر کرتے ہوئے ڈرتے تھے :

ان روزوں اُس گلی میں جاسوس جا بجا ہیں
کہ دو کوئی ظفرؔ سے واں آج کل نہ جاوے

حقیقت کچھ نہ کچھ اپنی اُدھر اڑتی سی پہنچی ہے
کہیں جاسوس کی ان کو خبر اُڑتی سی پہنچی ہے

جہاں میں اور تو ڈرتے ہیں غیر سے لیکن
ظفرؔ رہے ہے مجھے اپنے آشنا کا خوف

ایک بدگو ہو تو میں اس کے سخن کو پکڑوں
واں سبھی ایسے ہیں کس کس کے سخن کو پکڑوں

وہ بادشاہت جو ظفرؔ کو ملی تھی برائے نام تھی بلکہ ان کے لیے وبالِ جان بھی تھی۔ اُن کے سر پر بادشاہت کے نام پر ایک کانٹوں کا تاج رکھا ہوا تھا اور انھیں اس حقیقت کا بخوبی احساس تھا کہ مغل بادشاہوں کے اختیارات کو شاہ عالم کے زمانے سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک اور پھر ولی عہد بہادر مرزا فخرو کے ساتھ ہونے والے معاہدے میں بھی کس طرح رفتہ رفتہ محدود اور کم کیا گیا ہے۔ اس حقیقت کا نہایت ہی خوب صورت اظہار انھوں نے شمع اور گل گیر کے رشتے سے کیا ہے جس طرح گل گیر کے ذریعے شمع کا گل کٹنے کے ساتھ ساتھ شمع کا

قد چھوٹا ہوتا جاتا ہے، بالکل وہی کیفیت مغل تاج داروں کی تھی:

کہے تھی شب یہ گل گیر شمع رو رو کر
وبال سر پہ مرے تاجِ زر بنایا تھا

اسی طرح یہ شعر بھی کانٹوں کے اس تاج کا غماز ہے:

نصیب اچھے اگر بلبل کے ہوتے
تو کیوں پہلو میں کانٹے گُل کے ہوتے

ظفؔر نے اپنی حالتِ زار کو بلبلِ قفس سے تعبیر کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس سے بھی تھوڑا آگے بڑھ کر انھوں نے بلبلِ تصویر سے اپنی مثال بہم پہنچائی ہے۔ بلبلِ تصویر کی تشبیہہ یا یوں کہیے کہ امیجری ظفؔر کے سیاق و سباق میں بڑی بھرپور ہے۔ اس لیے کہ بلبلِ تصویر میں تصویر کی سی حیرت تو ہے ہی لیکن اس سے بھی بڑا المیہ یہ ہے کہ بلبلِ تصویر کے لیے اسیری اور آزادی دونوں کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ بلبلِ تصویر کی تشبیہہ بھی اور تشبیہوں کی طرح نئی نہیں ہے لیکن ظفؔر کے ہاں یہ بھی قدرے غیر روایتی سی لگتی ہے:

خانۂ صیاد میں ہوں طائرِ تصویر وار
پر نہ آزادوں میں ہوں میں نے گرفتاروں میں ہوں

چمنِ دہر میں وہ بلبلِ تصویر ہوں میں
کہ مجھے رنگِ بہاران و خزاں ایک سا ہے

برنگِ طائرِ تصویر ہوں میں دامِ حیرت میں
رہائی کی مری کوئی جو صورت ہو تو کیوں کر ہو

اے صبا ہوں بلبلِ تصویر مجھ کو کیا خبر
کب بہار آئے ہے گلشن میں خزاں کب جائے ہے

نہیں ہے طائرِ تصویر آسا دامِ حیرت میں
کسی صورت رہائی ہم گرفتاروں کی قسمت میں

طائرِ تصویر ہونے کا احساس بالآخر انھیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ وہ ایک ایسے جبر میں مبتلا ہیں جس پر وہ کبھی قدرت حاصل نہیں کر سکتے :

اب تو پھڑکے ہے قفس میں بلبلِ تازہ اسیر
کوئی دن کو دیکھنا اس کو یہیں ہل جائے گی

اُڑ گئی صیّاد اب دل سے ہوس پرواز کی
بیٹھا رہنے دے قفس میں ہم کو پر جھاڑے ہوئے

کھول دے صیّاد تو کھڑکی قفس کی شوق سے
بلبلِ بے بال و پر ظالم کدھر اُڑ جائے گی

اے گرفتاری تری دولت سے تا قیدِ حیات
جائے گی اپنے تصرف سے نہ جاگیرِ قفس

بعض جگہ انھوں نے اپنے حالِ زار کی طرف بہت لطیف اشارے کیے ہیں۔ محاورہ ہے چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ اسی طرح بادشاہت بھی ایک بادشاہ سے دوسرے بادشاہ کو منتقل ہوتی ہے۔ اورنگ زیب کے بعد مغلوں میں بے نور بادشاہتوں کا زمانہ شروع ہوتا ہے اس لیے یہی بے نور بادشاہت ظفؔر کو بھی ورثے میں ملی۔ اس حقیقت کا اظہار انھوں نے چراغ سے چراغ جلنا محاورے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک شعر میں اس طرح کیا ہے :

آہِ آتش بار کیا نکلے دلِ پر داغ سے
ہم نے روشن کی ہے بارو یہ چراغِ گل سے شمع

انھی کیفیتوں کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو :

صحبتِ گل ہے فقط بلبل سے کیا بگڑی ہوئی
آج کل سارے چمن کی ہے ہوا بگڑی ہوئی

ظفر کے ان تمام اشعار سے بحث کرنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ اشعار اپنے سیاق وسباق میں بہترین شعری کیفیات کے حامل ہیں اور خود ظفر کے بہترین اشعار میں ان کا شمار ہوتا ہے، وہ آفاقیت ان اشعار میں پھر بھی نہیں جو میر یا غالب کے ان شعروں میں ہے جو ہر زمانے کو اپنے اندر ڈھال لیتے ہیں اور یہ فرق دو شاعروں کی ذہنی سطح کا ہے جو کبھی بھی دور نہیں کیا جا سکتا۔ بہادر شاہ ظفر ہندوستان کی تاریخ کے ایک خاص عہد کا نام ہے اور غالب اس عہد کی آواز ہیں۔ حیات و کائنات کی پیچیدگیوں کا بھرپور احساس اور روحِ عصر کو اپنے اندر جذب کر لینے کی جو صلاحیت غالب میں تھی، وہ ان کے ہم عصروں میں ظفر تو کیا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ غالب نے داخلی کیفیتوں کے جھروکوں سے خارجی دنیا کی سیر کی ہے اس لیے وہ خارجی مظاہر کے بطون میں بھی پوری گہرائی تک پہنچنے کے اہل تھے۔ ظفر اپنے ہی غم خانے میں اتنے محو تھے کہ آنکھ اُٹھا کر کچھ نہ دیکھ سکے۔ ان کی کیفیت کو فیض احمد فیض کے ان دو مصرعوں کی مدد سے بیان کیا جا سکتا ہے:

حسنِ محبوب کے سیّال تصوّر کی طرح
اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے لپٹائے ہوئے

ظفر ایک ڈوبتی ہوئی کشتی کے ایسے بزدل اور کمزور مسافر ہیں جو کشتی سے باہر سمندر میں چھلانگ لگا کر موجوں کے تھپیڑوں سے لڑتا ہوا نہیں مرنا چاہتا بلکہ وہ اسی ڈوبتی ہوئی کشتی کے تختوں کے نیچے سر چھپانے میں ہی عافیت سمجھتا ہے:

ڈرتا ہوں موجِ بحرِ محبت سے اے ظفر
ہاتھ آتے آتے دامنِ ساحل ڈبو نہ دے

غالب اور ظفر کے فرق کو سمجھنے کے لیے اُن اشعار سے کافی مدد مل سکتی ہے جہاں غالب اور ظفر دونوں کے ہاں ایک دوسرے سے کسی نہ کسی قسم کے توارد یا سرقے کا گمان ہوتا ہے۔ ایسے تمام اشعار میں غالب ظفر سے کئی کوس آگے ہیں۔ چند شعر یہ ہیں:

اے عشق کیا صلاح ہے تیری بتا مجھے
لوں شیخ کے قدم کہ پڑوں برہمن کے پانو
ظفر ____________

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے
غالب ____________

بازارِ محبّت میں نہ دل بیچ تو اپنا
بِک جاتا ہے ساتھ اس کے ظفرؔ بیچنے والا
ظفر ____________

بِک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ ہُنر کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر
غالب ____________

سنتے ہیں باغ میں گری بجلی
جَل گیا ہو نہ آشیاں اپنا
ظفر ____________

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی، وہ میرا آشیاں کیوں ہو
غالب ____________

ہر جائے ہے قدرت کا تماشا مرے آگے
لیکن مری غفلت کا ہے پردا مرے آگے
ظفر ____________

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
غالب ____________

سبب کچھ اس خموشی میں ہے اپنی اے ظفر ورنہ
زباں منہ میں ہمارے بھی ہے، ہم بھی بول سکتے ہیں

ظفر

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

غالب

میرے سمجھانے کو آئے حضرتِ ناصح ہیں آج
دیکھیے کیا مجھ کو سمجھاتے ہیں سمجھانے تو دو

ظفر

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

غالب

یہ ضروری نہیں کہ غالب کے قد سے ہی ہر شاعر کے قد کو ناپا جائے کیوں کہ اگر ایسا کیا گیا تو ہمارے پاس غالب کے سوا اور کچھ نہیں رہ جائے گا۔ ظفر کے اتنے سارے اشعار کو یہاں معرضِ بحث میں لانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ظفر کی زبان ہمارے سامنے آئے اس لیے کہ ظفر کو ہمیں اس نقطۂ نظر سے بھی دیکھنا ہوگا کہ زبان کے معاملے میں ظفر کا رول کیا ہے۔

ظفر کے استاد ذوق کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے ٹھیٹھ اُردو میں شعر کہے ہیں۔ ان کے ہاں روزمرہ کی بے تکلفی اور زبان کی سادگی میں آمد کی سی کیفیت ہے۔ اگرچہ انھوں نے اپنے اشعار میں فارسی ترکیبیں اور اضافتیں بھی استعمال کی ہیں لیکن بہت کم۔ وہ مشکل سے مشکل بات کو نہایت سہل انداز میں کہنے کا فن جانتے ہیں۔ غالب اور مومن دونوں ذوق سے بہتر شاعر ہیں لیکن ان میں سے کسی کے ہاں بھی وہ اُردو پن نہیں ہے۔ اس عہد میں قلعۂ معلّا کی زبان کے نمائندے ذوق اور ان کے شاگرد ظفر ہی ہیں۔ حالی اور سر سید نے زبان کے معاملے میں ذوق پر ظفر کو ترجیح دی ہے۔ حالی لکھتے ہیں :

"ذوقؔ کی غزل میں عموماً زبان کا چٹخارا اپنے معاصرین سے زیادہ ہے مگر وہ بھی جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں صفائی سے دُور جا پڑتے ہیں۔ ظفرؔ کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرّہ کی خوبی سے اوّل سے آخر تک یکساں ہے۔"

(مقدمہ شعر و شاعری)

اسی طرح سرسیّد کے ساتھ ایک گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے مولوی عبدالحق نے لکھا ہے:

"ایک بار ظفرؔ اور ذوقؔ پر گفتگو چھڑ گئی اور وہی پُرانی بات دہرائی گئی کہ ظفرؔ کے سب دیوان ذوقؔ کے لکھے ہوئے ہیں۔ سیّد صاحب اس پر چیں بہ جبیں ہوئے اور فرمایا وہ بادشاہ کا کلام تو کیا لکھتا قلعے کے تعلّق سے خود ذوقؔ کو زبان آگئی۔"

(چند ہم عصر)

فراقؔ نے ذوقؔ پر اپنے ایک طویل مضمون میں ظفرؔ کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"اُردو شاعری کی تاریخ اور روایتوں میں جو فائدے استادوں نے شاگردوں سے اُٹھائے ہیں وہ ہمیشہ صیغۂ راز میں رہے اور ظفرؔ کوئی معمولی شاگرد نہیں تھا۔ وہ ذوقؔ کی شاعری اور شاعرانہ ذہنیت کی فضا بن گیا تھا۔"

(انداز ے)

غالبؔ کا عہد اس معنی میں بھی اہم ہے کہ اسی عہد میں ایک عہد ظفرؔ کا بھی ہے۔ یہ عہد اُردو زبان کے اعتبار سے کافی اہم ہے۔ اگر غالبؔ نے اُردو شاعری میں فکر و فلسفے کی صدا بلند کی ہے تو ظفرؔ اور ان کے عہد کے بہت سے دوسرے فن کاروں نے اردو زبان کو صحیح معنوں میں نکھارا ہے۔ اور اس میں دھرتی کی بو باس پیدا کی ہے۔ عہدِ ظفرؔ کی یہی میراث مختلف نسلوں سے منتقل ہوتی ہوئی آج ہمارے پاس ہے۔

ظفرؔ کی ایک غزل

کسی بھی فن پارے کی عام طور پر دو حیثیتیں قرار دی جاتی ہیں۔ ایک تو اُس کی معروضی حیثیت یعنی یہ کہ بظاہر جیسا وہ ہے، اور دوسری اس کی وہ حیثیت جیسا کہ وہ مختلف پرستارانِ فن کو اُن کی اپنی اپنی ذات کے حوالے سے دکھائی دیتا ہے۔ فن پارے کی یہ دوسری حیثیت بڑی ہمہ گیر اور جاودانی ہے۔ اس لیے کہ یہاں وہ فن پارہ تاریخ کے اس عہد سے نکل کر جس نے اسے جنم دیا ہے، تاریخ کے اس عہد میں داخل ہو جاتا ہے جس عہد میں اُسے سمجھا، یا سراہا جا رہا ہے۔ فن پارے کی معروضی حیثیت بظاہر مبہم بلکہ بے معنی سی لگتی ہے، اِس لیے کہ جب کوئی پرستارِ فن اسے اپنے اضافی نقطۂ نظر کے بغیر دیکھ ہی نہیں سکتا تو پھر محض معروضی حیثیت کے کیا معنی۔ اس اعتبار سے کسی بھی فن پارے کی دو حیثیتیں نہیں بلکہ شاید تین حیثیتیں ہوتی ہیں یعنی ایک تو وہی اُس کی نام نہاد معروضی حیثیت، دوسرے اسے دیکھنے کا پرستارانِ فن کا اپنا اپنا انفرادی نقطۂ نظر اور تیسرے فن کار کی زندگی اور اُس کے زمانے کی وہ سچائیاں جنھوں نے فن پارے کو جنم دیا ہے اور یہی وہ مقام ہے جو بسا اوقات شعر کی تشریح کا جواز پیدا کرتا ہے۔ ورنہ تشریحِ شعر بڑا احماقت آمیز عمل معلوم ہوتا ہے جس پر خود شاعر بھی جھلّا کر یہ کہہ اُٹھتا ہے، "شعرِ مرا بہ مدرسہ کہ برد" گویا اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے شعر کی معروضی حیثیت کو بھول جائیں تو ہمارے سامنے شعر کی دو جہتیں آتی ہیں۔ ایک جہت تو شعر کی یہ ہے کہ وہ کیوں کر وجود میں آیا۔ اس کے لیے ہم شعر کے ماضی میں سفر کرتے ہوئے اس کے نقطۂ آغاز تک پہنچ کر دم

لیتے ہیں اور اس عمل میں ہم شاعر کے بطون میں بھی سرایت کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس معاملے میں یہ ضروری نہیں کہ ہم صحیح نتیجے پر پہنچ ہی جائیں، تاہم مختلف علوم کی دریافتوں کی طرح ہم شعر سے متعلق اپنی دریافت کو بھی اُس وقت تک صحیح ماننے پر مجبور ہیں جب تک کہ کوئی نئی دریافت ہماری دریافت کو رد نہ کر دے۔ شعر کی دوسری جہت یہ ہے کہ وہ ہمیں کہاں تک لے جاتا ہے۔ یہاں پر شعر کبھی کبھی تاریخ کے کبھی نہ ختم ہونے والے سفر میں ہمیشہ ہی ہمارے دوش بدوش چلتا نظر آتا ہے۔

شعر کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے اس کی ان دونوں جہتوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ ہر شعر میں ان جہتوں کے درجات ہوتے ہیں اور ان درجات کے اعتبار سے شعر کی قدر و قیمت کی چار صورتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ شعر پہلی جہت کے اعتبار سے توانا ہو لیکن اس کی دوسری جہت ہمیں بہت دور تک نہ لے جاتی ہو یعنی اس میں قاری کے انفرادی اندازِ فکر کی گنجائش بہت کم ہو۔ دوسری یہ کہ شعر پہلی جہت کے اعتبار سے گہرا نہ ہو لیکن اس کی دوسری جہت ہمہ گیر ہو۔ تیسری یہ کہ شعر دونوں حیثیتوں سے ہمہ گیر ہو اور چوتھی یہ کہ وہ دونوں میں سے کسی بھی حیثیت سے اہم نہ ہو۔ اس اعتبار سے ظفر کی زیرِ غور غزل کو ہم پہلی قسم میں شمار کر سکتے ہیں یعنی اس غزل کے اشعار صحیح تاریخی سیاق و سباق میں بھرپور توانائی کے حامل ہیں لیکن ہمارے انفرادی یا اضافی اندازِ فکر کی گنجائش ان اشعار میں کم ہے۔ اس غزل کا مطلع ہے:

یا مجھے افسرِ شاہا نہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایا نہ بنایا ہوتا

اِس مطلعے کا پہلا مصرع اس طرح بھی دیکھنے کو ملتا ہے:

یا تو افسر مرا شاہا نہ بنایا ہوتا

لال قلعے کی فصیل کے بادلوں کو چھوتے ہوئے کنگورے اور لال قلعے کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے گہری اور چوڑی کھائی اس بات کی توضمانت ہو سکتی ہے کہ لال قلعے میں حتی الامکان کسی اجنبی کا گزر نہ ہو لیکن لال قلعے کے اندر سے باہر آنے والی خبروں کو نہ کبھی یہ فصیل روک سکی ہے اور نہ کھائی۔ یہی وجہ ہے کہ عام آدمی کی دسترس سے بہت دُور رہنے والے بادشاہوں کی

زندگی کی جتنی باتیں ہمیں معلوم ہوتی ہیں، اتنی باتیں ہم اپنے اردگرد رہنے والوں کے بارے میں بھی نہیں جانتے۔ آج بہادر شاہ ظفرؔ کی زندگی کے جتنے حقائق ہمارے سامنے ہیں، اتنے ان کے ہم عصر شاعروں ذوقؔ، مومنؔ اور غالبؔ کے بھی نہیں ہیں۔ ایسی حالت میں اگر بہادر شاہ ظفر شاعر بھی ہوں، جو وہ ہیں، تو اُن کے فن کی تی بطنِ شاعر معنویت کو بروے کار لانے میں ہماری ذمے داریاں کچھ زیادہ ہی ہو جاتی ہیں۔

زیرِ نظر غزل کی ایک خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ ایک دو اشعار کو چھوڑ کر لگ بھگ ساری غزل ایک ہی موڈ کے تابع ہے اور بیشتر اشعار ایک ہی طرح کی کیفیت کے حامل ہیں۔ ان اشعار میں شاعر اپنی بے بسی اور بے چارگی کا تذکرہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اُسے اِس بات کا شدید احساس ہے کہ وہ مادّی اعتبار سے بے بضاعت ہے اور یہ بھی کہ وہ روحانی کم مایگی کا شکار ہے۔ بہ ایں ہمہ وہ اپنے اندر بادشاہت کی بو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ یعنی اگر وہ بادشاہت میں ناکام و نامراد ہے تو کم از کم فقیری میں تو وہ فقیروں کا بادشاہ ہو۔ وہ ایک شدید قوّتِ احساس کا مالک ہے اور شاید یہی اُس کی زندگی کا المیہ بھی ہے، اِس لیے کہ وہ ہوسِ دنیا اور استغنا کے جس دوراہے پر کھڑا ہے اور جس تضاد کا شکار ہے، وہ تو اپنی جگہ ہے ہی لیکن دراصل جو چیز اُسے مارے ڈال رہی ہے وہ اس تضاد کا شدید احساس ہے۔ بات کو اور آگے بڑھانے سے پہلے یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ غزل کے اُن اشعار کو ایک بار یہاں دہرا دیا جائے جو اس بحث سے براہِ راست متعلق ہیں:

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا　　یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
خاکساری کے لیے گرچہ بنایا تھا مجھے　　کاش خاکِ درِ جانانہ بنایا ہوتا
صوفیوں کے جو نہ تھا لائقِ صحبت تو مجھے　　قابلِ جلسۂ رندانہ بنایا ہوتا
تھا جلانا ہی اگر دوریِ ساقی سے مجھے　　تو چراغِ رہِ میخانہ بنایا ہوتا
دلِ صد چاک بنایا تو بَلا سے لیکن　　زلفِ مُشکیں کا ترے شانہ بنایا ہوتا

روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفرؔ
ایسی بستی سے تو ویرانہ بنایا ہوتا

مقطعے کے پہلے مصرعے کو بھی بعض لوگ اس طرح پڑھنے پر اصرار کرتے ہیں :

زورِ معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر

آخری مغل تاج دار بہادر شاہ ظفر کے جو حالات ہمارے سامنے ہیں اور ہندوستان اور نو دمغلیہ حکومت کی تاریخ کے ایک انتہائی تیکھے موڑ پر ہم انھیں جس طرح کھڑا پاتے ہیں، اس کی روشنی میں جب ہم ان کی یہ غزل پڑھتے یا سنتے ہیں تو کچھ جاننے کی کوشش میں ان اشعار پر سوچنے کے بجائے سب کچھ جانے ہوئے ہونے کی سی حالت میں ہم ان پر سر دھننا شروع کر دیتے ہیں لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ آیا یہ شعر ہیں سوچنے کی دعوت دیتے ہیں یا سر دھننے کی۔ اس لیے کہ بہادر شاہ ظفر جیسے شاعر کے اشعار کی تفہیم کے لیے ان کے تاریخی سیاق و سباق کو مدِ نظر رکھنا بڑا ضروری ہے۔

بہادر شاہ ظفر کی یہ غزل ان کے دیوانِ اوّل میں شامل ہے۔ ظفر کا دیوانِ اوّل ان کے زمانۂ ولی عہدی میں مکمل ہو چکا تھا۔ یعنی یہ غزل بہادر شاہ ظفر نے اپنی بادشاہت کے زمانے میں نہیں کہی اور جس دیوان کی یہ غزل ہے، اس کی تکمیل کے ستائیس یا اٹھائیس برس بعد وہ تخت نشین ہوئے۔ ان حقائق سے یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ مطلعے میں 'مجھے' اور 'مرا' کے الفاظ بہادر شاہ ظفر نے اپنی بادشاہت کے لیے نہیں بلکہ زوال آمادہ مغل حکومت کے ان تمام بادشاہوں کے لیے استعمال کیے ہیں جن میں سے کچھ کی داستانِ غم تو ظفر نے سُنی تھی اور جن میں سے دو کو یعنی اپنے دادا شاہ عالم ثانی اور اپنے باپ اکبر شاہ ثانی کو انھوں نے انتہائی بے بسی اور بے چارگی کے عالم میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اکبر شاہ ثانی کے فرزندِ اکبر ہونے کی حیثیت سے وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ ایسا ہی بے بس و لاچار بادشاہ وہ آگے چل کر خود بھی ہونے والے ہیں۔

ظفر نے اکتیس برس شاہ عالم ثانی کی صحبت اٹھائی۔ وہ ایک شاعر کا حساس دل تو رکھتے ہی تھے لیکن جن مخصوص حالات میں ان کی نشو و نما ہوئی انھوں نے ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں ایک اہم رول ادا کیا۔ شاہ عالم کی طرح تصوّف کی جانب انھوں نے بھی رجوع کیا۔ یہاں تک کہ دیوانِ اوّل کی تکمیل سے قبل ہی وہ فارسی نثر میں گلستانِ سعدی کی ایک انتہائی

بسیط شرح متصوفانہ انداز میں لکھ چکے تھے۔ انھیں صوفیانہ مسلک پسند تھا لیکن وہ لال قلعے کے مغلیہ خاندان کے چشم و چراغ تھے اور شاہ عالم ثانی کے پوتے اور اکبر شاہ ثانی کے فرزندِ اکبر ہونے کے ناتے لال قلعے کی بادشاہت اُن کی منزل بھی تھی اور اُن کا مقدر بھی۔ بہادر شاہ ظفر طبیعت کے اعتبار سے بزدل واقع ہوئے تھے۔ ان میں قوتِ ارادی کی کمی تھی۔ وہ صورتِ حال کا سامنا کرنے کے بجائے اس سے فرار حاصل کرنے میں عافیت سمجھتے تھے۔ تصوف میں صبر، شکر، قناعت اور توکل کا جو تصور تھا اُس کی جانب وہ ذہنی طور پر راغب نظر آتے ہیں لیکن تصوف کے ساتھ ان کی یہ رغبت رومانوی فکر سے آگے نہ بڑھ سکی۔ وہ تصوف کو ذریعۂ نجات سمجھتے رہے لیکن اسے مسلک بنانے کے لیے جس نفس کشی کی ضرورت تھی وہ ان میں مفقود تھی۔ مطلعے کے دوسرے مصرعے میں لفظ 'تاج' سر، دماغ، مزاج یا افتادِ طبع کے معنوں میں آیا ہے اور پہلے مصرعے کے افسرِ شاہانہ کی رعایت سے یہ بہت خوب معلوم ہوتا ہے۔ یعنی وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میرے سر میں گدائی کا وہ سودا نہیں سما سکا جو مجھے گدائی کی معراج پر پہنچا دیتا، اس طرح نہ تو میں بادشاہت میں ہی کمال کو پہنچ سکا اور نہ گدائی میں۔

شاہ عالم ثانی بہادر شاہ ظفر کے معنوی استاد تھے اور وہی ان کا ماڈل بھی تھے۔ ظفر نے اپنے ماڈل شاہ عالم ثانی کی ذات کا مشاہدہ بخوبی کیا ہے اور اس میں اپنے مستقبل اور اپنی ذات کی جھلک بھی دیکھی ہے۔ ہر حال میں بادشاہت سے چمٹے رہنا شاہ عالم کی کمزوری تھی اور تصوف ان کی ایسی منزل تھی جس تک پہنچنے کا ان کے پاس کوئی اخلاقی سامان نہیں تھا۔ یہی وہ تضاد ہے جو بہادر شاہ ظفر کو شاہ عالم ثانی کی زندگی میں نظر آتا ہے اور جسے وہ خود اپنے سینے میں بھی کانٹے کی طرح کھٹکتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ وہ اس تضاد سے پوری طرح باخبر ہیں اور اس حقیقت سے بھی کہ اُن میں اتنی سکت نہیں کہ اس تضاد کے حصار کو توڑ کر باہر آ سکیں۔ اس لیے وہ اپنی بے عمل زندگی کے گرد ایک طرح کی خوش فہمی کا جال بُنتے رہتے ہیں۔ غزل کی ردیف 'بنایا ہوتا' بنایا ہوتا اسی کیفیت کی غماز ہے۔

غزل کے مطلعے اور دوسرے کئی شعروں سے گویا یہ بات صاف ہو کر سامنے آتی ہے کہ زوال آمادہ مغل حکومت کے بادشاہ ایک دوہری بے بسی کا شکار تھے ان میں سے ایک اُن

کی خارجی بے بسی تھی اور دوسری داخلی ! خارجی بے بسی نے آخری مغل بادشاہوں کو لاچار کر کے ڈال دیا تھا اور نسل بعد نسل ان کی یہ لاچاری بڑھتی ہی جارہی تھی مغل بادشاہوں کے اختیارات جس طرح روز بروز محدود ہوتے جارہے تھے، اس کا ثبوت دیوانِ اوّل کے ہی اس شعر سے ملتا ہے :

کبھی تھی شب تہ گل گیر شمع رو رو کر
وہاں سر پہ مرے تاجِ زر بنا یا تھا

ظفر کے اس شعر میں بھی زیرِ بحث غزل کے مطلع والا تاج موجود ہے اور یہاں یہ کانٹوں کا تاج ہے لیکن اس بڑھتی ہوئی لاچاری کے باوجود ایک المیہ یہ تھا کہ وہ اس لاچاری کے عادی ہو چکے تھے اور برابر اس کے ساتھ مصالحت کرتے جارہے تھے۔ دیوانِ اوّل کا ہی ایک اور شعر ملاحظہ ہو جو اِس مصالحت پسندی کا ترجمان ہے :

اب تو پھڑکے ہے قفس میں بلبلِ تازہ اسیر
کوئی دن کو دیکھنا اس کو یہیں ہل جائے گی

دوسری وہ داخلی بے بسی تھی جہاں اُن کا احساس، عمل سے عاری تھا، جس کی وجہ سے نہ تو وہ موجودہ صورتِ حال کو بدل ہی سکتے تھے اور نہ اُس سے نکل کر باہر آسکتے تھے ۔ ظفر نے موجودہ غزل میں اس داخلی بے بسی کو خاکساری کا نام دیا ہے اور اس خاکساری کو مقدر کے طور پر تسلیم کرتے ہوئے کہا ہے :

خاکساری کے لیے گرچہ بنایا تھا مجھے
کاش خاکِ درِ جانانہ بنایا ہوتا

غزل کے مطلعے میں جو بات کہی گئی ہے اس بات کو ایک اور شعر میں ترتیب بدل کر اس طرح کہا گیا ہے :

صوفیوں کے جو نہ تھا لائقِ صحبت تو مجھے
قابلِ جلسۂ رندانہ بنایا ہوتا

غزل کا سب سے خوب صورت شعر یہ ہے :

تھا جلانا ہی اگر دُوریِ ساقی سے مجھے
توچراغِ رہِ میخانہ بنایا ہوتا

اس شعر میں 'چراغِ رہِ میخانہ' کی امیجری بہت عمدہ ہے۔ مغل شہنشاہوں کا کرب شاید سب سے زیادہ اس شعر میں اُبھر کر آیا ہے اِس لیے کہ یہ شعر دوسرے شعروں کی طرح یک رُخا نہیں ہے بلکہ دونوں جہتوں کے اعتبار سے توانا اور تاریخ میں بہت دُور تک جانے والا شعر ہے۔
ظفر ۱۷۷۵ء میں پیدا ہوئے تھے۔ چناں ۱۷۸۸ء میں جب غلام قادر نے شاہ عالم کو معزول کر کے اندھا کر دیا تھا تو اُس وقت وہ بارہ برس کے ہو چکے تھے اور انھوں نے ہوش سنبھالنا شروع کر دیا تھا۔ ظفر نے یہ ہولناک منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا۔ اس لیے کہ ظفر کے حالاتِ زندگی سے پتا چلتا ہے کہ ان کا زیادہ تر وقت اپنے دادا شاہ عالم ثانی کی صحبت میں ہی گزرتا تھا۔ کچھ دن بعد شاہ عالم ثانی پھر تخت پر بٹھا دیے گئے۔ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی فوجوں نے دریاے جمنا کو پار کر کے دہلی پر قبضہ کیا اور مغل بادشاہ شاہ عالم کو انگریزوں کا پنشن خوار بنا دیا گیا۔ ظفر نے یہ ظلم بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس وقت ان کی عمر اٹھائیس سال کی تھی۔ ۱۸۰۶ء میں شاہ عالم ثانی کا انتقال ہوا، جو یقیناً ظفر کے لیے ایک عظیم صدمہ تھا۔ شاہ عالم ثانی کے بعد جب اکبر شاہ ثانی تخت نشین ہوئے تو انھوں نے تخت پر بیٹھتے ہی اپنے بڑے بیٹے یعنی ظفر کو نظرانداز کر کے چھوٹے بیٹے مرزا جہاں گیر کو ولی عہد نامزد کرانے کی کوششیں شروع کر دیں اور جب اس میں وہ ناکام رہے تو دوسرے بیٹے مرزا سلیم کے بارے میں یہی کوششیں شروع ہو گئیں۔ اِس معاملے میں ظفر پر بے ہودہ الزام لگائے گئے اور ان کو ایک دو بار زہر دینے کی کوشش بھی کی گئی۔ یہ تصفیہ ۱۸۱۰ء کے آس پاس آکر ختم ہوا۔ یہی زمانہ دیوانِ اوّل کی تکمیل کا بھی ہے۔ غلام قادر کے حملے سے لے کر ولی عہدی کے نزاع تک انھیں جن خرابیوں کا سامنا کرنا پڑا اور جن میں سے صرف ایک خرابی یعنی ولی عہدی کا زمانۂ نزاع اُن کی اپنی ذات سے اور بقیہ شاہ عالم ثانی کی ذات سے متعلق تھیں؛ اُن کے سیاق و سباق میں اس غزل کے مقطعے کو سمجھنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔

روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفرؔ
ایسی بستی سے تو ویرانہ بسایا ہوتا

ظفرؔ کا مخصوص رنگ اس غزل میں پوری طرح نمایاں ہے۔ وہ خالص اردو زبان میں شعر کہتے ہیں۔ معانی کی سطح پر بھی وہ ان فلسفیانہ بلندیوں کو چھونے کی کوشش نہیں کرتے جہاں شاعر مابعد الطبیعاتی مسائل سے دو چار ہو کر خود تو اُلجھن کا شکار ہوتا ہی ہے، اپنے قاری کو بھی اُلجھن میں ڈالتا ہے۔ اِس لیے ظفرؔ کے اشعار پر بالعموم اور اس غزل پر بالخصوص شاید اُس انداز سے غور و فکر کی گنجائش نہیں ہے جس انداز سے ہم مثلاً غالبؔ کے بعض اشعار پر غور کرتے رہے ہیں۔

کتابیات

دستاویزات

عیارالشعرا (مائیکروفلم) : خوب چند ذکا، مملوکہ دہلی یونیورسٹی لائبریری، دہلی

مکتوبات اردو کا ادبی اور تاریخی ارتقا (غیر مطبوعہ) : خواجہ احمد فاروقی، مملوکہ دہلی یونیورسٹی لائبریری، دہلی

MUTINY PAPERS

National Archives of India, New Delhi.

Collection No. 15	File No. 5
Collection No. 15	File No. 20
Collection No. 15	File No. 384
Collection No. 21	File No. 19 & 78
Collection No. 22	Page No. 1 - 3
Collection No. 23	
Collection No. 24	
Collection No. 30	
Collection No. 56	File No. 7
Collection No. 57	File No. 539 -41
Collection No. 85	File No. 24
Collection No. 94	File No. 7
Collection No. 98	File No. 3
Collection No. 100	File No. 94
Collection No. 101	File No. 8
Collection No. 102	File No. 67 & 69
Collection No. 102	File No. 103
Collection No. 102	File No. 110
Collection No. 103	File No. 134
Collection No. 120	File No. 103 & 144
Collection No. 135	File No. 169 & 170
Collection No. 142	File No. 144

CONT............

MUTINY PAPERS

Collection No. 194	File No. 30
Collection No. 199	
Collection No. 200	File No. 49
Collection No. 200	File No. 50
Collection No. 200	File No. 51

FOREIGN DEPARTMENT RECORDS

National Archives of India, New Delhi.

Political	A	No. 82 - 85	
Political	A	No. 163 - 64	
Political	A	No. 15 - 17	April 1868
Political	A	No. 104	
Political	A	No. 220	(Proceeding Vol. P.386)
Political	A	No. 217-20	(Proceeding Vol.P.331-35)
Political	A	No. 1407	Dec. 1858
Political	A	No. 1430	Dec. 1858
Finance	B	No. 69 - 72	Feb. 1882
International	B	No. 9 - 13	Nov. 1884
International	B	No. 140 - 42	Aug. 1886
Political	B	No. 39 - 40.	Apr. 1884
Political	B	No. 40 - 41	Feb. 1880
Political		No. 254 - 61	
Political		No. 57	
Political		No. 65 - 66	
Political		No. 160	
Political		No. 162	
Political		No. 185	
Political		No. 51 - 78	(K.W.)

Cont....

FOREIGN DEPARTMENT POLITICAL

Political		No. 52 - 125	Dec. 1858
Political	Cons.	No. 144	May 1859
Political	Cons.	No. 325	
Political	Secret	No. 56 - 57	
Political	Progress	No. 74 - 76	Mar. 1859
Political	Progress	No. 124	Nov. 1859
Political	Progress	No. 24 - 35	Aug. 1861
Political		Miscelleneous.	

مطبوعات:

تاریخ

آثار الصنادید: سرسید احمد خاں، مطبع سید الاخبار، ۱۸۴۷ء

اسباب بغاوتِ ہند: سرسید احمد خاں، مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۹۰۳ء

آئینہ تاریخ نما جلد دوم: شیو پرشاد، نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۱۴ء

بہادر شاہ ظفر: امیر احمد علوی، نامی پریس لکھنؤ، ۱۹۳۵ء

بہادر شاہ ظفر کا مقدمہ: مرتبہ حسن نظامی، حلقہ مشائخ بک ڈپو، دہلی، ۱۹۴۷ء

تاریخ عروجِ انگلشیہ: مولوی ذکاء اللہ، شمس المطابع، دہلی، ۱۹۰۴ء

تاریخ ہندوستان جلد نہم: مولوی ذکاء اللہ، مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج

داستانِ غدر: ظہیر دہلوی، مطبع کریمی پریس، لاہور

سوانح دہلی: میرزا احمد اختر گورگانی، مطبع افتخار، دہلی

سیر المتاخرین: غلام حسین طباطبائی، نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۹۰ء

شاہ عالم نامہ: مرتبہ ہری ناتھ، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ

غدر کے اخبارات: مرتبہ حسن نظامی، مشائخ بک ڈپو، ۱۹۴۰ء

کمپنی کی حکومت: باری علیگ، مکتبہ اردو، لاہور، ۱۹۴۱ء

نصرت نامہ گورنمنٹ: مرتبہ حسن نظامی، مشائخ بک ڈپو، ۱۹۳۰ء

واقعات دارالحکومت ہند، جلد دوم : بشیر الدین، شمس مشین پریس آگرہ، ۱۹۱۹ء

روزنامچے

۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ : مولفہ عبداللطیف، مرتبہ خلیق احمد نظامی، ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۵۸ء۔

بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ : مرتبہ حسن نظامی دہلی، حلقۂ مشائخ دہلی، ۱۹۳۵ء

خدنگِ غدر : معین الدین حسن، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

دہلی کا آخری سانس : مرتبہ حسن نظامی، حلقۂ مشائخ دہلی، بار اول

سر طامس مٹکاف کی ڈائری : مترجمہ ضیاءالدین برنی، مرتبہ حسن نظامی حلقۂ مشائخ دہلی،

غدر کے صبح و شام : ٹی مٹکاف مترجمہ ضیاءالدین برنی، مرتبہ حسن نظامی، حلقہ مشائخ دہلی ۱۹۲۶ء۔

تذکرے

۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا : امداد صابری، مکتبۂ شاہراہ، دہلی

آبِ حیات : محمد حسین، رفاہِ عام پریس لاہور، ۱۹۱۲ء

تذکرۂ نادر : مرزا کلب حسین مبارز جنگ بہ نادر شاگرد ناسخ، مرتبہ سید مسعود حسین رضوی ادیب، کتاب نگر لکھنؤ، ۱۹۵۷ء

دہلی کی آخری شمع : مرزا فرحت اللہ بیگ، عثمانیہ بک ڈپو، کلکتہ

سخنِ شعرا : عبدالغفور نساخ، نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۷۴ء

طبقات الشعرائے ہند : ایف فیلن و مولوی کریم الدین، مرتبہ شاہ عطاالرحمٰن، مطبوعہ معاصر پٹنہ، جلد ۱۹ ۱۹۶۴ء

طورِ کلیم، نواب صدیق حسین خاں : مطبع مفید عام پریس آگرہ، ۱۲۹۸ھ

عمدۂ منتخبہ معروف تذکرۂ سرور : میر محمد بہادر خاں سرور، مرتبہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی دہلی یونیورسٹی، ۱۹۶۱ء

گلزارِ سخن : منشی جگ ناتھ پرشاد، نول کشور، ۱۹۰۹ء

گلشنِ بے خار : نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ و حسرتی، نول کشور، لکھنؤ ۱۸۷۴ء

گلستانِ بے خزاں معروف بہ نغمۂ عندلیب : قطب الدین باطن، نول کشور لکھنؤ ۱۸۷۵ء

گلستانِ سخن : مرزا قادر بخش بہادر گورگانی، مطبع مرتضوی اکبر آباد، ۱۲۷۱ھ
مجموعۂ نغز : حکیم قدرت اللہ قاسم، مرتبہ محمود شیرانی، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۳۳ء
یادگار شعرا : اشپرنگر، مرتبہ محمد طفیل احمد، ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد، ۱۹۴۳ء

دواوین

دیوانِ ظفر (اوّل) : مطبع سلطانی، قلعۂ معلآ، ۱۲۶۱ھ، مملوکہ رضا لائبریری رام پور
دیوانِ ظفر (اوّل) : مطبع سلطانی، قلعۂ معلآ (ناقص الاوّل و آخر) ۱۲۶۱ھ مملوکہ نذیریہ پبلک لائبریری، دہلی (یہ لائبریری اب ہمدرد انسٹی ٹیوٹ منتقل ہو گئی ہے)
دیوانِ ظفر (ثانی) : مطبع سلطانی قلعۂ معلآ ۱۲۶۶ھ، مملوکہ رضا لائبریری، رام پور
دیوانِ ظفر مع انتخاب لاجواب : مطبع اودھ گزٹ، لکھنؤ، ۱۲۶۰ھ
دیوانِ حضور والا : دہلی اردو اخبار پریس، قلعہ معلآ، دہلی
دیوانِ ظفر (چہارم) : باہتمام اموجان، مطبع احمدی واقع شاہدرہ، دہلی میرٹھ، ۱۲۷۰ھ
دیوانِ ظفر : باہتمام قطب الدین احمد، مطبع نامی لکھنؤ، ۱۹۰۹ء
کلیاتِ ظفر (چہار جلد) : نول کشور، لکھنؤ، بار پنجم، ۱۹۱۸ء
منتخب کلیاتِ ظفر : نول کشور، کان پور، ۱۸۸۰ء
نوائے ظفر : مرتبہ خلیل الرحمٰن اعظمی، انجمن ترقی اردو علی گڑھ، ۱۹۵۵ء

تنقید و سوانح

انتخابِ ناسخ : مرتبہ رشید حسن خاں، مکتبہ جامعہ، دہلی
انتقادیات : نیاز فتح پوری، ادارہ ادب العالیہ، کراچی، ۱۹۵۹ء
اندازے : فراق گورکھپوری، ادارہ انیس اردو، الہ آباد، ۱۹۵۹ء
ذکاء اللہ دہلوی : سی ایف اینڈریوس، مترجمہ ضیاء الدین برنی، تعلیمی مرکز کراچی، ۱۹۵۲ء
خطوطِ غالب : مرتبہ غلام رسول مہر، کتاب منزل، لاہور، ۱۹۵۰ء
ذکرِ غالب : مالک رام، مکتبہ جامع لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۵۵ء
ذوق سوانح اور انتقاد : نذیر احمد علوی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۳ء
ذوق و جستجو : خواجہ احمد فاروقی، ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ، ۱۹۶۰ء
غالب اور شاہانِ تیموریہ : خلیق انجم، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۷۲ء

فسانۂ غالب : مالک رام، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۷۷ء

کلیاتِ غالب (فارسی) : مرتبہ امیر حسن نورانی، نول کشور، لکھنؤ ۱۹۶۸ء

مغل اور اردو ادب : نصیر حسین خیال، شائق احمد عثمانی اینڈ سنز، کلکتہ، ۱۹۳۳ء

مقدمہ شعر و شاعری : الطاف حسین حالی، علمی کتب خانہ، دہلی

نادراتِ شاہی : امتیاز علی خاں عرشی، ہندوستان پریس، رام پور، ۱۹۴۴ء

تہذیبی مرقعے

بزمِ آخر : منشی فیض الدین، دانش محل، طبع چہارم، ۱۹۴۵ء

دلی کا آخری دیدار : سید وزیر حسن دہلوی، ساقی بک ڈپو، دہلی، ۱۹۲۴ء

قلعۂ معلیٰ کی جھلکیاں : عرش تیموری، مکتبہ جہاں نما دہلی، ۱۹۳۷ء

لال قلعے کی ایک جھلک : ناصر نذیر فراق : ساقی بک ڈپو، دہلی

وداعِ ظفر معروف بہ نوبتِ پنج روزہ : راشد الخیری، جہانگیر بک ڈپو، دہلی، ۱۹۲۴ء

کتبِ مختلفہ

خیابانِ تصوف (۱۲۲۸ھ) : بہادر شاہ ظفر، مطبع سلطانی، قلعہ معلیٰ، دہلی، ۱۲۵۹ھ

صوبۂ شمالی اور مغربی کے اخبارات و مطبوعات : محمد عتیق صدیقی، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔

غالب اور ظفر کے منظوم کتبے : ضیاء الدین ڈیسائی (غیر مطبوعہ مقالہ)

اخبارات (مملوکہ نیشنل آرکائوز)

اخبار دہلی : یکم مارچ ۱۸۴۰ء

آئینہ سکندری : ۳۰ اکتوبر ۱۸۳۷ء

جام جہاں نما : ۲۵ اکتوبر ۱۸۳۷ء

خلاصۃ الاخبار : ۲۰ اپریل ۱۸۴۹ء

دہلی اردو اخبار : ۱۰ مئی ۱۸۴۰ء

دہلی اردو اخبار : ۲۴ مئی ۱۸۴۰ء

دہلی اردو اخبار : ۱۴ جون ۱۸۴۰ء

دہلی اردو اخبار : ۲۲ جون ۱۸۴۰ء

دہلی اردو اخبار : ۸ نومبر، ۱۸۴۰ء
دہلی اردو اخبار : ۲۲ نومبر، ۱۸۴۰ء
دہلی اردو اخبار : ۱۴ فروری، ۱۸۴۱ء
دہلی اردو اخبار : ۱۵ اگست، ۱۸۴۱ء
سراج الاخبار : نمبر (۱) جلد سیزدہم
سراج الاخبار : نمبر (۹) جلد سیزدہم و شانزدہم، مئی ۱۸۵۵ء
سراج الاخبار : نمبر (۱۰) ۲۳ مئی، ۱۸۵۷ء
خلاصۂ اخبار : ۲۰ اپریل، ۱۸۴۹ء

رسائل

اردوئے معلّا، غالب نمبر حصّہ اوّل : دہلی یونیورسٹی، دہلی
اردوئے معلّا، غالب نمبر، حصّہ دوم : دہلی یونیورسٹی، دہلی
خیر خواہِ ہند : (مائیکروفلم) مملوکہ دہلی یونیورسٹی، ستمبر ۱۸۳۷ء
محبِ ہند : (مائیکروفلم) مملوکہ دہلی یونیورسٹی، مارچ ۱۸۴۸ء
نوائے ادب : بمبئی، اپریل، ۱۸۴۲ء

انگریزی کتب

BALL (CHARLES) : HISTORY OF INDIAN MUTINY, VOL. II
LONDON PRINTING & PUBLISHING COMPANY
LONDON - NEW YORK.

DHARMA KUMA (EDITOR) : THE CAMBRIDGE ECONOMIC HISTORY OF INDIA, VOL. II, 1757-1970, ORIENT LONGMAN, MARCH 1984

FRASER (JAMES): HISTORY OF NADERSHAH, 2ND EDITION
A. MILLAR, LONDON

IRWIN(WILLIAM): LATER MUGHALS, VOL I & II
H.C. SARKAR & SONS, CALCUTTA

KAYE (M.M.): THE GOLDEN CALM

(EDITOR) WEBB & BOWERS (PUBLISHERS) LIMITED
GREAT BRITIAN, 1980.

MUKHERJEE (RANA KRISHNA): THE RISE AND FALL OF EAST INDIA COMPANY, BERLIN, 1957

SEN(SURENDRA NATH): EIGHTEEN FIFTY SEVEN, PUBLICATION DIVISION, MINISTRY OF I & B, 195/

SPEARS(PERCIVAL): TWILIGHT OF THE MUGHALS, CAMBRIDGE UNIVERSITY PRESS, 1951

THE BENGAL DIRECTORY 1858, FORT WILLIAM CALCUTTA, N.A.I.

اشاریہ

- نام
- مقامات
- عمارتیں
- مآخذ

نام

مقامات

عمارتیں

ماخذ

آبِ حیات : ۲۸۱، ۲۸۳، ۲۸۶، ۲۸۷، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۲۰، ۳۲۲، ۳۳۱، ۳۳۲

آثار الصنادید : ۲۶۰، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۹۳

آئینۂ تاریخ نما : ۱۵۹

آئینہ سکندری : ۱۶۲

۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ : ۱۹۰، ۲۱۹، تا ۲۲۱، ۲۶۳

۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا : ۱۷۷

احسن الاخبار : ۵۶، ۶۰ تا ۶۶، ۷۳ تا ۷۵، ۸۱، ۸۲، ۸۷، ۹۲، ۱۴۶، ۲۳۰، ۲۳۲، ۲۳۶ تا ۲۳۸، ۲۴۱ تا ۲۴۳، ۲۵۰، ۲۵۴، ۱۹۴

اخبارِ دہلی : ۱۶۶

اردوئے معلّیٰ، مرتبہ حسرت موہانی : ۳۳۳

اردوئے معلّیٰ، غالب نمبر اوّل و دوم : ۲۱۹، ۲۲۳، ۲۸۷

اسبابِ بغاوتِ ہند : ۱۱۸، ۱۷۵، ۲۶۳

انتخابِ کلامِ ظفر : ۳۰

انتخابِ لاجواب : ۲۹۷

انتخابِ ناسخ : ۲۷۴، ۲۸۶

انتقادیات : ۳۳۳

اندازے : ۳۳۳، ۳۶۰

بزمِ آخر : ۴۷، ۱۶۳، ۱۶۴، ۲۶۳، ۲۶۴

بہادر شاہ کا مقدمہ : ۱۷۲، ۱۷۴، ۱۷۶، ۱۷۷

بہادر شاہ ظفر (امیر احمد دہلوی) : ۳۰۵، ۳۰۸

بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ : ۳۰۶

تاریخِ اودھ : ۲۸۶

تاریخِ عروجِ انگلشیہ : ۱۵۹ تا ۱۶۲، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۹، ۱۷۱، ۱۷۵، ۲۱۹، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۶۵

تاریخِ ہندوستان : ۱۵۹، ۲۵۹، ۲۶۲

تالیفاتِ ابوظفری : ۳۰۱

تتمہ دہلی اردو اخبار : ۳۳۲

تزکِ بابری : ۳۳۸

تذکرۂ سرور : ملاحظہ ہو عمدۂ منتخبہ

تذکرۂ نادر : ۲۸۶

جامِ جہاں نما : ۱۶۲

انگریزی ماخذ

A. **DOCUMENTS:**

NATIONAL ARCHIVES OF INDIA

(i) FOREIGN DEPARTMENT POLITICAL SECRET ۲۲

No. 15-17 ۱۷۷، ۱۷۸

24-35 ۱۷۷

39-40 ۱۷۸

B. No. 40-41 ۱۷۸

No. 51-78 (KW) ۱۷۳

52-125 ۱۷۷

56 ۱۷۰

56-57 ۱۹۸، ۱۷۲، ۱۷۳، ۲۲۳

65-66 ۱۷۰

69-72 ۱۷۸

74-76 ۱۷۷

82-85 ۱۷۷

104 ۱۷۸

140-42 ۱۷۸

152-157 ۱۷۶

100 ۱۷۰

162	۱۷۰
163	۱۷۸
163-64	۱۷۷
185	۱۷۱، ۱۷۲
189	۱۷۲
217-20	۱۷۲
Proceeding Volume A.P. 388 No.220	۱۳۹
254-61	۱۳۹، ۱۷۰، ۱۷۳
325	۱۷۷
1407	۱۷۶
1413	۱۷۶
Miscellaneous	۱۷۳

(ii) Mutiny Papers ۲۲

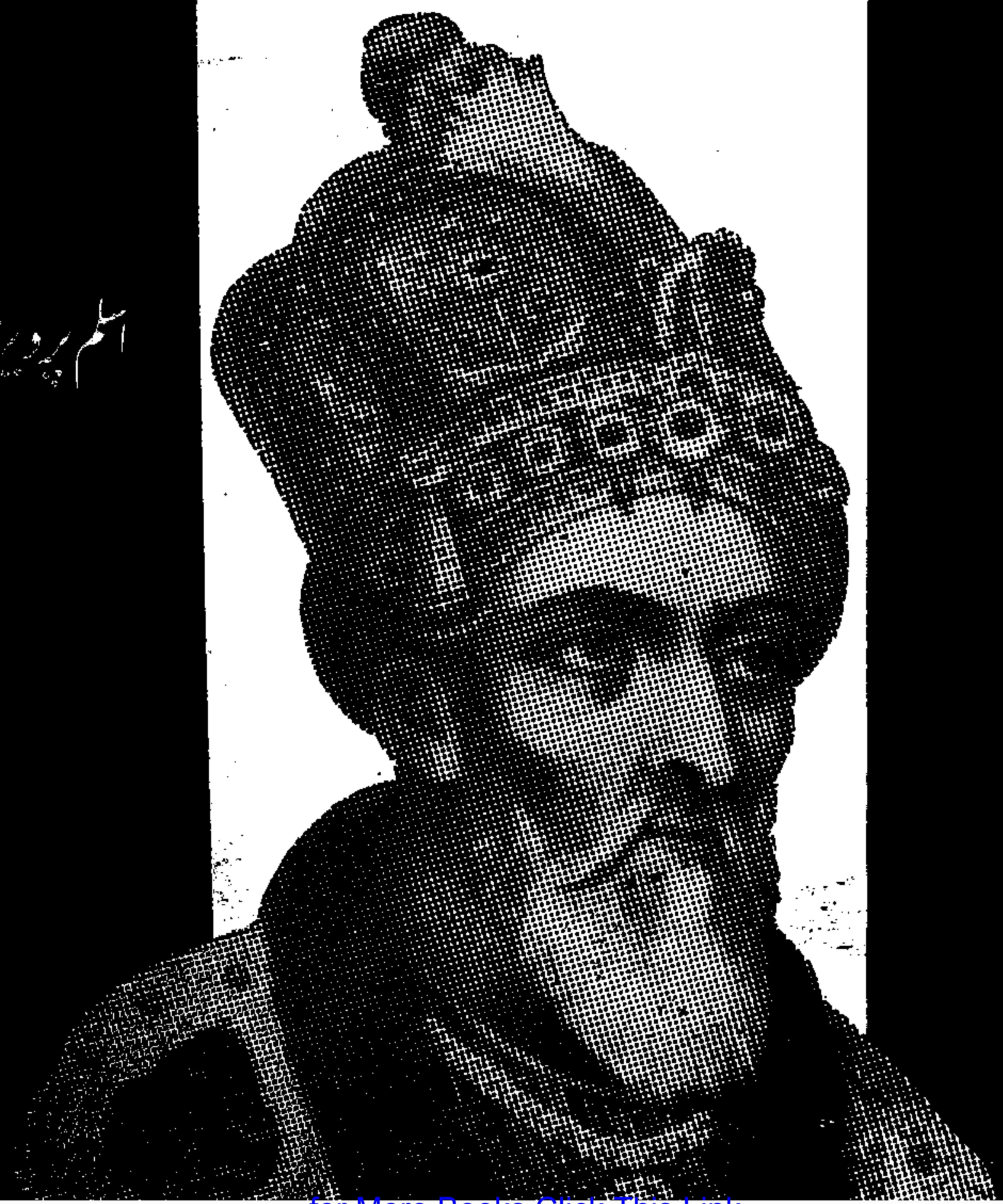
Collection	No.	15	File	No.	5	۲۲۲
"	"	15	"	"	20	۲۲۳
"	"	21	"	"	9	۲۲۲، ۲۲۳
"	"	21	"	"	19	۲۲۲
"	"	21	"	"	78	۲۲۲
"	"	23	"	"	1-3	۲۲۳
"	"	23-24	"	"	-	۲۲۲
"	"	30	"	"	-	۲۲۰
"	"	43	"	"	24	۲۲۲

Collection	No.	56	File	No.	7	۱۷۶
"	"	57	"	"	539-41	۲۱۹
"	"	85	"	"	2	۲۲۰
"	"	94	"	"	1	۲۲۱
"	"	100	"	"	94	۱۷۳
"	"	102	"	"	67	۱۷۳
"	"	102	"	"	69	۱۷۳
"	"	103	"	"	134	۲۲۲
"	"	108	"	"	8	۲۲۲
"	"	120	"	"	103	۲۲۲
"	"	135	"	"	170	۲۲۲
"	"	142	"	"	44	۲۲۲، ۲۶۰
"	"	195	"	"	10	۱۷۵
"	"	199	"	"	-	۱۶۴
"	"	200	"	"	-	۱۷۰

B. PUBLICATIONS:

Eighteen Fifty Seven	۱۷۵، ۲۱۹، ۲۲۳
History of Indian Mutiny	۱۷، ۱۷۶
History of Nadir Shah	۱۳
Later Mughals Vol. II	۱۶
The Cambridge Economic History of India Vol. II	۱۳
The Golden Calm	۲۱، ۱۶۱، ۱۶۳، ۲۲۲، ۲۲۳، ۳۰۳

داراشکوہ



اسلم پرویز

انجمن ترقی اردو ہند